مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر بیان القرآن

کا

تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

ڈاکٹر ریحانہ ضیا صدیقی

A CRITICAL STUDY OF TAFSEERBAYANUL QURAN

BY

Dr. Rehana Zia Siddiqi

26
/
57

toobaa-elibrary.blogspot.com

الندوہ ٹرسٹ لائبریری
چھتر۔ اسلام آباد

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن

کا

تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

757

داخلہ نمبر 0576 3047
تاریخ 28/3/99

ڈاکٹر ریحانہ ضیاء صدیقی

toobaa-elibrary.blogspot.com

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

297.1226
ص ادی
قرآن ۔ علوم

یہ کتاب
فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے مالی تعاون
سے شائع ہوئی

انتساب

مشفق والدِ محترم مولانا ضیاء الدین احمدؒ

اور دائمی ہم سفرِ حیات

ڈاکٹر عبد الحی صدیقی

کے نام

جن کی پُر خلوص کاوشوں نے

میری ہر ہر قدم پر دینی و دنیوی رہنمائی کی

toobaa-elibrary.blogspot.com

297.1226
رزج

باراول	دسمبر ۱۹۹۱ء
تعداد	چھ سو
ناشر	ڈاکٹر ریحانہ ضیا صدیقی (ایم اے اردو، ایم اے عربی) ایم ۔ لٹ ایچ، پی ایچ ڈی (علیگ)
طباعت	ناز یہ پرنٹرز، رودگران، لال کنواں، دہلی ۶
قیمت	Rs. /55/- روپیہ
کتابت	سلطان احمد صدیقی

ملنے کے پتے

(۱) ڈاکٹر ریحانہ ضیا صدیقی، اسٹریٹ ۴، نئی بستی علی گڑھ ۔
(۲) مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ علی گڑھ، دہلی، بمبئی ۔
(۳) ایجوکیشنل بک ڈپو، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۔
(۴) کتب خانہ انجمن ترقی اُردو، اُردو بازار، جامع مسجد دہلی ۔
(۵) دارالاشاعت اسلامیہ ۲۷ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

الندوہ ٹرسٹ لائبریری
چھتر ۔ اسلام آباد

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
تعارف ۔ پروفیسر رؤف اقبال صاحبہ	۹
تعارف ۔ پروفیسر محمد سالم قدوائی	۱۱
پیش لفظ ۔ پروفیسر عبدالباری صاحب	۱۳
حرفِ آغاز ۔ مصنفہ	
مولانا اشرف علی تھانوی کی مختصر سوانح حیات	۲۱
حسب ونسب ، نام وتاریخ پیدائش	۲۱
لقب ، وطن	۲۳
عہدِ بچپن کا ایک جائزہ ، فطری مزاج وعادات ، رضاعت	۲۴
نماز کا اہتمام ، شرم وحیا	۲۵
تربیت ، تعلیمی دور	۲۶
فارسی تعلیم ، عربی تعلیم	۲۷
خصوصی علوم سے مناسبت	۲۸
تحصیلِ قرارت	۲۹
دستار بندی ، فتویٰ نویسی کی ابتدا	۳۰
مناظرہ کا شوق	۳۱
درس وتدریس	۳۲
سیاسی نظریہ	۳۳
مذہبی وسیاسی پس منظر کی ایک جھلک	۳۵
مولانا کی زندگی کا نصب العین	۳۹
ظاہری وباطنی حالات کا معمولات کا مختصر خاکہ وفات تک	۴۲
تصانیف ومواعظ کی اہمیت	۴۸

عنوان	صفحہ
مولانا کے چند مواعظ کا جائزہ	۵۳
وعظ حقوق المعاشرت	۵۳
استخفاف المعاصی	۵۴
ذکر الرسول	۵۵
الکمال فی الدین للنساء	۵۶
شرائط الطاعۃ	۵۸
چند تصانیف کا جائزہ	۶۰
حیات المسلمین	۶۰
الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ	۶۳
بہشتی زیور	۶۴
اصلاح الرسوم	۶۵
تفسیر بیان القرآن	۶۷
اُردو تفاسیر و تراجم کا مختصر خاکہ اور تفسیر بیان القرآن کا اجمالی تعارف	۷۰
تفسیر بیان القرآن سے قبل کی چند تفاسیر کا تحقیقی جائزہ	۷۹
خصوصیات و تحقیقات تفسیر سر سید احمد خاں	۷۹
سر سید کے تفسیر لکھنے کی ضرورت و اہمیت	۸۷
خصوصیات تفسیر سر سید	۸۸
پہلی خصوصیت	۸۸
دوسری خصوصیت	۹۲
تیسری خصوصیت	۹۵
چوتھی خصوصیت	۹۶
پانچویں خصوصیت	۹۶
مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کا مختصر جائزہ	۹۸
بعض اسباب و مؤثرات جو فہم حقیقت میں مانع ہیں	۱۰۵
تفسیر حقانی	۱۱۶

عنوان	صفحہ
تفسیر جامع التفاسیر	۱۲۰
تفسیر مواہب الرحمٰن	۱۲۲
اردو تراجم کی روشنی میں تفسیر بیان القرآن کی خصوصیت	۱۲۵
ترجمہ مولانا تھانویؒ (سورہ فاتحہ)	۱۳۹
تفسیر بیان القرآن کا جائزہ کلامی، فقہی اور تفسیر بالماثور کے نکتہ نظر سے	۱۴۹
تفسیر بیان القرآن کی کلامی حیثیت	۱۴۹
رفع عیسیٰ علیہ السلام	۱۵۶
تفسیر بالماثور کے نکتہ نظر سے تفسیر بیان القرآن	۱۶۱
تفسیر بیان القرآن کی فقہی حیثیت	۱۶۴
تفسیر بیان القرآن کی خصوصیات، تحقیق و تنقید کی روشنی میں قرآن کریم کی آیات کی مثالوں کے ساتھ	۱۷۶
حکم شانزدہم مقدار انفاق	۱۸۰
تفسیر بیان القرآن کے تفسیری اصول	۱۹۷
تفسیر اصول تفسیر حقانی (تفسیر فتح المنان)	۱۹۷
تفسیر مواہب الرحمٰن (جامع البیان)	۲۰۷
ذکر بعضے امور مرعیہ ملتزمہ در تحریر ہٰذا	۲۱۳
تفسیر بیان القرآن کا مقام اُردو تفاسیر کے درمیان	۲۲۳
تصوف	۲۲۴
اللغات والبلاغۃ	۲۲۶
اعراب القرآن	۲۳۰
مولانا تھانویؒ کے چند شاگرد	۲۳۱
(۱) مولوی محمد اسحاق صاحبؒ (۲) مولوی محمد رشید صاحبؒ	۲۳۲
(۳) مولوی احمد علی صاحبؒ فتحپوری (۴) مولوی صادق الیقین صاحبؒ کرسوی	۲۳۲

toobaa-elibrary.blogspot.com

صفحہ	عنوان
۲۳۳	(۵) مولوی فضل الحق صاحبؒ (۶) مولوی شاہ لطف الرسول صاحب
״	(۷) حکیم محمد مصطفےٰ صاحبؒ بجنوری (۸) مولوی سید اسحاق علی صاحب کانپوری
״	(۹) مولوی منظر الحق صاحبؒ
۲۳۴	(۱۰) مولوی سعید احمد صاحبؒ اٹاوی
״	**خلفائے خاص**
״	(۱) خواجہ عزیز الرحمٰن صاحب مجذوبؒ
۲۳۵	(۲) مولانا سید سلیمان ندویؒ
۲۳۷	(۳) مفتی محمد شفیع صاحبؒ
۲۳۸	(۴) ظفر احمد صاحب تھانویؒ
۲۳۹	(۵) قاری محمد طیب صاحبؒ
۲۴۰	(۶) شاہ وصی اللہ صاحبؒ
۲۴۱	(۷) مولانا مسیح اللہ خاں صاحب
۲۴۲	(۸) حکیم محمد مصطفےٰ صاحب بجنوری
۲۴۳	(۹) حافظ قاری محمد عمر صاحب تھٹوریؒ
۲۴۵	(۱۰) مولوی عبدالباری صاحبؒ ندوی
۲۴۷	**مولانا تھانویؒ دورِ حاضر کے علمار کی نظر میں**
۲۴۷	(۱) مولانا سید محمد میاںؒ سابق ناظم جمعیۃ العلمار ہند و شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ کی رائے
۲۴۸	(۲) استاد حدیث تفسیر دارالعلوم دیوبند سید مولانا فخر الحسن صاحبؒ کی رائے
۲۴۹	(۳) مولانا ظہور الحسن صاحب مدظلہ خلیفہ مولانا اشرف علی مہتمم مدرسہ امداد العلوم و خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون کی رائے
۲۵۱	(۴) جناب مفتی نظام الدین صاحب دارالافتار دارالعلوم دیوبند کی رائے
۲۵۵	(۵) مولانا نعیم صاحب استاد دارالعلوم دیوبند کی رائے
۲۵۹	(۱) مکتوب سید محمد میاںؒ
״	(۲) مکتوب مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ
״	(۳) مکتوب قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند
۲۶۰	(۴) مکتوب مولانا فخر الحسن صاحب تھانویؒ
۲۶۱	ماخذات

تعارف

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی عالمانہ شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں انھوں نے وقت اور ضرورت کے تقاضوں کے تحت اپنا قلم ہر اس موضوع پر اٹھایا جو امت کی اصلاح کے لیے ضروری تھا۔ ان تمام خرابیوں کو دور کرنے کے ساتھ ہی وہ طریقے قرآن و سنت کی روشنی میں عوام کے لیے خاص طور سے تحریر کیے جن کے ذریعے زندگی آسانی کے ساتھ صراطِ مستقیم پر چل کر گذاری جا سکے بدعت اور رسوم بیجا سے احتراز کیا جا سکے۔ اصلاح الرسوم، قصد السبیل، تربیت السالک، بہشتی زیور سب اس سلسلے کی کڑی ہیں۔

مولاناؒ نے جس مقصد اور ضرورت کے تحت یہ تفسیر لکھی، مقالہ نگار نے اس کو پوری طرح مثالوں کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کے ساتھ ہی تفسیر کے تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں چند دیگر تراجم اور تفاسیر کا ذکر کرتے ہوئے تفسیر کی فقہی، عقلی، کلامی حیثیت کو واضح کیا ہے۔ اردو ترجمہ اور ربط آیات کے حوالوں سے مثالیں پیش کیں اور مولانا تھانویؒ کی تفسیر کا امتیاز دیگر تراجم اور تفاسیر کے موازنہ کے ساتھ مکمل ایک باب میں پیش کیا ہے۔ مولاناؒ کی تفسیر بیان القرآن پر یہ پہلا تحقیقی و تنقیدی مقالہ ہے جس پر ریحانہ ضیا کو مسلم یونیورسٹی کی طرف سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ اب یہ کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔

موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ریحانہ نے جلال آباد، سہارن پور، دیوبند اور دہلی کا سفر کیا اور ان علمار سے تفسیر بیان القرآن اور مولانا تھانویؒ کے بارے میں مفید معلومات بہم پہنچائیں جو مولاناؒ کے بہت قریب تھے۔ اس لحاظ سے

toobaa-elibrary.blogspot.com

ڈاکٹر ضیا کی یہ محنت قابلِ قدر ہے۔

خداوندِ عالم سے دعا ہے کہ ان کی اس کتاب کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے

رؤف اقبال

رؤف اقبال

چیرمین شعبہ دینیات
ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۱ء

منت اللہ رحمانی
امیر شریعت بہار واڑیسہ

خانقاہ رحمانی، مونگیر
۱۲/۱/۸۳

...

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اسلامی ہند کی نادر شخصیتوں میں ہیں
انہوں نے اسلامی علوم و فنون پر اتنا ہمہ جہت تحریری سرمایہ چھوڑا ہے
جو انیسویں صدی کے علماء کرام میں سب سے نمایاں کر دیتا ہے۔ ان کی
تفسیر "بیان القرآن" نامی کی تفسیروں کا بہترین خلاصہ اور قرآن کی
بیش بہا خدمت ہے۔ جسے خدا تعالیٰ نے بڑی مقبولیت سے
نوازا۔

مجھے خوشی ہے کہ حضرت تھانویؒ کی بیش بہا تفسیر پر جناب ریحانہ ضیاء
صدیقی نے بڑی کاوش اور انہماک کے ساتھ تحقیقی جائزہ لیا ہے
اور یہ جائزہ کتابی شکل میں شائع ہونے والا ہے۔ خدا تعالیٰ ان کی محنت کو
قبول فرمائے۔ شائقین علم کو اس سے استفادہ کا موقع ملے۔

[signature]
۲۲/۱/۸۳

تعارف

مولانا اشرف علی تھانویؒ ہندوستان کی ان مایۂ ناز شخصیتوں میں سے ہیں جو اعلیٰ درجہ کے عالمِ دین، بہترین رہبر و مبلغ، امورِ تصوف سے بہرہ ور، دردمند، بے غرض اور مخلص انسان تھے۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ بے نفسی اور بے لوثی کی مثال ہے۔ ان کے علمی کارناموں میں "بیان القرآن" کی بہت اہمیت ہے۔ مولانا ایک اچھے مفسر، محدث اور فقیہ تھے، علومِ دینی میں اُن کی مہارت مسلّم تھی۔ معرفت و سلوک کی راہوں میں ان کا درجہ بہت اونچا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو حکیم الامّت نہ صرف کہا گیا بلکہ سمجھا گیا۔

مولاناؒ کی تفسیر اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے بہت مقبول رہی ہے، اس کی زبان بہت آسان اور سادہ ہے، مشکل مقامات کی تفسیر بڑی سادگی اور پرکاری سے پڑھنے والے کے ذہن کو الجھائے بغیر بیان کر دیتے ہیں۔ مولانا چونکہ عوام سے بہت قریب تھے اور اُن کے ذہن اور سمجھ کے معیار پر ان کی نظر تھی اس لیے تفسیر انھوں نے اسی نقطۂ نظر سے لکھی اور اس بات کی کوشش کی کہ عام انسان کلام اللہ کے مفہوم کو آسانی سے سمجھ سکے، غیر ضروری بحثیں، فلسفیانہ نکات اور قیاسی باتوں کا ذکر نہیں کرتے۔ دوسرے مفسرین نے اگر کسی آیت کی تفسیر الگ الگ انداز سے کی ہے تو اس میں جو سب سے آسان مفہوم ہے اس کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر کو لوگ بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

زیرِ نظر تصنیف مولاناؒ کی اسی تفسیر کا ایک مکمل جائزہ ہے۔ محترمہ ریحانہ ضیاء صاحبہ اس سلسلہ میں ہم سب کی مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک اہم کام بڑی خوش اسلوبی اور بہت سلیقہ سے انجام دیا ہے۔ ریحانہ ضیاء کا تعلق ایک علمی و دینی خانوادے سے ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت ان کے والدِ محترم مولانا ضیاء الدین احمد صاحبؒ نے خود کی تھی۔ ان کے نانا حافظ

محمد عمر صاحبؒ حضرت مولانا تھانویؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ اس قریبی تعلق کا اثر اس گھرانے پر پڑنا ایک قدرتی امر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خاندان کے سبھی لوگ دین کی برکتوں سے مالامال تھے اور لوگوں کو اس دولت میں برابر کا شریک رکھتے تھے۔ نانا اور والد دعوت و تبلیغ میں سرگرم رہے اور لوگوں کی تربیت و تعلیم پر توجہ دیتے رہے۔ ریحانہ ضیاء کی تعلیم و تربیت بھی اسی ماحول میں ہوئی جس کا خوش گوار اثر ان پر پڑا اور علمی و دینی نقوش بچپن ہی سے اپنی جگہ بناتے رہے۔ چونکہ اس خاندان کا تعلق علی گڑھ سے ہے اس لیے مسلم یونیورسٹی ان کی جدید تعلیم کا مرکز بنی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد انھوں نے عربی اور اردو میں ایم اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ دینی تعلیم کی لگن ان کو تھیالوجی ڈپارٹمنٹ لے گئی، جہاں سے انھوں نے بی ٹی ایچ اور ایم ٹی۔ ایچ کرنے کے بعد پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے اپنے محبوب رہنما اور عظیم بزرگ مولانا تھانویؒ کو منتخب کیا۔ مولاناؒ کی شخصیت کا ہر پہلو ایک مکمل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے انھوں نے ان کے تفسیری کارناموں کو جن کی دینی اہمیت کے ساتھ ساتھ علمی حیثیت بھی ہے اپنا مخصوص موضوع بنایا۔ اللہ کا شکر ہے کہ انھوں نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی، اُن کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی اور ایک ایسا کام ہو گیا جس کی بہت ضرورت تھی اور جو آئندہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بنے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے کام کو مقبولِ عام کرے اور لوگوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔ آمین۔

پروفیسر محمد سالم قدوائی
شعبۂ اسلامک اسٹڈیز
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پیش لفظ

ڈاکٹر ریحانہ ضیا صاحبہ کی یہ تصنیف بعنوان "مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" ایک مفید علمی و تحقیقی کاوش ہے۔ علمی افادیت کے 'علی الرغم' برصغیر میں اس کتاب کی دینی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔

کتاب کے مختصر مطالعے کے بعد مجھے اعتراف ہے کہ ریحانہ ضیا صاحبہ نے ذوق و شوق کے جلو میں تحقیق کے مراحل کامیابی کے ساتھ طے کیے ہیں۔ ان کی مساعی لائقِ تحسین ہے۔ تحقیق کا سب سے ابتدائی اور شاید سب سے کٹھن مرحلہ کسی اہم موضوع کا انتخاب ہوتا ہے۔ تفسیر "بیان القرآن" کا انتخاب شعبہ دینیات کی مناسبت سے مثالی اہمیت و افادیت کا حامل ہے۔

قرآن مجید کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ساری انسانی برادری کے لیے سرچشمہ ہدایت اور فلاحِ دین و دنیا کی ضمانت بنا کر اتارا گیا۔ مگر یہ کلام پاک عربی زبان میں ہے اور اسے فصاحت و بلاغت کا حسین پیکر بھی عطا کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان ہدایات کو سیدھے سادے الفاظ کے ذریعے لوگوں کے قلوب و اذہان تک پہنچانا لازمی سا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر خصوصیت سے عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں، ایک اہم ضرورت بن جاتی ہے اور اس پس منظر میں کلام اللہ کی افہام و تفہیم واقعی کسی "اللہ والے" کے ہاتھوں انجام پا جائے تو کیا کہنا، سو یہ سب کچھ ہمیں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر "بیان القرآن" میں مل جاتا ہے۔ اس تفسیر کو اللہ پاک نے شرفِ قبولیت سے بھی نوازا ہے۔

عہدِ حاضر میں کچھ ایسی ہی تفسیر کی دراصل ضرورت ہے، جو عام فہم ہو، کلام اللہ کے

رمز شناس کے ہاتھوں تحریر ہو اور عوام کے ایک بڑے طبقے کے لیے قابلِ قبول ہو سکے۔ چنانچہ آج کے دور میں تفسیر مذکور کی غیر معمولی افادیت ہو جاتی ہے اور سچ پوچھیے تو ریحانہ ضیا صاحبہ کے تحقیقی جائزے کے بعد اس کتاب کی افادیت مزید بڑھ جاتی ہے برِ صغیر میں اسلامی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے تفسیر "بیان القرآن" کا یہ تحقیقی جائزہ یقیناً دینی تصانیف اور اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک ریحانہ ضیا صاحبہ کی اس مبارک پیش رفت کو عزت و شہرت نصیب فرمائے۔ آمین

یکم نومبر ۱۹۹۱ء

عبد الباری

(پروفیسر) عبد الباری
صدر شعبۂ عربی
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

اللہ جل شانہ کا شکر ہے کہ بزرگانِ دین نے تفسیرِ قرآن کریم کی زبردست خدمت انجام دے کر ہمارے لیے راہیں آسان کر دیں۔ ان کے احسانِ عظیم کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان بزرگوں میں مولانا تھانویؒ کی تفسیر "بیان القرآن" جیسی اہم تفسیر کا کارنامہ ہمارے سامنے ہے۔ اس اہم تفسیر پر اللہ تعالیٰ نے مجھ ناچیز کو بھی تحقیق و مطالعہ کا موقعہ ملا کیا۔ اگرچہ میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتی۔ مگر ارشادِ خداوندی ہے "خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" کے مضمون نے ہمت پیدا کی اور اللہ پر بھروسہ کر کے چند کلمات پی ایچ ڈی کے مقالہ کی شکل میں جمع کیے یہ سوچ کر کہ اس بے بضاعت بڑھیا کی طرح جو حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں ایک سوت کی آنٹی لے کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے والوں نے کہا وہ یوسفؑ جس کی قیمت پر بیش بہا خزانے پیش کیے جائیں گے کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ سوت کی آنٹی میں یوسف مل جائے گا۔ اس ضعیفہ نے جواب دیا یہ تو میں بھی جانتی ہوں مگر یوسفؑ کے خریداروں میں میرا نام بھی شامل ہو جائے گا۔ بس اسی طرح قرآن کی تفسیر پر قلم اٹھانا زبردست ذمہ داری اور فکر کا معاملہ ہے، لیکن یہ سوچ کر کچھ معلومات اور تحقیقات سپردِ قلم کر رہی ہوں کہ قرآن کی ان خدمت کرنے والوں کی فہرست میں شامل ہو جاؤں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے یہاں قبول فرمالیں ؎

شاہان چہ عجب گر بہ نوازند گدارا

مقالہ کی تحقیقات کے لیے مواد کی فراہمی بہت اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ لیکن سرزمینِ ہند کو یہ سعادت حاصل ہے کہ ہر صدی میں بڑے بڑے علماء صوفیوں اور مفسرین نے اپنے علم و عمل سے اس کو سرسبز شاداب رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک کثیر ذخیرہ اسلامی موضوعات پر ہمارے یہاں موجود ہے جو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں شکل میں ہے اور موضوعات کی بہت سی مختلف شاخیں ہیں۔ ہر موضوع اتنا اہم اور وسیع ہے کہ علم و عمل کے لیے زندگیاں مختصر اور ناکافی محسوس ہوتی ہیں۔

قرآن، حدیث، فقہ و تصوّف وغیرہ جس علم پر نظر ڈالی جائے تو جو خدمات ہمارے اسلاف نے انجام دیں اس طرح گہرائی کے ساتھ ان کا سمجھنا، مطالعہ کرنا، تلاش کرنا بہت مشکل لگتا ہے۔ اس کی وجہ ہماری ذاتی کمزوریوں کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جن راہوں سے اور جس دَور سے ہم گذر رہے ہیں وہ اتنا عجیب اور پُرپیچ ہو گیا ہے کہ بقول شخصے ؎

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ہمارے بزرگوں کو جہاں اعمالِ صالحہ کے مواقع حاصل تھے وہاں حالات اور ماحول بھی سازگار تھا، ذہن فرقہ بندیوں اور تعصب کا شکار نہ تھے، ہر مذہب اور طبقہ کے لوگ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا سکھ، مفلس ہوں یا زردار، کالے ہوں یا گورے، عجمی ہوں یا عربی، ایک دوسرے کے لیے عزت محبت اور رواداری کے جذبات رکھتے تھے، ایک دوسرے سے علمی استفادہ قابلِ فخر سمجھتے تھے، ایک دوسرے کی زبان میں شعری و نثری اصنافِ سخن کو بہت پیار خلوص کے ساتھ پڑھتے، سنتے اور سناتے تھے جیسا کہ بزرگوں سے سُنا ہے۔ ایک طرف مسجدوں میں محلہ کے تمام بچے بلاتفریق مذہب و ملّت اُردو قاعدہ وغیرہ پڑھتے تھے، دوسری طرف ہندی میں امیر خسروؒ کے کلام کی شکل میں ایسا پُراثر سرمایہ ملتا ہے جس کی چھاپ آج بھی دلوں کو گرما دیتی ہے۔ غرض عربی، فارسی، ہندی، اُردو ہی نہیں بلکہ ہر زبان کو علمی مرتبہ کے لحاظ سے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور ان کے ذریعہ لوگ باہم شیر و شکر تھے، کیوں کہ خیالات پاکیزہ

تھے، دل مروت و خلوص سے لبریز تھے، ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے کا ذوق و شوق تھا۔ اس کے برعکس آج حصولِ علم سے لے کر فکرِ معاش اور جان و مال کی حفاظت کے راستے شکوک و شبہات، تعصب، خود غرضی کی وجہ سے پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ اگرچہ آج کی نسلوں کو اس قدر سہولتیں مہیا ہیں کہ کم سے کم وقت میں فوٹو اسٹیٹ مشینوں اور کمپیوٹر کے ذریعہ بیش بہا مواد و علوم کے لیے جمع کیا، سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے لیکن وہ دلچسپی ذوق و شوق، فکر و ذہن اور لگن میں وہ حرارت نہیں جن کی بنیادوں پر پیدل چل کر بڑی بڑی مسافتیں طے کر کے اہلِ علم سے ایک ایک لفظ کی تصدیق، تصحیح اور معلومات خندہ پیشانی سے کرتے۔ مولانا ابوالکلام آزادؔ نے اپنی تفسیر کے دیباچہ میں ایک ایسے ہی شخص کا ذکر کیا ہے جو قرآن کے بعض حصّوں کی تفسیر سمجھنے کے لیے کوئٹہ سے پیدل چل کر ان کے پاس آیا تھا سفر کے مصارف نہ ہونے کی وجہ سے اور پھر خاموشی سے واپس چلا گیا تاکہ کوئی اس کو سفر خرچ نہ دے۔ ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ یہ بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہمیں معلومات کا اچھا خاصا مواد آسانی سے فراہم ہو جاتا ہے۔

مجھے اپنے مقالے کے مواد کی فراہمی اور تیاری میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن میری اپنی مسلسل جد و جہد اور کوشش میں ان بزرگوں کی دعائیں اور تعاون بھی شامل ہے جن سے براہِ راست ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ والدِ محترم مولانا ضیاء الدینؒ کے ہمراہ میں نے تھانہ بھون کا سفر کیا جو مولانا اشرف علی تھانویؒ کے قیام درس و تدریس کا مرکز رہا ہے۔ خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون سے آپ کی وفات تک علوم کا فیض جاری رہا۔ وہاں ان کے خلیفہ مولانا ظہور الحسن صاحبؒ کے ذریعہ مولانا تھانویؒ کی کتب، حالاتِ زندگی اور علمی کارناموں سے متعلق مواد فراہم ہوا۔ انھوں نے اس کام پر بہت خوشی کے اظہار کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کا پردہ کے ساتھ اہتمام ہے یہ سن کر بہت خوشی حاصل ہوئی۔ دیوبند میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند خلیفہ تھانوی نے تین روز تک تفسیر بیان القرآن کے بعض مشکل مقامات بہت شفقت کے ساتھ سمجھائے اور تفسیر کی

خصوصیات کو واضح کیا اور فرمایا کہ تمہارا یہ تفسیر پر علمی کام انشاء اللہ ہندوستان کی امانت میں باعثِ فخر ہوگا۔ جلال آباد میں اسی طرح مولانا مسیح اللہ خاں صاحب سے کتابوں کے علاوہ مزید مفید معلومات فراہم ہوئیں۔ دہلی میں مولانا سید محمد میاں ناظم جمعیۃ العلماء سے اس سلسلے میں مختلف قسم کے سوالات کے جوابات قلم بند کیے اور امن کتب کا مطالعہ کیا جن سے تفسیر کے سمجھنے میں مدد مل سکے۔ ان اسفار اور ملاقاتوں کے علاوہ شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے مجھے میرے اس خواب کی تعبیر دی جو مولانا تھانویؒ کی ترجمہ و حاشیہ پر مبنی قرآن کریم سے متعلق اس وقت دیکھا تھا جب میں ایم۔اے کی طالبہ تھی اور میرے ذہن میں تفسیر بیان القرآن پر کام کا عشرِ عشیر بھی خیال نہ تھا البتہ شوق ضرور تھا، دلچسپی اور رغبت ایسے موضوعات پر کام کرنے کی تھی۔ میرے اظہار کا مقصد یہ ہے کہ میرا یہ کام علاوہ میری جدوجہد کے من اللہ بڑوں کی دعاؤں اور توجہ کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ ایم فل کے بعد ریسرچ کے دوران ناگہاں والد کی حرکتِ قلب بند ہونے پر وفات کے شدید صدمہ سے دوچار ہوئی۔ اور پھر یکے بعد دیگرے ناساعد حالات میں یہ کام تکمیل تک پہنچا۔ یہ محض اللہ کا کرم اور مہربانی تھی کہ جو کوشش اور جدوجہد ہو سکی اس سے گریز نہیں کیا۔ میں نے اس مقالے کو چند عنوانات میں تقسیم کیا ہے، ابتدائی میں ان کی مختصر سوانح اور علمی خدمات کا ذکر ہے۔ اس کے بعد تفسیر بیان القرآن کا اجمالی تعارف، اُسی کے ساتھ دیگر تراجم اور تفاسیر کے پس منظر میں اس کی خصوصیات کو واضح کیا ہے۔ چند تفاسیر تراجم کے درمیان اس کا امتیاز اور مقام متعین کیا اور خاص طور سے ان کی اس مختصر مدلل تفسیر اور ترجمہ کی خصوصیات کو فقہی، عقلی، کلامی تفسیر بالماثور کے نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ آخر میں دورِ حاضر کے اُن علماء کی رائے پیش کی ہے جنھوں نے مختصراً ان کی تفسیر بیان القرآن کے سلسلہ میں روشنی ڈالی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کام مفید ثابت ہوگا کیونکہ سیرت اور سوانح پر تو کافی تفصیل سے ان پر مواد موجود ہے لیکن تفسیر بیان القرآن پر تحقیق کی روشنی میں یہ پہلا کام ہے۔

آخر میں ان تمام حضرات کی شکر گذار ہوں جنھوں نے مقالے کی تیاری سے لے کر

اس کے شائع ہونے تک کسی بھی عنوان سے تعاون کیا۔ خصوصاً سپروائزر پروفیسر فضل الرحمن گنوری (سابق صدر شعبہ و ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی) کی جن کی نگرانی میں یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ محترم پروفیسر سالم قدوائی صاحب (استاد شعبۂ اسلامک اسٹڈیز) محترمہ پروفیسر رؤف اقبال صاحبہ (موجودہ صدر شعبۂ دینیات و ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اور پروفیسر عبدالباری ندوی صاحب (موجودہ صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی بے حد مشکور ہوں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات اور ذمہ داریوں کے باوجود مقالہ پر نظر ڈالی جس کی بنا پر میری ہمت افزائی ہوئی اور آگے کام کا حوصلہ ملا۔

قلبی تعلق اور احساس کی بنا پر یہ ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ شریک زندگی محترم ڈاکٹر عبدالحی صدیقی مستقل فکرمند رہے میرے برابر کے شریک نہ ہوتے تو مقالہ کا بھی شائع ہونا بہت دشوار ہوتا۔

لہٰذا میں تمام معاونین و محسنین کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ سب کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ الانسان مرکب من الخطا والنسیان کے تحت جو کوتاہیاں اور خامیاں ہوئی ہیں اُن کے لیے دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے اور اس کتاب کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر ریحانہ ضیا صدیقی
(پی ایچ۔ڈی علیگ)
۳۲۹/۶ اسٹریٹ ۴
نئی بستی، علی گڑھ

toobaa-elibrary

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

(قسم ہے زمانہ کی کہ انسان بڑے خسارے میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو پابندی کی فہمائش کرتے رہے)

ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ
سکل بیان القرآن جلد ۱۲ ص۱۱

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

(اقبالؒ)

مولانا اشرف علی تھانویؒ
کی
مختصر سوانح حیات

حسب ونسب:

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رح کا شجرۂ نسب فاروقی خاندان سے ملتا ہے۔ آپ کے والد کا نام منشی عبدالحق تھا، ضلع مظفر نگر قصبہ تھانہ بھون کے اہلِ ثروت حضرات میں شمار ہوتے تھے۔ علمی لحاظ سے فارسی کے بہترین عالم اور اچھے انشاء پرداز انتہائی ذہین اور دانشمند انسان تھے۔ جس کی بنا پر انھوں نے اپنے بڑے صاحبزادے اشرف علی کو ان کے مزاج و فطری مناسبت اور نفسیات کی روشنی میں عربی تعلیم کے رخ پر ڈالا اور چھوٹے بیٹے اکبر علی کو انگریزی علوم سکھانے کا انتظام کیا۔ اُن کے صرف یہ دو ہی لڑکے تھے۔ دونوں کو اپنی اپنی لائن میں اعلیٰ معیار پر تعلیم کا موقع بہم پہنچایا۔ ننھیال کی طرف سے مولانا کا شجرہ علوی خاندان سے ملتا ہے۔ آپ کے نانا کا نام پیرجی نجابت علی ہے۔ لہٰذا نسباً آپ فاروقی ہوئے۔ تھانہ بھون میں فاروقیوں کے چار خاندان مشہور تھے۔ جن میں ایک خطیب کہلاتا تھا۔ لہٰذا وراثتہً مولانا خطیب بھی تھے۔[1] آپ کو عشق کی دولت ننھیال سے اور طریقت کی فضیلت جدِ اعلیٰ سے ملی۔

نام و تاریخ پیدائش:

آپ کا اصلی نام اشرف علی ہے یہ نام پیدائش سے قبل غلام مرتضیٰ[2] پانی پتیؒ نے جو مجذوب

---

[1] سیرت اشرف صفحہ ۵۶، ۵۷   [2] اشرف السوانح حصہ اول صفحہ ۵۷

بھی سے تجویز کیا تھا۔ ان کے عالم ہونے کی بشارت بھی دی تھی۔ ددھیال کی طرف سے آپ کا نام عبدالغنی رکھا گیا اور تاریخی نام "کرم عظیم" نکلا لیکن مقامِ اشرف اسم "اشرف علی" کو ہی حاصل ہوا۔ کیوں کہ اس کا تعلق ایک واقعہ سے ہے جس کا ذکر مختلف سوانح نگاروں کے یہاں اس حوالہ کے ساتھ ملتا ہے جس کا مولانا خود بھی ذکر کرتے تھے اور وہ واقعہ یہ ہے۔

مولانا تھانوی رح کے والد ایک ایسے مرض میں شدت سے مبتلا ہوئے کہ معالج نے قاطع النسل دوا استعمال کرادی۔ انھوں نے یہ سوچ کر استعمال کی کہ بقائے نوعی سے بقائے شخصی مقدم ہے[1] مولانا اشرف علی رح کی نانی کو تشویش ہوئی۔ انھوں نے مجذوب پانی پتی سے ذکر کیا کہ میری لڑکی کے اولادِ نرینہ زندہ نہیں رہتی۔ انھوں نے مجذوبانہ انداز سے جواب دیا۔ عمر[2] و علی کی کشاکش میں مر جاتے ہیں آئندہ علی کے سپرد کر دینا۔ والدہ ذہین تھیں اس نکتہ کو سمجھ گئیں کہ اب تک جو نام رکھے گئے وہ والد کے نام سے منسوب ہوئے۔ علی کے سپرد کرنے کا مقصد یہ ہے کہ والدہ کے خاندان کی نسبت سے رکھے جائیں۔ مجذوب صاحب نے ان کی ذہانت کی تعریف کرتے ہوئے اس کی تائید کی۔ اور کہا ایک کا نام اشرف علی رکھنا اور دوسرے کا اکبر علی۔ یہ بھی کہا ایک میرا ہوگا جو بیدار ہوگا۔

ناامیدی کے بعد مولانا تھانوی کی پیدائش اور بعد کے حالات نے من اللہ اس بزرگانہ انکشاف کو صحیح ثابت کر دیا۔

مولانا اشرف علی کی پیدائش کی تاریخ میں سن کے لحاظ سے یعنی ۱۲۸۰ھ پر تمام سوانح نگار متفق ہیں البتہ قدرے فرق ماہ کے تعین میں ہے۔ ۵ ربیع الثانی[3] جس پر اکثر سوانح نگار متفق ہیں۔ البتہ سیرت اشرف کے مصنف منشی عبدالرحمٰن نے ۵ رجمادی الثانی ۱۲۸۰ھ

---

[1] اشرف السوانح حصہ اوّل صفحہ ۱۶۔ خواجہ عزیز الحسن

[2] علوی اور فاروقی خاندان کی طرف اشارہ تھا۔ منشی عبدالرحمٰن

[3] جامع المجددین صفحہ ۱ مولانا ظہور الحسن، یادِ رفتگاں ص ۲۸۲ سید سلیمان ندوی، مطابق بروز منگل ۱۹ ستمبر ۱۸۶۳ء

تحریر کی ہے۔ کثرتِ رائے کی بنا پر اول الذکر ہی تاریخ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

لقب:

آپ کا لقب حکیم الامت مشہور ہوا۔ سب سے پہلے اس لقب کی ابتدا مولوی مرزا محمد بیگ مالک مطبع محبوب المطابع کے ذریعہ ہوئی اور پھر اس قدر شہرت ہوئی کہ مولانا خلیل احمد سہارنپوری قدس سرہٗ جب کسی کی تحریر میں مولانا تھانوی کے نام کے ساتھ حکیم الامت نہ دیکھتے تو بہت خفا ہوتے اور فرماتے اللہ نے جیسا قلوب رجال میں ڈال دیا ہے اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے[1] اس میں حضرت کے ساتھ سوءِ ادب ہے۔

وطن

آپ کا وطن ضلع مظفر نگر صوبہ یوپی کا ایک قصبہ تھانہ بھون ہے جو آج تک مشہور و معروف ہے۔ تھانہ بھون مظفر نگر سے ۱۸ میل شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس کے گرد و نواح میں دیوبند، گنگوہ، کاندھلہ اور کیرانہ ہیں جو ہندوستان کے بعض مشہور علماء کا خصوصی مرکز رہے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں یہ قصبہ مجاہدین کا مرکز رہا ہے۔ اس کے قرب و جوار میں تعلیم دین کے بڑے بڑے مرکز قائم ہوئے ہیں۔ اور کثرت سے علماء و مشائخ گذرے ہیں۔ ایک انگریز افسر نے یہاں کے باشندوں کو عاقلانِ تھانہ بھون کا لقب دیا تھا[2]۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی میں یہاں کی آبادی تقریباً ۴۰ ہزار تھی جو رفتہ رفتہ کم ہو کر آٹھ یا نو ہزار رہ گئی۔ اس قصبہ کے قریب ریلوے لائن نہ تھی لیکن مولانا کی کوششوں اور دعاؤں سے ۱۸ نومبر ۱۹۲۰ء کو خانقاہ کے محاذ میں ایک جدید ریلوے اسٹیشن قائم ہوا۔ علمی، دینی ترقی کے اعتبار سے تھانہ بھون کو خانقاہ امدادیہ کے فیضِ عام

---

[1] سیرت اشرف صفحہ ۵۵

[2] اشرف السوانح صفحہ ۱۵

کی نسبت سے تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہوا۔

عہدِ بچپن کا ایک جائزہ

مولانا تھانوی کی عمر صرف پانچ سال کی تھی کہ والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور یہ دونوں بھائی شفقتِ مادری سے محروم ہو گئے۔ دونوں کم عمر تھے۔ ان کو ماں کی آغوشِ تربیت اور نگرانی کی سخت ضرورت تھی۔ مولانا کے پدر بزرگوار نے دونوں بھائیوں کی پرورش نہایت شفقت و محبت سے اس انداز سے کی کہ مادر مہربان کی محبت کی کسی حد تک تلافی ہو گئی۔ انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام دونوں کے ذہنی رجحانات و صلاحیت کے پیشِ نظر کیا۔

فطری مزاج و عادات

مولانا کا مزاج بچپن ہی سے دینی امور کی طرف مائل تھا۔ آپ کے عہدِ طفولیت کی معصومانہ شرارتوں اور کھیل کود میں بھی اس کا عکس ملتا ہے۔ مثلاً خطابت کے شوق کا یہ عالم تھا کہ سرِ راہ بازار میں جاتے ہوئے کوئی مسجد خالی نظر آجاتی تو اس میں داخل ہو جاتے اور منبر پر کھڑے ہو کر اس طرح تقریر شروع کر دیتے جیسے پورا مجمع بیٹھا سن رہا ہے۔ یا کہیں بہت سے جوتے ایک جگہ جمع دیکھتے تو ایک لائن میں صف کی طرح بنا کر ایک جوتا آگے بیچ میں رکھ کر کہتے ان کی بھی جماعت ہو رہی ہے[۱]۔ غرض اس طرح کی حرکات سے آپ کی ذہانت کے علاوہ اس فطری ذوق کا پتہ چلتا ہے جس نے دینی علوم کی ترقی کے ساتھ ہی آپ کی زندگی کو تابناک بنایا۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی شخصیت کو سمجھنے کے لیے منجملہ دیگر خصوصیات کے بچپن کے حالات و مزاج اور ماحول کو گہرا دخل ہوتا ہے۔

رضاعت

مولانا صرف سوا سال کے تھے کہ دوسرے بھائی کی پیدائش ہو گئی اس لیے ان کے

۱ے اشرف السوانح صفحہ ۲۱

دودھ کا سلسلہ جلد ہی منقطع ہو گیا اور کچھ عرصہ میرٹھ کے دیہات کی ایک قصائن انّا کا دودھ پیا جس کا ذکر خود کرتے ہوئے ظریفانہ انداز میں کہتے "جب مزاج میں گرمی محسوس ہوتی ہے تو دودھ کے اثر سے، لیکن مزاج کی اس حدت میں شدت نہیں ہے اس لیے کسی کی معمولی سی تکلیف بھی برداشت نہیں ہوتی[۱]"۔ دودھ کا اثر مولانا کے حق میں اس لحاظ سے مفید ثابت ہوا کہ ان کو امت کی اصلاح کے لیے طبیب روحانی بننا تھا، اور اصلاح کے لیے ترقی کے ساتھ گرمی کی بھی ضرورت تھی۔ لیکن کمسنی کی ذہانت اور مزاج کی تیزی کے باوجود اپنے بڑوں کے ادب کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ اس صفت کی وجہ سے بزرگوں کی محبوبیت بچپن ہی سے حاصل رہی۔

نماز کا اہتمام

آپ کو بچپن ہی سے نماز پڑھنے کے شوق کا یہ عالم تھا کہ علاوہ فرض نمازوں کے بارہ برس[۲] کی عمر سے تہجد کی نماز پڑھنی شروع کر دی تھی حتّٰی کہ سردی کے موسم میں بھی اس کا اہتمام کرتے تھے۔ جب کہ عموماً اس عمر میں گرمی کے موسم میں فرض نماز کی ادائگی امرِ محال تصور کی جاتی ہے۔ لیکن مولانا اس لگن سے عبادت کرتے تھے کہ مولانا کی نانی اس بچپن کی ریاضت سے بے چین ہو کر جاگتی رہتی تھیں۔

شرم و حیا

حیا ایمان کا ایک حصہ ہے۔ مولانا میں حیا اس درجہ تھی کہ اگر آپ کسی کا پیٹ بھی کھلا ہوا دیکھ لیتے تو قے ہو جاتی تھی[۳]۔ اپنی ان امتیازی عادات و فطرت کی وجہ سے عام شہری

۱ے اشرف السوانح حصہ اول صفحہ ۱۸

۲ے اشرف السوانح حصہ اول صفحہ ۱۲

۳ے ایضاً

قسم کے بچوں کے ماحول سے علیحدہ رہتے تھے۔

ترتیب

آپ کی طبیعت میں انتہائی ترتیب اور سلجھاؤ فطرۃً تھا۔ اگر کوئی بے ربط و مبہم گفتگو کرتا تو الجھاؤ محسوس کرنے لگتے اس کا اندازہ خود ان کے اس بیان سے ہوتا ہے۔ "بچپن سے ہی میرا دماغ اس کا عادی ہے کہ اگر کوئی معمولی سے معمولی بات بھی ہو مگر ترتیب کے ساتھ بیان نہ کی جائے تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ نہ خود الجھی ہوئی تقریر کروں نہ دوسروں کی الجھی ہوئی تقریر سمجھوں کیوں کہ بچپن سے ہی میرا دماغ خاص تربیت کا عادی ہے۔"[۱] غرض بچپن سے ہی ایسی صفاتِ حمیدہ کے مالک تھے جن کا مدلل ثبوت بعد کی زندگی میں آپ کے علمی و عملی معمولات اور مصروفیات کی ترتیب سے ظاہر ہوا اور حکیم الامت کی مجسم تصویر بنے۔

تعلیمی دور

زندگی کا یہ دور نہایت اہم اور قیمتی ہوتا ہے۔ اس کا سنگِ بنیاد اگر غلط رکھا جائے تو:

؎ تا ثریا می رود دیوار کج

کا مصداق ہوتا ہے۔ مولانا کی زندگی کا یہ زمانہ بھی نہایت ترتیب اور حسن و خوبی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ فطری مناسبت، ذہانت اور محسنِ تربیت کی وجہ سے دینی علوم سے آغاز ہوا۔ سب سے پہلے قرآنِ کریم حفظ کیا۔ حفظ کے استاد حافظ حسین علی مرحوم، دہلی کے رہنے والے تھے۔ مگر میرٹھ میں مقیم ہو گئے تھے۔ چند پارے البتہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے اخون جی صاحب نامی ایک استاد سے حفظ کیے لیکن تکمیل حافظ حسین علی صاحب ہی کے پاس ہوئی[۲]۔

---

[۱] سیرت اشرف صفحہ ۴۔

[۲] حاشیہ جدید بہشتی زیور مکمل و مدلل حصہ اول صفحہ ۱۷۔

فارسی تعلیم

فارسی کی ابتدائی تعلیم میرٹھ کے چند اساتذہ سے حاصل کی لیکن آخری کتب فارسی کے ایک استاد جو آپ کے ماموں بھی ہوتے تھے واجد علی صاحب نامی سے ختم کی اور بعض کتابیں جیسے قصائدِ عرفی، سکندر نامہ مولانا منفعت علی صاحب دیوبندی سے پڑھیں اور تھانہ بھون میں فارسی کی متوسطات مولانا فتح محمد صاحب[۱] سے پڑھیں۔ پنج رقعہ وغیرہ بھی مولانا منفعت علی ہی سے پڑھی۔ ان تمام لائق اساتذہ سے فارسی محنت سے پڑھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا تھانوی رح کو فارسی نثر و نظم کی تحریر و بیان پر غیر معمولی عبور حاصل ہوا۔ آپ نے ۱۸ برس کی عمر میں طالب علمی کے زمانہ میں مثنوی "زیروبم" کے عنوان سے تصنیف کا سلسلہ شروع کیا جس سے اُن کے اس زبان کو ذوق و شوق کے ساتھ سیکھنے کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی فارسی مثنوی "زیروبم" جس کا عملی ثبوت ہے۔ شرح مثنوی مولانا رومؒ ان کا عظیم شاہکار ہے[۲]۔

عربی تعلیم

آپ ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں عربی تعلیم کے لیے داخل ہوئے۔ سال ۱۳۰۱ھ میں آپ نے تعلیم مکمل کر لی[۳] یعنی دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔

آپ عربی کی ابتدائی کتب تھانہ بھون میں مولوی فتح محمد صاحب سے پڑھ چکے تھے۔ دیوبند پہنچ کر مشکوٰۃ شریف، مختصر المعانی، نور الانوار اور ملا حسن شروع کیں۔ ان علوم کو آپ نے انتہائی فہم اور محنت سے حاصل کیا کیونکہ ان علوم سے انھیں پہلے ہی سے کافی

---

[۱] اشرف السوانح حصہ اول صفحہ ۲۴، باب ششم

[۲] ایضاً

[۳] اشرف السوانح جلد سوم صفحہ ۶۶۱۔ یادرفتگاں صفحہ ۲۸۴ میں ۱۹۰۱ء غلط طباعت ہوئی ہے۔ مطبع ضیا برقی پریس۔ سن طباعت ۱۹۵۵ء

مناسبت تھی جس کا ذکر اس طرح کیا ہے "میرے والد صاحب، عبدالحق، اگرچہ بہت بڑے بزرگ دین دار نہ تھے لیکن دانشمند اور نیک انسان تھے۔ لہٰذا ان کی دوررس نگاہ نے میرے لیے عربی تعلیم کا انتظام اسی وقت سے طے کر دیا تھا جب میں بہت چھوٹا تھا اور دوسرے بھائی کے لیے انگریزی تعلیم کا بندوبست کیا۔ اس ذیل میں ایک واقعہ اس طرح ہے، ایک مرتبہ ازراہ ہمدردی والد صاحب سے میری تائی صاحبہ نے یہ کہہ دیا کہ یہ عربی پڑھ رہا ہے کہاں سے اس کا ذریعہ معاش ہوگا آئندہ دوسرا تو انگریزی تعلیم کے ذریعہ کما لے گا۔ عبدالحق، والد صاحب کو اس بات سے قلبی تکلیف ہوئی اور جوش میں کہا خدا کی قسم جس کو تم کمانے والا سمجھتی ہو ایسے ایسے اس کے قدموں میں گرتے پھریں گے اور یہ ان کی طرف رخ بھی نہیں کرے گا۔[۱] واقعہ یہ ہے کہ ان کے خلوص کے نتیجہ میں مولانا تھانویؒ کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔

طالب علمی کے زمانہ میں مولانا کے تعلقات کسی سے زیادہ نہ رہے بلکہ اپنا بیشتر وقت پڑھنے میں لگاتے اور اس کے علاوہ جو وقت ملتا اپنے استاد خاص مولانا یعقوب صاحبؒ کے پاس گذارتے۔ حتیٰ کہ کچھ عزیز جو دیوبند میں رہتے تھے ان سے بھی بہت کم راہ ورسم رکھتے تھے جس کی وجہ سے مغرور یا بد دماغ تصوّر کیے جاتے تھے، حالانکہ ایسا نہ تھا بلکہ ان کی نظر میں وقت کی قیمت تھی۔ تضییع اوقات کے عادی نہ تھے۔ جس سے ان کو دو فائدے ہوئے، غلط صحبت سے بچے رہے اور دیوبند سے جلد فارغ ہو کر وقت کے نظم و ضبط اور حفاظت کی وجہ سے عظیم مصنف بنے۔ ہر موضوع پر کامیاب طریقے سے علمی سرمایہ جمع ہوا۔[۲]

خصوصی علوم سے مناسبت

تصوف، منطق، علم معقولات سے ایک خاص مناسبت تھی۔ معقولات کی شمس بازغہ،

---

۱ اشرف السوانح حصہ اول صفحہ ۲۵

۲ ایضاً صفحہ ۲۷

صدرہ جیسی مشکل کتب بلا تکلف حل کر لیتے تھے۔ جب فلسفہ کا سبق پڑھتے تو اعوذ باللہ کے ساتھ۔ کیوں کہ اکثر شیطان علوم کے ایسے راستوں سے گمراہ کرتا ہے۔ حالانکہ مولانا ان میں سے تھے جو طبیعت کو عقل پر اور عقل کو شریعت پر غالب نہیں آنے دیتے تھے اور اپنے اس مزاج پر خدا کا شکر ادا کیا کرتے تھے۔ اس مناسبت کی وجہ سے مولانا کو اس علوم پر اس قدر مہارت حاصل ہوئی کہ درس و تدریس کے زمانہ میں اپنے شاگردوں کے لیے مشکل سے مشکل مضامین کو آسانی سے ذہن نشین کرا دیتے تھے۔ جس کا اظہار مولانا عبدالباری نے اپنے ان الفاظ میں کیا ہے۔ "حضرت تھانوی رحمہ نے فقط ان نام نہاد کتب معقولات کا برسوں اس عبور و مہارت کے ساتھ درس دیتے رہے بلکہ "متشابہ بالتکریر" جیسے مقامات کو طلبہ کے لیے پانی بنا دیا کرتے تھے"۔[۱]

تحصیل قرأت

مولانا کی فن قرارت میں بھی ایک مثالی حیثیت تھی۔ قرارت کی مشق آپ نے قاری محمد عبداللہ مہاجر مکی رحمہ سے مدرسہ صولتیہ مکہ میں کی۔ قرارت کے کمالات کو اخذ کرنے میں ایسا کمال حاصل تھا کہ جب مدرسہ صولتیہ مکہ کی بالائی منزل پر قرارت کی مشق کیا کرتے تھے تو نیچے سننے والوں کو استاد اور شاگرد کی آواز میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ مخارج کی صحت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے قاری جن کو اپنے مخرج پر ناز ہوتا تھا ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ان کی آواز میں قدرتی طور پر ایسا درد اور سوز تھا کہ ایک صاحب درد نے متاثر ہو کر یہاں تک کہہ دیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے ذبح کرتے ہیں۔

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ مولانا تھانوی رح میں خود سمجھنے اور سیکھنے کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اسی طرح آپ کو استاد بھی خصوصی ملے جو ظاہر و باطن کمالات میں مکمل

---

۱ تجدید دین کامل سلسلہ تجدید دین نمبر (۱) صفحہ ۱۰۰

۲ اشرف السوانح صفحہ ۳۲ حصہ اول باب ہفتم

تھے اور ان کی خاص عنایتیں اور توجہات مولانا پر رہیں جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

دستار بندی

۱۳۰۰ھ میں آپ کی دستار بندی شیخِ وقت مولانا رشید احمد گنگوہی رح کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی۔[1] اس موقع پر جب کہ عام طلبہ بہت خوش تھے کیونکہ اس سال دیوبند میں دستار بندی کا جلسہ بہت شاندار طریقہ پر ہو رہا تھا۔ مولانا تھانوی رح مولانا یعقوبؒ کے پاس گئے اور کہا سنا ہے کہ فراغت کی سند دی جائے گی ہم تو اس قابل ہیں نہیں۔ مولانا یعقوب صاحبؒ نے جوش میں فرمایا۔ تمھیں اپنے اساتذہ کی وجہ سے اپنی ہستی نظر نہیں آتی جب باہر جاؤ گے تو بس تم ہی تم ہو گے[2] اور ایسا ہی ہوا۔

فتویٰ نویسی کی ابتدا

آپ کے استادِ محترم مولانا یعقوبؒ نے فتویٰ نویسی کا کام طالب علمی میں ان کے سپرد کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ کسی کو طویل جواب میں فتویٰ دیا۔ اس کو دیکھ کر مولانا یعقوبؒ نے تنبیہ کے انداز میں کہا معلوم دیتا ہے کہ وقت زیادہ ہے۔ اگر بہت زیادہ خطوط سامنے ہوں تو کیسے جواب دیے جائیں گے۔ استاد کی اس نصیحت کا اثر انھوں نے ایسا قبول کیا کہ پھر مختصر جواب دینے لگے۔ جب حضرت گنگوہی رح دستار بندی کو تشریف لائے تو ان کی ذہانت کی تعریف مولانا محمود حسن شیخ الہند رح نے فرمائی۔ ان کی تعریف سن کر مولانا گنگوہی رح نے مشکل سوالات کیے جن کے جوابات مولانا تھانوی نے اتنے اچھے دیے کہ مولانا گنگوہیؒ بہت خوش ہوئے۔ ان کی ذہانت کا اندازہ اس چھوٹے سے واقعہ[3] سے بھی ہوتا ہے کہ مولانا

---

[1] اشرف السوانح حصہ اول ۲۰، حصہ اول و مقدمہ تجدید دین کامل صفحہ ۲۵

[2] 〃 〃 صفحہ ۳۲ 〃

[3] 〃 〃 صفحہ ۲۹

سید احمد صاحبؒ خود اس قدر ذہین تھے۔ بقول مولانا یعقوب صاحبؒ کہ ریاضی کے فن میں سید احمد صاحب اس قدر ماہر تھے کہ خود اقلیدس بھی اگر ذہین ہوگا تو بس اتنا ہی ہوگا۔

سید احمد صاحبؒ نے مولانا تھانوی سے سکندر نامہ کے ایک شعر کا مطلب دریافت کیا اس وقت انھیں مطلب یاد نہیں تھا جو استاد نے سمجھایا تھا
مولانا تھانوی رح نے اپنی طرف سے اس شعر کا مطلب بیان کیا۔ سید صاحب نے کہا کوئی اور مطلب بھی ہو سکتا ہے۔ مولانا تھانوی رح نے دوسرا مطلب بیان کیا۔ اس پر سید صاحب نے کہا اس کے علاوہ بھی کچھ مطلب ہو سکتا ہے۔ مولانا نے اپنے ذہن سے سوچ کر تیسرا مطلب بیان کیا۔ اس بار سید صاحبؒ نے کہا اگرچہ ان میں کوئی مطلب بھی اصل نہ تھا لیکن ذہانت پر نمبر دیتا ہوں۔ ایسے ذہین ذکی الفہم بزرگ عالم کی شہادت بھی مولانا اشرف علی رح کی فہم و فراست اور ذکاوت کا بیّن ثبوت ہے۔

مناظرہ کا شوق

علم منطق سے گہری مناسبت کی وجہ سے مناظرہ کی خاص قوت اور حاضر جوابی کا ملکہ حاصل تھا۔ دورِ طالب علمی میں بھی دیوبند میں کسی غیر مذہب کے عالم و پادری کے آنے کی خبر سنتے، ان سے ملتے اور مذہبی مباحث میں لاجواب کر دیتے۔ ان کو عیسائیوں، غیر مقلدوں، ہندوؤں، شیعوں وغیرہ کے علماء سے مناظرہ کا اکثر موقع ملا۔[1] اور اپنی حق گوئی، اظہارِ حقیقت اور اسلامی وسیع معلومات اور بے مثل ذہانت کی وجہ سے کامیاب ہوئے۔ ایک واقعہ مثال کے طور پر درج کیا جاتا ہے۔

مولوی ذکاء اللہ مرحوم جو ریاضی کے پروفیسر تھے اور مشہور اہلِ قلم تھے، ان سے

---

[1] جدید بہشتی زیور مکمل و مدلل حاشیہ صفحہ ۱۹

دہلی میں ملاقات ہوئی۔ مولانا تھانوی رحؒ سے مولانا نے پوچھا. آپ کے مدرسوں میں طلبہ کو کچھ لیاقت بھی پیدا ہوتی ہے؟

حضرت نے پوچھا پہلے مجھے لیاقت کا مفہوم معلوم ہو جائے تو جواب دوں۔ بس یہ سن کر مولوی ذکار اللہ مرحوم خاموش ہو گئے کیوں کہ سمجھ گئے اگر جواب دوں گا تو لیاقت کے مفہوم کا مدعی بن کر ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا، بولوں گا تو جھگڑا ہوگا اور پھر جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ خاموش ہو گئے۔[۱]

اس طرح کی بے شمار مثالیں مولانا رحؒ کی اپنے مخالفین کو خاموش کرنے کی موجود ہیں جو اپنی معلومات کے لحاظ سے عالم و ذہین نظر آتے تھے۔ طالب علمی میں شیخ الہندؒ کو ان کے مناظرہ کا علم ہوتا تو کم عمر سمجھ کر فکر مند ہو جاتے کہ کہیں نو عمری کی وجہ سے کسی سے مغلوب نہ ہو جائیں لیکن ایسا نہ ہوتا تھا۔ ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ ان کو اپنی صلاحیتوں پر کسی قسم کا ذاتی ناز یا غرور نہ ہوتا تھا بلکہ اس کو خداداد صلاحیت اور بزرگوں کے جوتے سیدھے کرنے کا طفیل سمجھتے تھے۔

درس و تدریس

حکیم الامت رحؒ کا یہ دور طالب علمی کے فوراً بعد ہی شروع ہو جاتا ہے۔ فارغ ہونے کے بعد ۱۴ سال کے طویل عرصہ تک کانپور آپ کے درس خاص کا مرکز بنا۔ اسی عرصہ میں مواعظ، تصانیف اور افتار کے مشاغل کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مدرسہ فیض عام کانپور کا سب سے قدیم ادارہ تھا جس کے مدرس مولانا احمد حسنؒ تھے جو اپنے وقت کے جید عالم تھے انھوں نے دوسرا مدرسہ قائم کر لیا تھا اور کانپور کے مدرسہ فیض عام میں مولانا احمد حسن صاحب کی جگہ کسی دوسرے کو آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، لیکن مولانا تھانویؒ نے اس مدرسہ کے لیے مدرس کی ضرورت کے تحت اپنے والد کی اجازت سے ۲۵ روپے ماہانہ تنخواہ پر

---

۱ اشرف السوانح حصہ اول صفحہ ۹۱

اس کی ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ مختصر عرصہ میں خدمات کی وجہ سے آپ کو اس قدر محبوبیت اور مقبولیت حاصل ہوئی کہ مولانا احمد حسن رحؒ سابق مدرس نے بھی ان سے مل کر اظہارِ مسرت کیا۔ اسی زمانہ میں مولانا تھانوی رحؒ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے بذریعہ خط بیعت ہوئے جس کا واسطہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ بنے۔ ۱۳۰۱ھ کے آخر میں مولانا حج کے لیے عازم سفر ہوئے اور حاجی امداد اللہ رحؒ سے فیض روحانی حاصل کیا۔ ۱۳۰۲ھ میں واپس ہوئے اور ۱۳۰۶ھ تک کانپور میں علمی مشاغل تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے ساتھ ذکر و شغل کا بھی معمول رہا۔ ۱۳۰۷ھ تک یہ رنگ اور گہرا ہو گیا۔ آپ ۱۳۱۰ھ میں دوبارہ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ اپنے مرشدِ خاص حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحؒ سے خاص زمانہ تک باطنی استفادہ کیا اور کچھ عرصہ کے قیام کے بعد اپنے دیرینہ مدرسہ کانپور میں ۱۳۱۴ھ تک خدمات انجام دیتے رہے۔ چودہ سال کے طویل عرصہ کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب کے مشورہ پر ملازمت ختم کر کے تھانہ بھون آ گئے۔

سیاسی نظریہ

مولانا اشرف علی تھانوی رحؒ کے زمانہ میں ملک سیاسی اعتبار سے تین پارٹیوں میں تقسیم تھا۔ انگریز، کانگریس، مسلم لیگ، انگریز برسرِ اقتدار تھے۔ کانگریس کے ساتھ اکثر ہندو قوم اور اکثر مسلم سیاسی جماعتیں تھیں اور مسلم لیگ کے ساتھ صرف عافیت پسند مسلمان تھے۔

مولانا تھانوی رحؒ کا نظریہ اس تقسیم میں کچھ اس طرح رہا جیسا کہ عبدالماجد دریا آبادی نے تحریر کیا ہے:

"انگریزی حکومت اور کانگریس کے درمیان رسہ کشی میں وہ مسلمانوں

toobaa-elibrary.blogspot.com

کو بالکل غیر جانبدار اور یکسو دیکھنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمان خود اپنے اندر پوری قوت نہیں پیدا کر لیتے ان کا کسی فریق کے ساتھ شامل ہو کر عملی حصہ لینا خودکشی کے مترادف ہوگا اور سارا زور اسی پر دیتے تھے کہ مسلمان پہلے اپنے میں قوتِ نظم پیدا کریں[1]"

مولانا تھانوی کی طبیعت میں اعتدال تھا جذبات کی شدت نہ تھی چونکہ یہ مسئلہ اجتہادی تھا اس لئے اپنے حلقے کے علماء کو اختلافِ رائے کی آزادی دے رکھی تھی۔ اس زمانہ میں مولانا تھانویؒ دارالعلوم دیوبند کے سرپرست تھے۔ دیوبند کے اکثر اکابر جمعیۃ العلماء ہند کے ممبر اور کانگریس کے ساتھ تھے۔ اُن کے اثر سے طلباء دیوبند نے بھی عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ مولانا تھانوی رح طالب علمی کے دور میں طلباء کے سیاست میں حصہ لینے کے خلاف تھے۔ طالب علم کی کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں شرکت تعلیمی مقاصد کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ خود بھی اپنی ذات کو کسی بھی سیاسی تحریک میں شریک کرنا نہیں چاہتے تھے حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ مولانا تھانوی رح کا مزاج سیاسی الجھنوں میں گرفتار ہونے کا عادی نہ تھا۔

مولانا رح کو مجدد الملت اور حکیم الملت کی حیثیت سے سیاسی مسائل کے استفسارات پر مسئلہ کی شرعی حیثیت واضح کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک وکیل منفعت علی صاحب کا خط ملا۔ تحریر تھا، مسلم لیگ یا کانگریس میں سے کس جماعت میں شرکت کرنی چاہیے[2]۔ اس کا جو جواب مولانا تھانوی رح نے دیا اس سے ان کے نظریہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

"از خود نہ کسی سے آویزش کی ضرورت ہے نہ آمیزش کی ضرورت ہے۔ رضائے حق کو مطمحِ نظر رکھ کر اپنے کام میں لگے رہیں اور اس رضا کی شرط یہ ہے کہ ہر کام میں اس کا پورا پورا لحاظ رکھیں کہ کوئی امر خلافِ شرع نہ ہونے پائے

---

[1] حکیم الامت صفحہ ۲۷۶

[2] سیرت اشرف صفحہ ۵۹۷ بحوالہ مسائل سیاسیہ صفحہ،

یہی عبدیت کی روح اور حیاتِ مسلم کی اصل الاصول ہے[1]"

سیاسی طوفانوں کے اختلافات کی زد میں بہت سے اربابِ استقامت ڈگمگا جاتے ہیں لیکن مولانا رح کو خدا نے اپنے اصولوں اور فیصلوں میں بہت مستقل مزاج بنائے رکھا۔

؎ خلقے بمنت یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف

کے مصداق اپنے خانقاہی فیوض و برکات سے مستفید کرتے رہے۔

مذہبی و سیاسی پس منظر کی ایک جھلک

۱۸۵۷ء میں جب کہ انگریزی حکومت قومی شورش کو دبا چکی تھی لیکن ملک میں قہر یا حکومت کا دور دورہ تھا۔ اس دور کے علماء نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور علماء کی وہ جماعت قابلِ ذکر ہے جس نے دیوبند کے دینی مدرسہ دارالعلوم کی بنیاد ڈالی۔ یہ وہ علماء تھے جو مذہبی مکتبِ فکر میں شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے ہم خیال تھے اور سیاسی تحریک میں مولانا سید احمد بریلوی رح کے ساتھ تھے[2]۔

شاہ ولی اللہ اٹھارویں صدی کے ایک عظیم رہنما تھے، جنھوں نے پورے مسلم معاشرے کی اصلاح کے اصول بنائے اور شریعت کو عقلی استدلالی رنگ میں دلائل کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس مقصد کا اظہار حجۃ اللہ البالغہ جلد اول صفحہ ۳ مطبع خیریہ مصریہ میں کیا ہے۔ دوسری تحریک اس سلسلہ کی کڑی سر سید رح کی تحریک تھی جس کا اہم جز ہندوستانی مسلمانوں کو انگریزی علوم کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ انھوں نے انگلستان کے سفر میں وہاں کے تعلیمی اداروں اور خاص طور پر کیمبرج یونیورسٹی کا گہری نظر سے جائزہ لیا واپس آ کر انھوں نے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔

---

[1] افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ بحوالہ سیرت اشرف صفحہ ۵۹۷

[2] ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں صفحہ ۶۳

۱۸۷۰ء میں ایک کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ میں سرسید رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر بھی شامل کی گئی جس میں ایک اقامتی دارالعلوم کے قیام کی مفصل تجویز تھی جو تین مدرسوں میں مشتمل ہو ہر ضرورت کے لحاظ سے۔ ایک اردو مدرسہ، ایک عربی فارسی مدرسہ اور ایک انگریزی مدرسہ۔ غرضکہ اس مدرسہ کی بنیاد اینگلو اورینٹل کالج کے نام سے پڑی۔ بعد میں اسی کالج کی ترقی یافتہ شکل کا نام "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" ہوا۔ جو آج اپنی مکمل شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

سرسید رحمۃ اللہ علیہ کے نصب العین میں ان کا رویہ مذہب کی طرف ذہنی تھا اور روحانی عنصر کم۔ وہ علمی لحاظ سے ہر مذہب فکر کے لوگوں سے قریب تھے خواہ وہ ہندو ہوں یا عیسائی۔ ساتھ ہی اسلامی روایات کے بھی وارث تھے جو شمالی ہند کے مسلمانوں امراء اور شرفاء کے اعلیٰ اور درمیانی طبقہ کی روایات تھیں۔

عورتوں کی آزادی اور ان کے حقوق کا تصور یہ تھا کہ وہ پردے میں رہ کر تعلیم حاصل کریں۔ علی گڑھ مدرسۃ العلوم کی بنیاد ۱۸۷۵ء میں رکھی گئی[1]۔ جب کہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ۱۸۶۶ء میں رکھی جا چکی تھی۔ دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور علی گڑھ کے بانی سرسید احمد خاں ہوئے۔

ایک ادارہ قدیمی تعلیم کا دوسرا جدید طرز تعلیم کا۔ جدید دور کے تقاضوں کے پیش نظر جدید نصاب کے ساتھ قائم کیا گیا۔ یہ دونوں عظیم ادارے ہندوستان کی دو بڑی تحریکوں کا مرکز بنے[2]۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ان عظیم اداروں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور علوم و فنون کی تعمیر و ترقی میں ایک بہترین رول ادا کیا۔

سرسید احمد خاں نے معاشی و سیاسی زبوں حالی کا علاج اقتصادی حالات کو بہتر

---

[1] علی گڑھ تحریک صفحہ ۲۱۷، مضمون دیوبند اور علی گڑھ، مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔

[2] ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں صفحہ ۱۵

کرنے کے لیے علوم جدیدہ کی طرف توجہ کو ضروری سمجھا۔ دوسری طرف مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت اور تحریک کا بنیادی مقصد مذہبی تعلیم و ترویج رہا۔ دیوبند کی اس مخلص جماعت نے مسلمانوں کے ذہن کو دین کی طرف مائل کیا۔ کشمیر سے راس کماری تک انھوں نے مذہبی نظام تعلیم اور اخلاقی نظام کے ساتھ قوم کے مسلمانوں کو پنجوقتہ نماز مسجدوں میں اذان اور جماعت کے لیے تیار کیا اور مسلمان بچوں میں کلام پاک کی تعلیم کا انتظام کیا۔

اگرچہ دیوبند کے علماء کی یہ تحریک مسلمانوں کے معاشی اور سماجی زندگی میں بظاہر موثر ثابت نہیں ہوئی۔ مگر دینی علوم اور عمل کو اس تحریک نے مسلمانوں سے پوری طرح ہم آہنگ رکھا۔ لیکن ایک دوسرا سانحہ اس دور میں یہ پیش آیا کہ اہل سنت والجماعت علماء کی جماعت میں کئی فرقے پیدا ہو گئے۔ مثلاً غیر مقلد، بریلوی، قادیانی وغیرہ۔ شریعت کی حدود سے متجاوز صاحبان طریقت کا وہ طبقہ الگ تھا جس نے طریقت کو چند رسومات تک محدود کر کے دوسری خرافات کو مذہب میں داخل کر لیا تھا۔

خود ساختہ صوفیوں، درویشوں، پیرزادوں کی تحریف نے تصوف کی مقدس روایات کو ناقابل اعتبار مراقبوں، مجاہدوں اور ریاضتوں اور عباد کو بے روح بنا دیا تھا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد سے یہ محرکات عوام و خواص کے طبقوں کو متاثر کر رہے تھے۔ مگر علماء دیوبند کی جماعت نے مذہب و معاشرہ کی بے راہ روی کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے اصلاح و تبلیغ کے فرائض کو بھی انجام دیا[1]۔

علماء کے اسی گروہ کے ایک عالم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا نام آتا ہے جن کی قیادت میں تھانہ بھون میں آزاد حکومت بنائی گئی اور اس کے سپہ سالار مولانا قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مقرر کیے گئے۔ اس مختصر سی روحانی طاقت والی جماعت نے قصبہ شاملی پر حملہ کر کے

---

[1] مسلمان آئینہ ایام میں صفحہ ۶۳

انگریزی فوج کو شکست دی اور اس قصبہ کو فتح کر لیا۔ جنگ کا نقشہ جب پلٹا تو حاجی امداد اللہ صاحبؒ اور مولانا قاسم رح کے نام انگریزی حکومت نے وارنٹ جاری کیے[1] مصلحتاً گرفتاری سے بچنے کے لیے یہ دونوں حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے اس ہنگامہ میں شرکت کرنے والوں کی معافی کا اعلان ہو گیا تو یہ دونوں حضرات واپس آ گئے اور دیوبند میں آخری لمحات تک مدرس کی خدمات انجام دیتے رہے[2]۔

مولانا قاسم صاحبؒ کے گروہ کے علمار شاہ ولی اللہ رح کے اجتہادی کارناموں کی تجدید جدید ضرورتوں کی روشنی میں اصلاح و تبلیغ کے ساتھ کرتے رہے۔ اسی فضا میں ان بزرگوں کی روایات کے علمبردار مولانا تھانوی رح کا دور آتا ہے۔ انھوں نے رشد و ہدایت اور اصلاح و تبلیغ کے اس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور دیوبند کے مسلک سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے اپنے مشن کو میدانِ جنگ کی بجائے صرف مسندِ درس کی طرف منتقل کیا۔

اس صدی کے علمار میں مولانا اشرف علی تھانوی رح بحیثیت مجدد نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ سید سلیمان ندوی رح نے مقدمہ تجدید دین کامل میں شیخ احمد سرہندی رح سے لے کر سید احمد شہید تک تاریخ پیدائش و وفات کے ساتھ سلسلہ وار مجددوں کی فہرست تحریر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

"عصرِ حاضر یعنی چودھویں صدی کے مجدد کے تعین کے لیے بھی وہی معیار ہوگا جو اگلوں کے لیے تھا[3]" اس صدی کے بزرگوں میں مرشدنا، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کی ایک خاص ممتاز حیثیت ہے"۔

آگے مولانا رح کے صفاتِ ظاہری اور باطنی کو تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" ایسے اوصاف میں جن کا اجتماع ان کے محبین و معتقدین کے خیال میں

---

[1] ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں صفحہ ۹۶

[2] علی گڑھ تحریک، دیوبند و علی گڑھ صفحہ ۲۱۸

[3] مقدمہ تجدید دین کامل صفحہ ۲۴ ۔ سید سلیمان ندوی

اس درجہ پر ہے کہ وہ منصب تجدید کی حد تک پہنچتا ہے"۔[1]

مولاناؒ کی زندگی کا نصب العین

حکیم الامت مولانا تھانوی رح کی پوری زندگی کا لبِ لباب اور مقصد علم و عمل کے ساتھ امت میں انسانیت، شرافت، باطنی ترقی، روح کی پاکیزگی کی طلب پیدا کرنا تھا۔ ان تمام صفاتِ حمیدہ کو پیش کرنے کے لیے ایک ایسے مکمل نظامِ حیات کو پیش کرنے کی ضرورت تھی جو طالبانِ حق کے سامنے ایسے دلائل اور عمل کے ساتھ پیش ہو جو دشوار اور انکار کی گنجائش نہ رکھے اس میں نہ دنیا سے بے نیازی ہو اور نہ دین سے غفلت ہو اور نہ ایسی باطنی کیفیات کی مشق ہو جہاں صرف مراقبہ اور حال کی کیفیات طاری رہیں۔

مگر سوال یہ تھا کہ وہ کونسا طریقہ ہے جو صحیح معنوں میں انسانیت کا نمونہ سامنے آئے اور صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرے۔ مولانا تھانوی رح نے اس مکمل نظامِ حیات کی بنیاد احیارِ سنت کو بنایا، یہی ان کا مسلک تھا۔ آپ نے احکامِ شریعت کو پورا کرنے اور کرانے کا اہتمام کیا۔ زندگی کے ہر موڑ پر ہر ہر قدم پر اپنے نفس کو شیطان کے مکائد سے بچانے کے لیے شریعت کے احکامات کا تابع بنانے کی پوری مشق خود کی اور دوسروں کو بھی اس کا درس دیا۔ ان کے درس کا محور مذہب اسلام کے یہ دو اصول تھے۔ حق العباد اور حق اللہ۔ یعنی مولانا تھانوی رح کا مقصد یہ تھا کہ عبد کا رشتہ معبود سے ہرگز نہ ٹوٹنے پائے۔ دوسرے آپس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو۔

اور جب یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ خالق کا مخلوق سے کس قدر گہرا رشتہ ہے تو کائنات کے ذرّے ذرّے کو دیکھ کر بنانے والے کی عظمت اور اہمیت کا یقین ہوتا ہے اور وہ اپنے وجود کو بھی اسی کی مِلک سمجھتا ہے اس پر اس کا تصرف سمجھتا ہے اور اپنی زندگی کے ہر عمل کو پھر خدا کے بتائے ہوئے طریقوں میں ڈھالنے کو ضروری سمجھتا ہے۔ اور

---

[1] مقدمہ تجدید دین کامل صفحہ ۲۵، سید سلیمان ندوی

جب یہ جذبہ بیدار ہو جاتا ہے تو آپس کے حقوق کا اہتمام کرے بغیر مقصدِ حیات کو نامکمل سمجھتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا کہنا یہ تھا کہ :۔

"ہم کو تو اللہ تعالیٰ نے اپنے تعلق اور اپنی بندگی کا یہ راز بتایا کہ دیکھو روز مرّہ کی زندگی میں یہ کرنا اور یہ نہ کرنا۔ یہ بات ہم کو پسند ہے اور یہ ناپسند۔ یہ چیز حلال ہے اور یہ حرام۔ یہ چیز پاک ہے اور یہ ناپاک۔ دیکھو اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے صحیح تعلق پیدا کرو، ہماری معرفت حاصل کرو، ہماری محبت سے سرشار رہو تو پھر ہمارے محبوب نبی صلی اللہ علیہ کی اتباعِ کامل کرو، پھر تو ہم خود ہی تم سے محبت کرنے لگیں گے۔ بتاؤ اس سے بڑی دولت ونعمت تم کیا چاہتے ہو" [1]

مولانا تھانوی رح اپنے عقیدت مندوں اور مریدین سے جب کبھی گفتگو کرتے چاہے تحریر میں ہو یا تقریر میں۔ ان کی تحریر و تقریر سب میں ان کا یہی مقصدِ حیات کارفرما نظر آتا ہے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

"بزرگ بنا ہو، قطب بنا ہو، غوث بنا ہو تو کہیں اور جاؤ، اور انسان بنا ہو تو یہاں آؤ۔ پہلے آدمی بنو، بزرگی بیچاری تو ایک دن میں ساتھ ہو لیتی ہے۔ مشکل چیز تو شرافت ہے اور شعور انسانیت ہے" [2]

مولانا تھانوی رح کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ معاملات اور معاشرت کے اصولوں کے خود بھی پابند رہتے اور اپنے سالکین کو بھی اس کی تاکید کرتے۔

اگر تہجد، نوافل اذکار و وظائف کسی کے چھوٹ جاتے تو مولانا رح کی گرفت سخت

[1] ماثرِ حکیم الامت صفحہ ۱۰۲، ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب فاروقی، تاریخِ طباعت ۱۳۹۲ھ

[2] ماثرِ حکیم الامت صفحہ ۹۶

نہ ہوتی اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مرضِ وفات کے زمانہ میں جب کہ اکثر آپ آنکھ بند کیے لیٹے رہتے کسی ایک شخص کا خط پڑھ کر مولانا رح کو سنایا گیا۔

خط میں دریافت کیا گیا تھا کہ نماز میں دل نہیں لگتا کیا کیا جائے تو فوراً جواب دیا "ان کو لکھدو دل لگنا فرض نہیں ہے دل لگانا فرض ہے" [1]

لیکن حقوق العباد کے معاملہ میں ان کا نظریہ تھا کہ ہر انسان چونکہ اس کا مکلّف ہے کہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے لہٰذا کوشش ہونی چاہیے کہ حق ادا کرتے رہے اور اس کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے یہی تصوف کی بنیاد ہے۔

ان تمام پابندیوں کے باوجود اپنی ذات میں شریعت کا اہتمام مولانا رح کی زندگی میں اس درجہ تھا کہ تمام عمر یونانی علاج کرایا ڈاکٹری علاج نہیں کرایا۔ لیکن زندگی کے آخری ایامِ علالت میں جب مولوی شبیر علی نے کہا کہ شریعت نے جب اجازت دے دی ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ آپ نے کہا "اچھا شروع کر دیجیے میں کہاں کا ایسا متّقی ہوں۔"

اس طرح آپ نے ساری عمر کے تقوی کو فتوے پر قربان کردیا۔ محض اس خیال کی وجہ سے کہ لوگ مجھے متّقی نہ سمجھیں۔ اور شریعت کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔ غرض مولانا تھانوی رح کی زندگی پوری ان مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کا مسلک عملی زندگی میں اتباعِ سنّت، احکامِ شریعت کی پابندی رہا اور دوسروں کو بھی اپنی علمی اور عملی صلاحیتوں سے تمام عمر اسی کا درس دیتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ اہلِ باطن ان سے بہت متاثر ہوئے اور اکثر نے اپنی زندگی ان کی تصانیف و مواعظ سے بدل دی جیسا کہ خود مولانا عبدالماجد صاحب نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ میں :۔

"قصد السبیل پڑھتا جاتا تھا اور سطر، سطر پر پردے نگاہوں سے ہٹتے

[1] ماثرِ حکیم الامت، صفحہ ۸،

[2] ایضاً، صفحہ ۴،

جانے تھے۔

کتابیں پڑھ کر جب آنکھ بند کیں تو عالم ہی دوسرا تھا۔

ع اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں

مولانا تھانوی رح نے سیاست کے ہنگاموں سے دور خانقاہ کے ایک گوشے میں بیٹھ کر اپنے علوم و معارف کے خزانوں کو خلوص و محبت کے ساتھ ہر خاص و عام پر اس طرح لٹایا کہ جو کہیں اہلِ ظاہر تھے ان کے روحانی فیوض سے وہ بھی مالامال ہو گئے۔

آپ کا مسلک اور نصب العین بگڑے ہوئے افعال کو درست کرنا تھا شریعت و سنّت کی روشنی میں۔ آپ فاعل کی ذات سے کبھی تعرّض نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے فعل کو بُرا سمجھتے تھے۔ مولانا رح امت کی ڈوبتی ہوئی نبض پر نظر رکھتے تھے اور شفا رُوحانی کے نسخوں کو آخری دم تک تجویز کر کے روحانیت کے امراض کو دور کرتے رہے، جس کا ثبوت ان کی زندہ جاوید تصانیف۔ ان کے مسلک پر چلنے والے خلفار کی خدمات" جن کا فیضِ تربیت اب بھی جاری ہے،، جس کا بیّن ثبوت ان کے مواعظ اور فقہی خدمات سے ملتا ہے۔

آپ کے مسلک اور زندگی کے نصب العین کا پورا پورا نچوڑ اتباعِ سنّت اور احیارِ سنّت اور احکامِ شریعت کی پابندی تھا۔

ظاہری و باطنی حالات و معمولات کا مختصر خاکہ وفات تک

مولانا اشرف علی تھانوی رح میانہ قد تھے لیکن قد درازی مائل تھا، جسم تندرست تھا، بدن دوہرا، ہڈیاں چوڑی تھیں، رنگت گندمی کھلی ہوئی تھی۔ چہرہ ہموار بھرا ہوا گول تھا، جس پر وقار سنجیدگی نمایاں تھی۔ سر پر خمدار بال تھے، داڑھی بھری ہوئی، دہانہ متوسط تھا۔ آپ کی پُر اثر آنکھوں میں سرگیں ہونے کے ساتھ سُرخی مائل ڈورے کھنچے

[1] مآثر حکیم الامت صفحہ ۷۰

ہوئے تھے اور بہت بارونق اور پرکیف نظر آتی تھیں، عجیب سا اثر تھا۔ اہلِ مشاہدہ کا کہنا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ دیکھا ہی کرو۔ مگر کوئی آنکھ بھر کے نہ دیکھ سکتا تھا۔

اگر کسی خوش قسمت کی جانب نگاہیں اٹھ بھی جاتیں تو باوجود شوق کے تاب نہ لا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا تھانوی کو بسطۃً فی العلم کے ساتھ بسطۃً فی الجسم کا وافر حصّہ عطا فرمایا تھا۔[1]

مولانا تھانوی رح کی طبیعت میں بہت سادگی تھی۔ اکثر سفید لباس استعمال کرتے تھے۔ کرتے کا گریبان اکثر کچھ اوپر سے کھلا رہتا تھا۔ پانچ کلی کی ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ سردیوں میں گرم عبا کا استعمال کرتے اور سر پر رومال باندھ لیتے تھے۔ ہفتہ میں دو مرتبہ لباس تبدیل کرنے کی عادت تھی۔ جمعہ کو خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ چلنے کا انداز شاہانہ تھا۔

مولانا رح نے دو شادیاں کیں لیکن اولاد کسی سے پیدا نہ ہوئی۔ دوسری شادی کرنے کی تفصیل اپنے رسالہ اصلاحِ انقلاب میں تحریر کی ہے۔ بڑی بیوی بڑی پیرانی صاحبہ اور چھوٹی بیوی چھوٹی پیرانی صاحبہ کے نام سے موسوم تھیں۔ دونوں طبیعتاً نیک اور دین دار تھیں۔ ابتدا میں پہلی بیوی پر دوسری شادی کا اثر رہا۔ بعد میں مولانا تھانوی رح کے منصفانہ طرزِ عمل، اور ادائیگی حقوق کی حد درجہ رعایت کی بنا پر ختم ہو گیا تھا۔

عقدِ ثانی کرنے کے بعد آپ نے عدل کی وہ مثال قائم کی جس کی بنیاد پر شریعت نے عقدِ ثانی کی اجازت دی ہے۔ ہر چیز دونوں کو برابر دیتے جس کے لیے ایک ترازو بھی بنا رکھی تھی۔ جسے مزاحاً "میزانِ عدل" کہا کرتے تھے[2] عدل کے سلسلہ میں جن مشکل مرحلوں سے انھیں گذرنا پڑا۔ اس کا اندازہ حضرت کے اس اظہارِ خیال سے ہوتا ہے:

"میں نے عقدِ ثانی کا دروازہ کھولا نہیں بلکہ بند کر دیا ہے۔ کیوں کہ جب

[1] تجدید دین کامل صفحہ ۴۴ و مآثر حکیم الامت صفحہ ۴۵

[2] اشرف السوانح حصہ سوم صفحہ ۲۰۴

لوگ دیکھیں گے عدل کی اتنی رعایت کرنے پڑے گی تو اس کو دشوار سمجھ کر عقدِ ثانی کی ہمت ہی نہیں کریں گے۔"[1]

آپ نے دونوں بیویوں کا مہر باوجود بڑی پیرانی صاحبہ کے اپنا مہر معاف کرنے کے ادا کیا۔ آپ فرماتے تھے کہ اگر عورت مہر معاف بھی کر دے تو بھی مرد کی غیرت کا تقاضہ ہے کہ مہر ادا کرے۔"[2]

اپنے حقوق کا استعمال حاکمانہ انداز سے نہ کرتے۔ گھر میں بہت بے تکلفی اور خوش مزاجی کے ساتھ پیش آتے۔ جب خانقاہ آجاتے تو ایسے معمولات میں مصروف ہو جاتے گویا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسروں کو بھی روزانہ کی زندگی میں ہر جگہ اور ہر موقع کے لحاظ سے فرائض کے ادا کرنے کی تاکید کرتے۔

مولانا رح کے یہاں روزانہ کے معمولات میں پابندی اور اہتمام سے متعلق ایک نقشہ روزانہ معمولات کا آویزاں کیا ہوا تھا۔ کسی کو انتظار و جواب کی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ خصوصی موانع پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ فجر کی نماز کے بعد گھر سے خانقاہ آجاتے۔ اس خانقاہ میں جو دکانِ معرفت نظر آتی تھی تین اہم بزرگوں نے قیام کیا۔ حاجی امداداللہ صاحبؒ، حافظ محمد ضامن شہید رح، مولانا شیخ محمد صاحب رح۔ ان بزرگوں کی ہجرت، شہادت اور وفات سے کچھ عرصہ کے لیے خانقاہ خالی رہی لیکن مولانا اشرف علی تھانوی رح نے اپنے مرشد حاجی امداداللہ رح کے اشارے پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔[3]

ان کے معمولات خانقاہ میں یہ تھے کہ فجر کی نماز کے بعد سالکین کے خطوط کے جوابات تحریر کرتے پھر چہل قدمی کے لیے تشریف لے جاتے اور اسی چہل قدمی میں ایک قرآن پاک کی تلاوت کر لیتے۔

---

[1] اشرف السوانح حصّہ سوم صفحہ ۲۰۳

[2] سیرت اشرف صفحہ ۲۷۶

[3] اشرحکیم الامت صفحہ ۲۸

واپس آ کر اشراق کی نماز پڑھتے اور پھر تصنیف کے مشغلہ میں ہمہ تن محو ہو جاتے۔ یہ وہ مشاغل تھے جو سفر اور حضر دونوں میں جاری رہتے۔ مولانا رح کا ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں زیادہ تر ان کی اپنی تصانیف تھیں۔

مولانا تھانوی رح کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وقت کی قیمت و اہمیت کے پیش نظر انھوں نے اپنی تمام زندگی کو معمولات کی پابندی میں ڈھال لیا تھا وہ وقت کے ایک لمحہ کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ مولانا رح وقت کو دین و دنیا کا عظیم سرمایہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے علمی سرمایہ تمام مصروفیات کے باوجود اتنا کثیر چھوڑا ہے کہ عقل متحیر ہے۔

مختصر یہ کہ ان کی زندگی کا کوئی معمول ایسا نہ تھا جو غیر معمولی ہو۔ نشست و برخاست سے لے کر ملاقات و گفتگو تک۔ لیکن ان کی شخصیت میں باوجود سادگی کے ایسی صلاحیتیں پوشیدہ تھیں کہ خلائق کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ ایسا کیوں تھا تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا تھانوی رح کے معمولاتِ زندگی سے روحانی افادیت اور گہری کشش کا احساس ہر ایک کا حصہ نہ تھا۔ بقول مجذوب صاحب:۔

ع اہلِ ظاہر تجھے سمجھے نہیں اے سادہ جمال

سچ ہے کہ مولانا رح کی نظر تک میں وہ اثر تھا کہ صوفی سلیمان صاحب لاج پوری گجرات کے صاحبِ سلسلہ شیخ و بزرگ تھے مولانا تھانوی رح سے ملاقات کے بعد مسجد میں گھنٹوں روتے رہے۔ مولانا تھانوی رح کا نام لے کر کہا۔ نہ جانے آنکھوں سے کیا کر گئے۔[1]

بزرگوں کے حالات اور زندگی میں ظاہری اور باطنی بہت سی ایسی کیفیات پیش آتی ہیں جن کا سمجھنا ہر ایک کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ لیکن محبوبیت اور مقبولیت کے درجہ میں جب کوئی انسان پہنچ جاتا ہے تو اس کے تاثرات ہر خاص و عام پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اور یہی امتیازی حیثیت مولانا اشرف علی تھانوی رح کو حاصل ہوئی۔

مولانا اشرف علی تھانوی رح کا آخری دور اُن کی عمر کے بیاسی سال طے کرنے کے

---

[1] اشرف السوانح صفحہ ۳۰

بعد ختم ہو جاتا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اکثر آنت اترنے کی شکایت رہتی تھی۔ وفات سے ۵ سال قبل اور مختلف شکایات بھی ہو گئی تھیں۔ البتہ وفات سے پہلے علالت کی کمزوری اور جگر پر ورم کی تکلیف تھی۔

کبھی دستوں کا سلسلہ جاری ہو جاتا جس سے بے حد ضعف بڑھ جاتا تھا۔ علالت کے آخری ایام میں بھوک مفقود ہو گئی تھی اور بے ہوشی کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔

لکھنؤ کے خاص معالج حکیم عبدالمجید صاحب کو لکھنؤ سے بلایا لیکن علاج سے کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا۔ لیکن انتہائی حیرت انگیز اور قابلِ تحسین بات یہ تھی کہ ان تمام تکالیف کے باوجود معاملات میں صفائی تحقیق و تدقیق کا دامن تادمِ زیست نہ چھوٹا۔ اس کی مثال کے لیے بے شمار واقعات موجود ہیں۔

انتقال کے وقت بے ہوشی کے عالم میں تھے کہ کچھ ہوش آیا، تو دریافت کیا مغرب میں کیا دیر ہے؟ کسی نے کہا حضرت دس منٹ، فوراً استفسار کیا وقت کے آنے میں یا وقت کے جانے میں[1] پھر اسی عالم میں حقوق العباد کے اہتمام کی مثال ملتی ہے۔ اپنی چھوٹی اہلیہ سے مغرب کی نماز کے بعد دریافت کیا۔ میں تم دونوں کو اس ماہ کا خرچ دے چکا ہوں۔ انھوں نے اطمینان دلایا، پھر امانتوں کی رقموں کو گنوایا۔ ایک لفافہ میں چودہ آنہ نکلے۔ حساب لگانے والے نے بتایا تو پھر فرمایا نہیں پندرہ آنہ ہوں گے، اسی اثنا میں غشی طاری ہوئی اور لفافہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس میں سے ایک آنہ اور بھی نکلا[2]

موت جیسے نازک لمحات میں جب مریض بسترِ مرگ پر خود اپنے لیے دوسروں سے تسلی کے الفاظ سنتا ہے، یہ مردِ خدا اس حالت میں بھی دوسروں کے حقوق اور امانتوں کی فکر کرتے ہوئے معاملات کو صاف کرتا رہا۔ خطوط کے جوابات تک بھی غنودگی کی حالت میں ترک نہ کیے۔ آخری دم تک مصالحہ عقلیہ اور شرعیہ کے اصولوں پر نظر رہی۔

---

[1] سیرت اشرف صفحہ ۷۰۳، وخاتمۃ السوانح صفحہ ۱۷

[2] سیرت اشرف صفحہ ۷۰۴

علالت کی شدید خبر سن کر عقیدت مندوں کا ہجوم شروع ہو گیا تھا اور مشتاقانِ دید بغیر اطلاع کے خانقاہ اشرف کے ضابطے کے خلاف چلے آرہے تھے۔ اس بیماری میں کبھی ان سے دریافت کرتے اجازت نامہ کہاں ہے؟ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی پہنچے جو بغیر اطلاع نہیں آئے تھے۔ ان کے آنے کی خبر سن کر خبر دینے والے کو کہا تم جانتے بھی ہو ان کو یا ایسا ہی کہہ دیا۔ مجلس کے وقار اور نظم و ضبط کے تصور میں آخری وقت تک فرق نہیں آیا۔

سفرِ آخرت کی تیاری کا یہ عالم تھا کہ تمام انتظامات، حساب کتاب وصایا سے پوری پوری فراغت حاصل کی۔

۱۶ ر رجب ۱۳۶۲ھ بمطابق ۲۰ ر جولائی ۱۹۴۳ء کی صبح کو کہنے لگے اتنی شدید تکلیف مجھے عمر بھر نہیں ہوئی۔ بجائے کراہنے کے لفظ اللہ اس انداز سے فرمایا کہ سب کو تشویش ہو گئی[1]

شام کو چھوٹی پیرانی صاحبہ سے کہا آج ہم جا رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہاں؟ فرمایا کیا تم نہیں جانتیں۔ انتقال سے سوا گھنٹہ پہلے آخری غشی طاری رہی۔ مولانا ظفر احمد صاحب یٰسین شریف پڑھتے رہے اور آبِ زمزم چمچے سے ڈالتے رہے اور خسرو دربار اشرفیہ خواجہ عزیز الحسن اور دیگر معتقدین حسرت اور بے بسی کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ لشکرِ اسلام کا سب سے بڑا جنرل دین کے ہر ہر محاذ، ہر ہر معرکہ، ہر ہر مورچے کا وار اپنے جسم کا پورا پور دین کی راہ میں چور چور کیے ہوئے قلبِ خاشع نفسِ مطمئنہ کے ساتھ عالمِ ناسوت کی بالکل آخری منزلوں سے گزر رہا تھا[2]۔ ۲۰ ر جولائی ۱۹۴۳ء کی شب میں عشاء کے وقت آپ نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ خبر بجلی کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ اسپیشل گاڑی محکمہ ریلوے نے سہارنپور سے تھانہ بھون

---

[1] سیرت اشرف صفحہ ۷۰۵

[2] سیرت اشرف صفحہ ۷۰۵، صفحہ ۷۰۶، وحکیم الامت صفحہ ۶۰۵

کی طرف چلائی. ہزاروں کی تعداد میں لوگ جنازہ میں شرکت کے لیے تھانہ بھون پہنچ گئے۔ عجیب رقت آمیز منظر تھا۔ تمام راستے پر ترشح سے چھڑکاؤ سا ہو گیا تھا۔

مولانا ظفر عثمانی نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت تھانوی رہ کے وقف کردہ قبرستان میں انھیں دفن کر دیا گیا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

غرض کہ اس دور کا خاتمہ ہو گیا جو حاجی امداداللہ صاحبؒ، مولانا یعقوب صاحبؒ، مولانا قاسم صاحبؒ کی یادگار تھا۔

لقد قبضت روح العلیٰ والمکارم
بموت حکیم الھند اشرف العالم[۱]

تصانیف و مواعظ کی اہمیت

کسی بڑی شخصیت کے عناصر اس کے ماحول، مزاج و فطرت اور علمی دور سے بنتے چلے جاتے ہیں۔ مولانا اشرف علی رہ کے ساتھ بھی قدرتی طور پر یہ سلسلہ ابتدا ہی سے جاری رہا۔ ان کی فطرت میں خدا نے تبلیغ احکام خداوندی کی صلاحیتوں کو پیدا کیا تھا۔

صحیح تعلیم و تربیت اور ماحول نے اس کو نورٌ علیٰ نور کے مطابق روشن ترین کر دیا۔ احکام الٰہی کی اشاعت کا سلسلہ انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور اس سنّت کی اتباع کے لیے خدا نے انھیں قبول کر لیا اس طرح کہ ان کی تصانیف و مواعظ جو صدہا کی تعداد میں ہیں تحریری شکل میں محفوظ ہوئے جن کے اثرات اور اسرار و رموز علوم دینیہ اور دنیویہ دونوں کے لحاظ سے محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس صدی کے علماء میں بحیثیت مصنف اور واعظ

---

۱ مرثیہ حکیم الامت صفحہ ۴۷ برہان دسمبر ۱۹۴۳ء جلد یازدہم شمارہ ۶

کے مولانا تھانوی رہ کو ایک امتیازی مقام حاصل ہوا۔ جس کی ابتدا ان کی تصنیف "مثنوی زیر و بم"[۱] اور ان کے مواعظ جو طالب علمی کے دور سے شروع ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ اس ابتداء نے التشرف، التکشف، قصد السبیل، تفسیر بیان القرآن، اعلاء السنن، حیات المسلمین، سلسلہ مواعظ کی کئی جلدوں کی شکل اختیار کر لی۔

یہ وہ اہم تصانیف ہیں جن میں مضامین کی بلندی کے ساتھ تصوف کے رموز و نکات کو شریعت کی روشنی میں اجاگر فرمایا ہے۔

مواعظ میں تمثیلات، حکایات و اشعار کا موقع و محل کے لحاظ سے پیش کرنے میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ اثر کا یہ عالم تھا کہ دیندار کے علاوہ دنیا دار، انگریزی داں حضرات بھی عقلی دلائل سے بھرپور مواعظ پر دنگ رہ جاتے۔ جو حضرات ان کو خشک مولوی تصور کرتے وہ بھی ان محققانہ، عالمانہ بصیرت افروز مواعظ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ خود مولانا عبدالماجد صاحب اپنے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"دل میں یہ جم گئی کہ وہ کٹر قسم کے مولوی ہیں، تشدد میں بسے ہوئے۔ تقشف میں رچے ہوئے۔ بات، بات پر گھڑکی، قدم قدم پر جھڑکی، فلاں عمل حرام، فلاں عمل بدعت، یہ چیز ناجائز، وہ چیز معصیت"۔[۲]

مولانا کے بارے میں جس کے دل میں یہ غبار بھرا ہوا تھا جب قصد السبیل اور تربیت السالک وغیرہ جیسی اہم کتابوں کا مطالعہ کیا تو بیساختہ یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں[۳]

نہ صرف یہ کہ مسلمان بلکہ غیر مسلم ہندو، عیسائی مذہب کے مفکر بھی متاثر ہوئے۔ ایک جہاز کے کیپٹن نے کہا۔ اگر یہ شخص انگریزی پڑھ لیتا تو بڑا جج بنتا۔ ایک تعلیم یافتہ آریہ سماج[۴] کے نوجوان نے روزہ کے متعلق مولانا رہ کا وعظ دیکھ کر کہا۔ یہ ایسے مضامین ہیں کہ ہر مذہب والا اپنے

---

۱ تالیفات اشرفیہ، صفحہ ۳۶
۲ حکیم الامت صفحہ ۲
۳ ایضاً صفحہ ۴
۴ اشرف السوانح، حصہ اول صفحہ ۶۶

مذہبی اصول پر منطبق کر سکتا ہے۔

اکابر اور بزرگانِ دین نے جو مستند اور اہل الرائے ہوئے ہیں۔ ان میں مولانا رشید احمد گنگوہی رح لوگوں سے فرماتے۔ "مولانا رح کے حقانی وعظ سنو"[1] اسی طرح مولانا خلیل احمد سہارنپوری رح نے فرمایا "حضرت تھانوی رح کا وعظ ایسا ہوتا ہے کہ انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی"۔

ان کے وعظ سننے والوں کا ہزاروں کا مجمع ہوتا، ہر طبقہ کے افراد شریک ہوتے، ہر یک کی فہم کا لحاظ کرتے۔ کوئی مضمون علماء سے متعلق ہوتا اور روئے سخن جب اُن کی طرف کرتے تو تقریر میں علمی نکات کی وضاحت اس طرح کرتے کہ عوام اور عالم دونوں سر دھنتے۔

صوفیاء سے مخاطب ہوتے تو معارف و حقائق کی مشکل منزلوں سے ایسے گذرتے کہ ان کی نظر قلب کی گہرائی تک پہنچ جاتی۔ سارے شبہات اور اعتراض دور کر دیتے۔ لیکن احکامِ شرعی جو خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے ہوتے وہ عقلی دلائل کے باوجود بھی پیش نظر رہتے۔ ان میں ذرہ برابر کوئی اختلاف نہیں ہونے پاتا۔

خطابت کی یہ بڑی خوبی ہے کہ سامعین کے ذوق کا لحاظ رکھا جائے۔ مولانا رح کے مواعظ کی تاثیر یہ تھی کہ دین میں طرح طرح کے شبہات رکھنے والے لوگ جن کے عقائد کمزور ہوتے اور دین کے صحیح راستے سے بھٹکے ہوئے ہوتے سب کے ذہن صاف ہو جاتے۔

دراصل ان کے دل میں بندگانِ خدا کے لیے ایسی تڑپ اور لگن تھی جس میں ان کی اصلاح کا سچا جذبہ پوشیدہ تھا اور ان کا اپنا قلبی تعلق خدا سے وابستہ تھا۔ لہٰذا ہر بات دل سے نکلتی تھی اور دل پر اثر کر جاتی تھی۔ دورانِ وعظ میں خود کہتے:

"صاحبو! کس طرح اپنے دل کی بات آپ کے دل میں ڈالوں اور کس طرح اطمینان دلاؤں، قسم سے زیادہ کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں۔ میں خدائے تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں واللہ، ثم واللہ، ثم واللہ اگر تم خدائے تعالیٰ

[1] اشرف السوانح حصۂ اوّل صفحہ ۶۶

کے دین کی رسّی کو مضبوط پکڑ لو تو پھر تم سلف کی طرح تمام دنیا کے مالک بن جاؤ"۔[1]

اچھے اخلاق حاصل کرنے کی تلقین اس طرح کرتے:

"صاحبو! رحمتِ خدائے تعالیٰ وہ چیز ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے لوگوں نے سلطنتیں چھوڑی ہیں، مال و دولت تو کیا چیز ہیں۔ ایک حُسنِ خلق کا پیدا ہو جانا بندگانِ خدا کے نزدیک دنیا اور ما فیہا سے بھی زیادہ قیمتی ہے"۔

غرض ان کا ہر وعظ جو مطبوعہ شکل میں اب موجود ہے مطالعہ کیا جائے تو اکثر ان کا موضوع سماجیات سے بے حد قریب نظر آتا ہے۔ صرف عبادات ہی پر توجہ نہیں دلاتے تھے بلکہ انسانی زندگی کے ان معاملات اور حالات کے سدھار کی صورتیں بھی شریعت کی روشنی میں پیش کرتے۔ جن کا تعلق روزانہ کی زندگی اور معاشرت سے ہوتا۔ فقہ، قرآن و حدیث کے ذریعہ زندگی کے ہر گوشہ میں روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے تاکہ تربیت اور اصلاح صحیح عقائدِ دین اور سنّت کے مطابق اعمال کو زندہ کرنے کی بنیادوں پر ہو۔ کیونکہ ان کے سامنے اس دور کے حالات اور بگڑتی ہوئی، مٹتی ہوئی اسلامی فضا کا منظر تھا۔ امام غزالی رح اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم تھے۔ انھوں نے اپنے دور میں ان خطرات کو محسوس کرتے ہوئے، شریعت، طریقت، تصوف، فقہ، اخلاق اور قانون میں وسط او راعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی۔

امام غزالی رح کے مسلک کے امام شاہ ولی اللہؒ گذرے۔ اور شاہ ولی اللہ رح کے بعد بیسویں صدی میں اسی قسم کے اصول اور مقاصد کو عملی کردار کے ساتھ حکیم الامت مولانا تھانوی رح نے پیش کیا۔

امام غزالی رح کی "احیاء العلوم"، شاہ ولی اللہ رح کی "حجۃ اللہ البالغۃ"، مولانا تھانوی رح کی "التکشف عن مہمات التصوف"[2] سے ان کے مواعظ تک ایک ہی سلسلہ ہے جو ایک ہی انداز

[1] مآثر حکیم الامت صفحہ ۱۲۶

[2] سیرت اشرف ۶۶۰

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے نظریات اور تقریباً ایک ہی مقاصد کی روشنی میں کارفرما نظر آتے ہیں۔

مولانا رح کا معمول تھا اشاعت سے قبل اپنے ہر وعظ پر نظرِ ثانی کرتے کیوں کہ قلم بند کرنے میں کسی کمی یا زیادتی کا امکان ہو سکتا تھا۔ ان کی تصانیف اور مواعظ تعارف سے زیادہ براہِ راست مطالعہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ خصوصاً ان کے لیے جن کو شریعت اور طریقت کے علم کے حاصل کرنے قرآنِ کریم اور حدیث کے تفصیلی مطالعہ کا موقع نہیں ملتا اور جو تاریخِ اسلام اور سلف کے واقعات سے ناواقف ہیں۔ مفسرین، محدثین، فقہاء، صوفیاء کون ہیں؟ اور ان کی خصوصیات کیا ہیں؟ مذاہب کے اختلاف کے کیا معنی ہیں، فلسفہ اسلام کیا ہے، نفس و شیطان کس طرح انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، مسلمانوں کی سیاست اور حکومت کا کیا انداز ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے تجارت اور سیاحت میں کس طرح حصّہ لیا، علوم و فنون میں کن ایجادات کا اضافہ کیا، مسلمانوں کی تعلیم گاہیں اور خانقاہیں کس طرح مسلمانوں کے لیے رشد و ہدایات کا مرکز بنیں، مسلمانوں کی خانگی زندگی، قرابت و رشتہ داری کے کیا حقوق ہیں؟ اس قسم کی تمام عالم گیر اور ہمہ گیر معلومات ان کے مواعظ اور تصانیف سے حاصل ہوتی ہیں۔ صاحبِ "نزہتہ الخواطر" نے مولانا رح کی علمیت کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

"وقد كان من كبار العلماء الربانيين الذين نفع الله بمواعظهم
وملفوظاتهم وحق بلغ عدد مجالس وعظه التي دونت في الرسائل
وفي المجامع اربع مائة مجلس وقد كان نفع كتبه ومجالس
وعظه عظيماً في اصلاح العقيدة والعمل واستفاد عنها الوف
من المسلمين ورفض عدد لا يحصيه الا الله العادات والتقاليد
الجاهلية في الرسوم والبدع اللتي دخلت في حياة المسلمين
في بيوتهم واقراحهم واحزانهم بسبب اختلاط الطويلة
وبالكفار واهل البدعة والاهواء وقد كان له فضل كبير
في تيسير الطريق وتقريبها وتنقيه الغايات عن الوسائل

والللباب عن الحشو والزوائد ؎۱

اس طرح سے مولانا کی علمی دینی خدمات کی روشنی میں تصانیف و مواعظ کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف علماء نے بھی کیا ہے۔

مولانا رح کے چند مواعظ کا جائزہ

وعظ حقوق المعاشرت

مولانا نے یہ وعظ تھانہ بھون کی جامع مسجد میں ۱۳۲۹ھ ۸ ربیع الاول کو بیان کیا۔[۲] اس وعظ میں مولانا رح نے حق اللہ کے علاوہ حقوق العباد کے سلسلہ میں روشنی ڈالی ہے۔ کیونکہ حق العباد کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے۔ ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ نشست و برخاست لین دین کے معاملات جاری رہتے ہیں۔ اس لیے شریعت نے ان مسائل پر خصوصی توجہ کرائی ہے۔

مولانا رح نے اس وعظ سے قبل ایک وعظ کا حوالہ دیا جس میں انھوں نے مسلمان پر مسلمان کے کچھ حقوق بتائے۔ جو موجودگی اور عدم موجودگی میں مختلف طریقے سے واجب ہوتے ہیں۔ مثلاً موجودگی میں بیمار کی عیادت سلام کا جواب وغیرہ۔ عدم موجودگی میں غیبت نہ کرنا کوئی کرے تو اس کو روکنا۔ ان سب کے آداب اور طریقے اس وعظ میں وضاحت اور تفصیل سے پیش کیے اور بتایا کہ معاشرت و اخلاق کی حدیں مقرر ہیں ان میں کمی یا زیادتی کرنا بندوں کی تکلیف اور خدا کی ناراضگی کا سبب ہوتا ہے اور افراط و تفریط سے روکتے ہوئے قرآن کریم کی آیت لا تغلوا فی دینکم الخ اور مثال دی کہ حکیم و ڈاکٹر کے نسخے سے تجویز کردہ دوا صحیح وقت اور صحیح مقدار میں نہ دی جائے تو نقصان کا سبب بن جاتی

۱؎ نزہتہ الخواطر جلد ۸ صفحہ ۵۸، مطبع مجلس دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد دکن تاریخ طباعت سنہ ۱۳۹۰ھ

۲؎ وعظ ششم رسالہ دعوات عبدیت جلد اول صفحہ ۶، مطبع مقبول المطابع ہردوئی۔

حقوق کی اس اہمیت کو قرآن و حدیث کی روشنی میں بتاتے ہوئے ایفائے وعدہ اور سلام کرنے کی اہمیت کے مواقع کی طرف بھی اشارہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ ادب بھی وہی اچھا ہے جس میں بزرگوں کی راحت و خوشی ملحوظ ہو، ورنہ تکلیف کا سبب بن جاتا ہے۔

دعوت میں جانے کے آداب بھی بیان کئے اور اس عام رواج کی مذمت کی جس میں دعوتوں میں مدعوین کے علاوہ دوسروں کو بھی لے جایا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ بھی سنایا۔

ایک ظریف شخص نے ایک دعوت میں اپنے بچھڑے کو بھی ساتھ لے لیا، یہ دیکھ کر کر لوگ دو ایک کو ساتھ ضرور لے جاتے ہیں۔ جب کھانا کھایا جانے لگا تو بچھڑے کے سامنے بھی ایک پلیٹ رکھوائی۔ لوگوں نے کہا یہ کیا حرکت ہے۔ اس نے کہا، بھئی لوگ اپنی اولاد کو لاتے ہیں، میرے کوئی اولاد نہیں اس کو لے آیا[۱]۔ ساتھ لانے والے شرمندہ ہو گئے

مولانا تھانوی رح احادیث، قرآنی آیات، تمثیلات اور حکایات سے اپنے مواعظ کو ایسے لطیف پیرایہ میں پیش کرتے جو شریعت کے اصولوں کو اخلاقی سدھار کے لیے مفید ثابت ہوتے۔

استخفاف المعاصی

یہ وعظ مولانا رح نے رام پور کے محلہ منھیاران میں ۱۳ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ میں ڈھائی گھنٹے تک بعد نماز عشاء مسلسل بیان کیا۔ مضمون کا موضوع تھا "گناہوں کو معمولی سمجھنے پر مذمت"۔ سب سے پہلے اس وعظ میں انھوں نے گناہ کی مذمت بیان کی خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ کیونکہ گناہ دراصل خدا کی نافرمانی کا نام ہے اور نافرمانی ناراضگی کا سبب بنتی ہے۔ اور خدا کی اطاعت سے انحراف سب سے بڑا گناہ ہے۔ دوسرے گناہ کو معمولی سمجھنا اور بھی مہلک ہے۔

---

۱ دعوات عبدیت جلد اوّل صفحہ ۸۴، وعظ ششم

کیونکہ معمولی سمجھ کر اس سے توبہ کا ارادہ ہی مشکل ہے اور چھوٹے گناہ کی عادت رفتہ رفتہ بڑے گناہوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کی مثال نقصان کے اعتبار سے مولانا رح نے آگ اور چنگاری سے دی یعنی گناہ صغیرہ اس چنگاری کی طرح ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ آگ کی شکل اختیار کر لے۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے گناہ عادت میں شامل ہو کر پوری روحانیت کو خاکستر کر دیتے ہیں[۱]۔ دوسری مثال مولانا رح نے یہ دی کہ جب چھوٹے گناہوں سے اجتناب نہیں کیا جاتا تو رفتہ رفتہ کبیرہ گناہ بھی ہونے لگتے ہیں۔ جس طرح صاف کپڑے کو بارش میں کیچڑ سے بچایا جاتا ہے اور جب بہت سے چھینٹے پڑ جاتے ہیں تو پھر دامن کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ کپڑا بالکل خراب ہو جاتا ہے۔

اس طرح مولانا رح نے حکیمانہ طرز بیان اور قرآن و حدیث کے حوالوں سے گناہوں کی مذمت اور ان کو ہلکا سمجھنے پر تنبیہ کی تاکہ گناہوں سے بچ کر اطاعتِ خداوندی کی جائے۔

ذکر الرسول[۲]

مولانا رح نے یہ وعظ جامع مسجد کانپور میں ۱۰ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ یوم جمعہ پانچ سو سامعین کے مجمع میں بیان کیا۔ اس وعظ میں مولانا رح نے قرآن کریم کی آیت قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا الخ کی تفسیر کرتے ہوئے حضورؐ کے حقوق کی وضاحت کی جو اہلِ ایمان پر عائد ہوتے ہیں۔ مولانا رح نے پہلے تو یہ واضح کیا کہ ذکر الرسولؐ ایسی بابرکت چیز ہے کہ اس سے منع کرنے یا روکنے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ روکا ان کو قیود و تحقیقات سے جاتا ہے جنھیں بغیر شارع علیہ السلام کے بتائے ہوئے لوگوں نے خود عائد کر لیا ہے اور ان کے ساتھ لازمی اور ضروری امور کا سا برتاؤ شروع کر دیا ہے۔ جہاں تک حضورؐ کے حقوق کا معاملہ ہے

---

۱ دعوات عبدیت وعظ پنجم صفحہ ۸۷، وصفحہ ۶۸

۲ سلسلۂ تبلیغ کا پہلا وعظ صفحہ ۲، مطبع کتب خانہ اشرفیہ دہلی۔

مولانا نے یہ بتایا کہ سب سے پہلے حق حضورؐ کا یہ ہے کہ آپؐ سے محبت کی جائے اور جب تک حضورؐ کی محبت ساری محبتوں پر غالب نہیں ہوتی صحیح طور پر ایمان کا حصول نہیں ہوتا لیکن محبت کے علاوہ دوسرے حقوق بھی حضورؐ کے ہیں جن کی ادائگی بھی اشد ضروری ہے ۔ یہ باقی حقوق تین ہیں ۔ عظمت[۱]، اطاعت[۲]، متابعت[۳]۔ عظمت سے یہ مُراد ہے کہ بحیثیت رسولؐ کے آپؐ کو بڑا مانیں ، اور اطاعت یہ ہے کہ آپؐ کے دیے ہوئے احکام کو قبول کریں اور عمل میں لائیں ۔ اتباع کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی پیروی کریں ، جس راہ پر آپؐ چلے اُسی پر چلیں ، یہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جو آپؐ سے محبت کا لازمی تقاضہ ہے اور براہِ راست نتیجہ ہیں ۔ اگر صرف محبت ہے اور عظمت اور اطاعت اور متابعت نہیں تو ایسی محبت ناقص ہے ۔ اور اگر فقط عظمت ہے محبت یا اطاعت نہیں تو بے کار ہے ۔ ایسی صورت میں انسان بحیثیت رسولؐ آپؐ کا قائل نہیں ہو گا ۔ اور اطاعت بغیر عظمت اور محبت کے ایک بے روح جسم ہے ، مولانا نے واضح کیا جو شخص ان حقوق میں سے کسی ایک کی ادائگی میں کوتاہی کرتا ہے وہ کامل حق ادا کرنے والا نہیں کہا جا سکتا ۔ مولانا نے یہ بھی بتایا کہ محبتِ رسولؐ عظمت اور اطاعت و متابعت کی تحصیل کا سب سے بڑا ذریعہ ہے ۔ ساتھ ہی مولانا نے یہ بھی بتایا کہ حضورؐ کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ بغیر کسی پابندی کے آپؐ کا زیادہ سے زیادہ ذکر کریں ، اور اس کی بہترین شکل حضورؐ پر کثرت سے درود ہے جو حضورؐ پر احسان نہیں بلکہ ہمارے منافع کا ذریعہ ہے ۔

الکمال فی الدین للنساء[۱]

۱۳۵۰ھ

مولانا اشرف علی تھانوی رحؒ نے یہ وعظ دہلی میں بر مکان رفیع صاحب ۲۷ ذی الحجہ بروز شنبہ ڈھائی گھنٹہ بیٹھ کر مستورات کی درخواست پر بیان کیا ۔ موضوع عورتوں کے لیے کمالِ دین حاصل کرنے کا طریقہ اور کاملین کی محبت کے حصول کے طرق کی

۱؎ التبلیغ کا چودھواں وعظ رسالہ الایقار بابت ماہ جمادی الاخر ۱۳۵۰ھ صفحہ ۱ تا صفحہ ۶۰

رہنمائی تھا ۔ کلام پاک آپ نے اس آیت سے شروع کیا یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین ۔ تمہید میں حضرت نے عورتوں کی اصلاح کی شدید ضرورت پر توجہ دلائی ، کیوں کہ تربیتِ اطفال کا پہلا گہوارہ ماں ہوتی ہے ۔ اس تربیت کی ابتدا کی بنیاد عورت ہی ہوتی ہے ۔

حکیم الامت رحؒ نے اس وعظ میں اس وہم کو بھی دور کیا ہے کہ قرآن میں کثرت سے مردوں سے خطاب کا مطلب عورتوں سے بے اعتنائی نہیں نکلتا ۔ ان شبہات کا ازالہ کیا اور بتایا کہ احکامات میں مرد و عورتیں حصولِ اجر میں یکساں ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کا خمیر ہونے کی وجہ سے جدا جدا خطاب کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ اور صیغہ کو خاص کرنے کی وجہ خلقت کے اعتبار سے ہے ۔ کیوں کہ مرد جسمانی و دماغی اعتبار سے عورتوں سے زیادہ قوی بنائے گئے ہیں اس لیے محنت کے تمام کام زیادہ تر مرد سے متعلق ہیں ۔ ان ہی معاملات کی وجہ سے مرد عورتوں کے حاکم قرار دیے گئے ہیں ۔ لہٰذا خطاب میں بھی مردوں ہی کو ترجیح دی گئی ہے ۔

اس وعظ میں مولانا نے عورتوں کی خاص کمزوری ناشکری کو بہت عجیب پیرایہ میں بیان فرمایا اور چند مثالوں کے ساتھ ان کے اسباب کی طرف خصوصیت سے اشارہ فرمایا ، مثلاً حرص کا مادہ ، اپنی حیثیت سے بڑھی ہوئی عورتوں سے میل جول ، روحانیت کی مجروح عورتوں سے اختلاط ، کیوں کہ روحانیت امراض متعدی ہوتے ہیں ۔

ناشکری کا واحد علاج حدیث کی روشنی میں یہ بتایا کہ اپنے سے کم حیثیت کی عورتوں کے حالات پر غور کیا جائے ، تاکہ حقیقتِ شکر پیدا ہو ، برخلاف اس کے کہ دین کے معاملہ میں اپنوں سے زیادہ دین دار پر نظر کی جائے تاکہ عمل میں اضافہ ہو ۔ اس مضمون کو مثالوں ، واقعات اور احادیث کے ذریعے اس خوش اسلوبی سے بیان فرمایا کہ امراض کا قبیح ہونا اور علاج کا آسان ہونا قلب و نظر میں جاگزیں ہو جائے ۔ حکیم الامت نے اس آیت شریفہ کی روشنی میں ثابت فرمایا کہ درجہ کمال دین میں عورتوں کو بھی حاصل ہو سکتا ہے اگرچہ مکتب ہی کیوں نہ ہو ۔ اس کے تین طریقے بتائے اوّل تو وہ مسائل اور احکام شرعیہ پر کتابوں

کے ذریعے عبور حاصل کریں؛ تاکہ عمل میں کمال حاصل کر سکیں۔

دوئم یہ کہ اگر کوئی کامل مرد محارم میں مل جائے تو اس کی صحبت سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی اصلاح کے طریقے معلوم کریں۔ اگرچہ مرد کامل میسّر نہ ہو تو کسی کاملہ کی طرف رجوع کریں۔ آخری درجہ میں کسی غیر محرم بزرگ سے تعلق قائم کرلیں تاکہ خط و کتابت کے ذریعہ اصلاح کراتی رہیں اور بزرگوں کے قصّے اور ملفوظات کو مطالعہ میں رکھیں۔

شرائط الطاعۃ[1]

حضرت حکیم الامتؒ نے یہ وعظ جامع مسجد کیرانہ، ضلع مظفر نگر میں شب پنجشنبہ ۱۳۴۸ھ ۶ ر شوال کو ڈیڑھ گھنٹے تک بیان کیا جس کو حضرت کے خلیفہ خاص خواجہ عزیز الحسنؒ نے محفوظ کیا۔ یہ وعظ خطبہ ماثورہ کے بعد اس حدیث سے شروع کیا۔ "لیس من البر الصیام فی السفر" اس وعظ کا مقصد ہر عبادت بلکہ احکام شرعیہ کو افراط و تفریط سے محفوظ کرنا ہے۔ اصل مقصد عبادت نہیں رضامندی باری تعالیٰ ہے اور اس کا حصول احکام شرعیہ کو ان کے حدود میں قائم رکھنے سے ہوتا ہے۔

اسی مضمون کو صفحہ ۲۸ میں اس طرح ظاہر فرماتے ہیں:

"کہ جب کوئی کام کرو تو جی میں یہ ٹھان لو فلانہ مطلب جس طرح بن پڑے حاصل ہو جائے بلکہ مطمح نظر رضائے حق رکھو[2] اور یہ قصد رکھو کہ رضائے حق حاصل ہو جانا چاہئے کامیاب ہوں یا نہ ہوں۔"

حدیث بالا کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت نے دو شبہوں کا اس طرح ازالہ فرمایا ہے:

"نہ تو جاہلوں کی طرح ہر سفر کو افطار صوم سمجھو اور نہ بعض عالموں کی طرح سفر شرعی میں افطار واجب سمجھو، سفر غیر شرعی جو ۴۸ میل سے کم

[1] سلسلۃ التبلیغ وعظ ۱۳۹ رسالہ البلاغ صفحہ ۲ تا صفحہ ۳۱

[2] 〃 〃 〃 〃 صفحہ ۲۸

کم ہو اس میں روزہ رکھنا واجب ہے اور سفر شرعی جو ۴۸ میل ہو اس میں افطار جائز ہے۔"

پھر حدیث کی حضرت نے وضاحت مزید فرمائی۔ ادھر حضرت نے عابدوں کی عبادت کے غلو پر نکیر فرمائی۔ حضرت اس طرح فرماتے ہیں:

"بس یہ دیکھ لیا کہ یہ دین کا کام ہے، پھر یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ حدود کے اندر ہے یا نہیں، حالانکہ شریعت میں جہاں تک حدود کی حفاظت ہے جیسا کہ میں ابھی بیان کر رہا تھا کہ فلاں فلاں وقت میں نماز پڑھنا جائز نہیں، فلاں فلاں وقت میں روزہ جائز نہیں، یہاں خیر حرمت ہے، بعض جگہ حرمت تو نہیں کراہت ہے۔ دیکھیے نماز کیسی اچھی چیز ہے، لیکن ایک صحابیؓ کو حضورؐ نے کثرت نماز پر حقوق العباد کو ختم کردے اس طرح فرمایا "تم پر تمھاری جان کا بھی حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی حق ہے، تمھارے مہمان کا بھی حق ہے، اس طرح رہو کہ ذی حق کا حق فوت نہ ہو، اس طرح رہو کہ بیمار نہ پڑ جاؤ" الخ۔

حضرت حکیم الامت نے عبادات میں بھی حدودِ شرعیہ کے اہتمام کی بہت تاکید فرمائی ورنہ اکثر بدعات بزنگِ عبادت ہی ہوتی ہیں۔ دین میں افراط اور تفریط دونوں کو ہوائے نفس فرمایا۔

ہوائے نفس کا علاج حکیم الامتؒ نے صحبتِ شیخ تجویز کیا اور کہا کہ:

ہیچ چیز نشکند اندر جہاں　　اے ہواؤ خیر کہ سایہ ہمرہاں[1]

اور آخر میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس شعر کو پیش فرما کر حقیقت کو اور اجاگر فرمادیا ؎

نفس نتواں کشت الا ظل پیر
دامن ان نفس کش را سخت گیر[1]

[1] صفحہ ۳۰ وعظ شرائط الطاعہ رسالہ التبلیغ بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ

چند تصانیف کا جائزہ

حیات المسلمین [1]

یہ کتاب مولاناؒ کی اہم کتابوں میں سے ایک ہے، اس کے لکھنے کی وجہ خود مولاناؒ کے الفاظ میں یہ ہے:

”چند دنوں سے مسلمانوں کی بدحالی سے مجھے سخت قلق ہوا جس نے بیقرار اور لاغر کردیا، پس لطفِ الٰہی نے میرا ساتھ پکڑا اور ۲۰ رجمادی الاول ۱۳۴۶ھ کو نمازِ فجر میں میرے دل میں اللہ نے ڈالا، بعض اعمال کو بعض مصیبتوں کے جن کے برداشت کی لوگوں میں طاقت نہیں ہے، دور کرنے میں خاص دخل ہے۔ ان میں سے بعض اعمال سے تو جہل رفع ہوتا ہے اور بعض سے افلاس، اور بعض سے تشویش و پریشانی۔ اور یہی تینوں جہل، افلاس و تشویش ہی تمام بلاؤں کی جڑ ہیں۔ پس ان تینوں کی اصلاح سے اور تمام باتوں کی بھی اصلاح ہو جائے گی اور یہ بات بھی من جانب اللہ اسی وقت میرے دل میں آئی کہ ان اعمال میں سے کچھ لکھو اور مسلمانوں کو پہنچاؤ اور دخل کی وجہ لکھنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ عام لوگوں کے لیے نافع اور مقصود مسائل ہیں نہ کہ ان کی دلیلیں، خدا نے مجھے امید دلائی کہ اس سے یہ بلا ٹل جائے گی اور لوگوں کو نفع ہوگا پس خدا سے نفع کی امید کر کے میں نے اس کو شروع کر دیا اور وہی بلند کرنے اور پست کرنے والا ہے۔“ [2]

---

[1] تالیفات اشرفیہ صفحہ ۲۹

[2] حیات المسلمین صفحہ ۸ و صفحہ ۹، حاشیہ۔

مولانا رحؒ کے اس اقتباس سے یہ بات واضح ہے کہ آپ نے مسلمانوں کی تمام آفتوں کا سبب اُن کے جہل، افلاس اور تشویش کو قرار دیا ہے، اور اس کتاب میں تدبیریں بنائی ہیں جس سے ان تینوں کی جڑ کٹ سکے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں یہ بات واضح کی ہے کہ زندگی چاہے دنیوی ہو یا اخروی دونوں کی اصلاح کا دارومدار بلکہ انسانی زندگی کو جو روگ بھی ان دونوں میں لگ سکتے ہیں اس کا واحد علاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہے اور ہر شخص اس کا تجربہ اس طرح کر سکتا ہے کہ اگر وہ حضورؐ کی بتائی ہوئی اسلامی تعلیمات کو سامنے رکھ کر دنیا اور آخرت کے مسائل اور پریشانیوں کی تشخیص کو صحیح سمجھ کر اعتقاد رکھتے ہوئے ان کو دور کرنے کی تجویزوں پر جو آپؐ کی بتائی ہوئی ہیں عمل کرے تو اُسے ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہو جائے گا۔

مولانا رحؒ کا کہنا یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات سے مُنہ موڑنے کے نتیجہ میں مسلمانوں پر ساری دنیوی اور اُخروی بلائیں نازل ہو رہی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان و عقیدت رکھنے والے دنیوی زندگی کے بارے میں آپؐ کی تعلیمات سے تغافل برتتے ہیں تو تنبیہ کے طور پر خدا انھیں دنیا کی کامیابی سے محروم کر دیتا ہے، تاکہ راہِ راست پر آجائیں، اور جو لوگ حضورؐ کا انکار کرتے ہیں ان کی آخرت کا برباد ہونا تو ظاہر ہے لیکن دنیا میں بطور ڈھیل کے انھیں ظاہری کامیابی عطا کر دی جاتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ دنیا کی کامیابی بھی صرف بظاہر نظر آتی ہے حقیقی کامیابی انھیں دنیا میں بھی نصیب نہیں ہوتی، کیونکہ زندگی کی راحت اور حلاوت اور دل کا سکون اطمینان و چین یہاں بھی نصیب نہیں ہوتا۔ [1]

مولانا رحؒ کا یہ کہنا ہے کہ جس طرح ظاہری دوائیں مختلف صورتوں میں عمل کرتی ہیں اور مرض کو دور کرتی ہیں۔ اسی طرح انسان کے اعمال بھی اپنی خاصیت کے اعتبار سے مختلف تاثیرات رکھتے ہیں اور مختلف طریقوں سے اثر کرتے ہیں۔ [2]

---

[1] حیات المسلمین، دیباچہ صفحہ ۴، صفحہ ۸ تا صفحہ ۱۰

[2] ایضاً 〃 〃 صفحہ ۱۱

toobaa-elibrary.blogspot.com

مولانا رح نے اس کتاب میں ایسے انسانی اعمال کو جمع کیا ہے جو ظاہری یعنی جسمانی عمل ہو یا قلبی، لیکن مولانا کی رائے میں جہل، افلاس اور پریشانی کو دور کر سکتے ہیں اس لیے اس کتاب کا نام "حیات المسلمین" رکھا۔

جس طرح انسانی جسم قائم رکھنے کے لیے مختلف روحوں کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی روح الٰہی، روح حیوانی، روح نفسانی، روح طبی، اسی طرح مختلف تدبیروں کو مختلف روحوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جس سے مسلمانوں کی زندگی کا قیام ہو سکے۔ اس کتاب میں ایسے اہم عقائد اور اعمال پر گفتگو ہے جیسے ایمان و اسلام، علم دین، تلاوتِ قرآن، خدا اور رسول صلعم سے تعلق، تقدیر، عمل، توکل، دعا، صالحین کی صحبت، سیرتِ نبوی، مسلمانوں کے حقوق کی ادائیگی، اپنے نفس کے حقوق کی ادائیگی، نماز کی پابندی، مسجد کی تعمیر، ذکر الٰہی، زکوٰۃ، صدقات، روزہ حج، قربانی، آمدنی اور خرچ کا انتظام، نکاح، افزائش نسل، دنیا سے دل نہ لگانا، گناہوں سے بچنا، صبر و شکر سے کام لینا، مشورہ کرنا، باہم محبت ہمدردی و اخلاق سے پیش آنا، اپنے ملی اور اسلامی امتیاز کو برقرار رکھنا۔

مولانا رح نے ان تمام مضامین کو قرآن و حدیث سے مدلل کیا ہے۔ مولانا کی فن حدیث پر کتنی نظر ہے اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے۔ حدیث کے ایسے الفاظ جو ممکن شبہات پیدا کر سکتے ہیں ان کو قوسین کے الفاظ کے ذریعہ رفع کر دیا ہے۔ ان بین القوسین تشریحات کی قدر وہی کر سکتا ہے جس نے احادیث اور ان کی بڑی شرحوں کا مطالعہ کیا ہے کہ کس طرح مولانا رح کم سے کم الفاظ کے ذریعہ اس کی ایسی بے غبار تشریح کر دیتے ہیں کہ کسی شک و شبہ یا اعتراض کی گنجائش نہیں رہ جاتی، خود مولانا کی نظر میں اپنی اس تصنیف کی بہت قدر تھی ان کا کہنا یہ تھا کہ اس کے ذریعہ مجھے نجات یعنی مغفرت کی توقع ہے۔[1]

اور واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک پوری زندگی کو اسلامی سانچوں میں ڈھالنے کا سوال ہے اس کتاب میں جمع کیا مواد درس کے لیے بہترین سانچے کی حیثیت

---

[1] تالیفات اشرفیہ صفحہ ۴

رکھتا ہے۔

الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ

یہ مولانا رح کی وہ تصنیف ہے جس میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی دین سے عدم واقفیت میں بہت سے شکوک و شبہات ان کے ذہن میں پیدا کر دیے تھے اور جدید نسل نے سائنس کی روز افزوں ترقی سے متاثر ہو کر اسلام کے بنیادی مسائل پر نکتہ زنی شروع کر دی تھی، لیکن ساتھ ساتھ طلبِ حق کا داعیہ بھی ان کے دلوں میں موجود تھا۔

مولانا رح نے اس طلبِ حق کا احساس کرتے ہوئے اس کتاب میں اس قسم کے شبہات رکھنے والوں کے ذہن کو صاف کرنے کی کوشش کی جس کا اظہار انھوں نے اپنی وجہ تالیف میں بھی کیا ہے۔[1]

حکیم الامت کی اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، جیسے تصنیف کی علت پر بنیادی حصے میں بحث کی ہے۔ دوسرے حصے میں قواعد کو جو اصول موضوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں پیش کیا ہے جس کے نہ جاننے کی وجہ سے تعلیم یافتہ نسل غلط مبحث میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

تیسرا حصہ وہ انتباہات ہیں جن میں ان شبہات کو دور کیا ہے جنھوں نے مستشرقین اسلام کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا رح نے اس تصنیف میں علومِ ثلاثہ میں علمِ کلام جس کا تعلق براہِ راست قرآن و حدیث بذریعہ مخبر صادق ہے اس کی عظمت کو اور علم لاریب ہونے کو فلاسفہ کی دلیلوں سے، جن کا دار و مدار محض عقل پر ہے، لیکن بلند و بالا اور ہر طرح مستحکم ثابت کر دیا ہے۔

اور سائنس جو مشاہدات کا جز اعظم ہے اور استقرار اس کی بنیاد ہے اس کی

---

[1] الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات المفیدہ ص۵

ظاہری چمک کو مٹا کر رکھ دیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان باریک اور ادق مسائل کو مولانا تھانوی رح نے دورِ حاضر کی مثالوں سے اس طرح مشرح کر دیا ہے کہ عام لوگوں کے لیے بھی ان اہم مسائل کا استفادہ اس کتاب سے بسہولت ہو سکتا ہے۔ خلطِ مبحث کے سلسلہ میں مولانا نے جو تشریح فرمائی مع امثلہ وہ اہم ہے اور حقیقت یہی ہے کہ سارے شبہات کی جڑ یہی غلطی ہے۔ مثال کے طور پر محال اور استبعاد کی عدم تفریق سے بہت سے غلط نتائج ظاہر ہوتے ہیں لہ جس کی مولانا رح نے چند مثالوں سے وضاحت کی ہے۔

اس طرح مختلف موضوعات پر مولانا نے شبہات کو دور کرنے میں اپنی بسیط علمیت اور دقیق نگاہ سے ذہن صاف کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نمبروں کی ترتیب کے اعتبار سے ان کے طرزِ تصنیف کی تعریف عبدالباری ندوی نے اس طرح کی ہے:

"یہ طرزِ تصنیف بھی بتلاتا ہے کہ حضرت کے ذہن کی طبعی ساخت وافتاد منطقی تھی۔ راقم ہٰذا کے علم میں یورپ کے ایک مشہور فلسفی "اسپنوزا" کے علاوہ اور کسی نے اپنی کسی تصنیف میں یہ اقلیدسی، یا ہندسی طرز اختیار نہیں کیا۔" لہ۲

ان تمام مجموعی خصوصیات کے لحاظ سے مولانا تھانوی رح کی یہ تصنیف ہمیشہ ذہنوں کو اسلام کے خلاف شکوک وشبہات سے محفوظ رکھے گی۔

بہشتی زیور

مولانا اشرف علی تھانوی رح کی یہ مشہور و معروف تصنیف عوام و خواص، مرد و عورت ہر طبقہ میں مقبول اور مفید ثابت ہوئی، اور خاص طور پر ہندوستان میں ان کی حنفی

لہ الانتباہات المفیدہ صفحہ ۱۷، ۱۸

لہ۲ تجدیدِ دینِ کامل صفحہ ۱۱۷

مسالک کی اس فقیہانہ تصنیف کو امتیاز حاصل ہوا۔ اسی بنا پر اس کی اشاعت وطباعت کا سلسلہ لاکھوں کی تعداد میں بہنچا۔ مختلف زبانوں میں تراجم ہوئے۔ مثلاً سندھی، ہندی، بنگالی، پشتو، فرنچ وغیرہ میں۔ اور اکثر جگہ عام فہم فقہی مسائل سے لوگوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ جیسے لین، دین، شادی، طلاق، پاکی، ناپاکی۔ بہر حال مذہبی ومعاشرتی تمام مسائل اور خصوصاً عورتوں سے متعلق اسلامی زندگی کے تمام مسائل کا احاطہ کیا گیا۔

عقائد، اعمال، اخلاق جیسے دین کے اہم مسائل کو اسلامی اصولوں کی صحیح روشنی میں پیش کیا ہے۔ مختصر یہ کہ دینی اور دنیوی دونوں قسم کی ضرورتوں کے پیشِ نظر اس میں تمام مسائل مل جاتے ہیں۔

بہشتی زیور دس حصوں پر مشتمل ہے جس کی تکمیل ان دس حصوں پر ہو جاتی ہے۔ البتہ بہشتی گوہر کے نام سے گیارہویں حصہ کا اضافہ کیا ہے جس میں زیادہ تر مردوں سے متعلق مسائل ہیں۔

مولانا تھانوی رح کے دیگر تصانیفی کارناموں میں بہشتی زیور بھی ان کا ایسا کارنامہ ہے جو عورتوں کے لیے فقہی، اخلاقی، معاشرتی تعلیمی معلومات کا آسان اندازِ بیان میں عظیم شاہکار ہے۔

اصلاح الرسوم لہ

اس تصنیف کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مولانا رح نے خاص مقصد اصلاحِ امت کی کوشش کی ہے۔ یعنی ان رسومات وبدعات کو ختم کرنے کے لیے یہ خدمت انجام دی جو مسلمانوں کی اکثر زندگی میں مذہبی تقاضوں کے تحت اس طرح شامل ہو گئے تھے کہ شرعی اصل نہ ہوتے ہوئے بھی کارِ ثواب اور فرض کے درجے میں کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے اور جن سے دینی اور دنیوی دونوں نقصانات ہوتے ہیں جس کا انھوں نے اس کتاب کے دیباچہ میں

لہ تالیفات اشرفیہ صفحہ ۲۳

آپ نے ان الفاظ میں اظہار کیا ہے۔

"مسلمانوں کو دیکھا جاتا ہے کہ اپنے رسوم اختراعیہ کے اس قدر پابند ہیں کہ فرض واجب کے قضا ہو جانے کا غم نہ ہو مگر ان رسوم میں رائی برابر بھی کم نہ ہو۔" [1]

یہ ایک سو اٹھاون صفحات پر تین ابواب میں مشتمل ہے۔

اس تصنیف کے پہلے باب میں ان رسومات کا ذکر ہے جن کو کرنے والے گناہ سمجھتے ہوئے بھی کرتے ہیں اور یہ گناہ علی الاعلان ہوتے ہیں اور وبائی امراض کی طرح پھیلتے ہیں۔ مثلاً ناچ، گانے، آتش بازی وغیرہ۔ جو دورِ حاضر کا ایک خاص شعار بن گیا ہے۔

دوسرے باب میں مولانا رحؒ نے ان رسومات کا ذکر کیا ہے جن کو لوگ مباح سمجھ کر کرتے ہیں۔ اور ان رسموں کا تعلق پیدائش سے موت تک اس طرح جاری ہوتا ہے کہ اکثر تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً چھٹی، منگنی وغیرہ کا ذکر ہے۔

اس قسم کی رسومات کے بارے میں مولانا رحؒ نے لکھا ہے:

"لوگوں کا خیال یہ ہے اس میں گناہ کی کونسی بات ہے، کچھ ناچ نہیں، رنگ نہیں، پھر اس میں شرع کے خلاف ہی کیا چیز ہے جس کے لیے روکا جائے۔" [2]

مولاناؒ نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے:

"حضرات! اس غلط گمان کی وجہ صرف یہ ہے کہ رواج عام نے قوت نظریہ کو ضعیف کر دیا ہے۔ چند امور جو ظاہراً مباح ہیں ان کو دیکھ لیا، اور جو ان کے اندر پنہائی اندرونی مفاسد اور خرابیاں ہیں وہاں تک نظر نہ

---

[1] اصلاح الرسوم صفحہ ۲

[2] ؍ ؍ صفحہ ۳۲

[3] ؍ ؍ صفحہ ۳۳

پہنچ سکی۔" [1]

اس کتاب کے تیسرے حصے میں مولانا رحؒ نے ان رسومات کا ذکر کیا ہے جن کو عبادت سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ مثلاً میلاد شریف وغیرہ۔

اس طرح مولانا نے تفصیل سے جائز و ناجائز حدود کا ذکر کرتے ہوئے رسومات کی قباحتوں کو پیش کیا ہے جو اصلاحِ امت کے لیے ایک انتہائی مؤثر اقدام ثابت ہوا۔

اُن کی اس تصنیف سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقت میں وہ حکیم الامت تھے اور ملت کی ہر خرابی کو دور کرنے کے لیے ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔

تفسیر بیان القرآن

مولانا اشرف علی تھانوی رحؒ کی جملہ تصانیف میں جن کی تعداد تقریباً ایک ہزار پہنچتی ہے جن میں چھوٹی بڑی تمام تصانیف آجاتی ہیں اس میں تفسیر بیان القرآن بارہ جلدوں پر مشتمل نہایت اہم اور امتیازی حیثیت کی حامل ایک عظیم تصنیف ہے جس کا شمار ہندوستان کی اُردو تفاسیر میں صفِ اول کی تفاسیر میں ہوتا ہے۔

تفسیر کے آغاز سے پہلے ایک خطبہ مولانا رحؒ نے لکھا ہے جس میں اس تفسیر کے لکھنے کی ضرورت کو اور وجوہات کو ظاہر کیا ہے۔

ترجمہ بینی کے عام مذاق کی وجہ سے بہت سے قرآن کے تراجم اور تفاسیر لکھے جانے لگے، لکھنے والوں کا مقصد تجارت بھی ہوتا تھا جس کی وجہ سے بہت سے مضامین خلاف قواعد شرعیہ بھی شامل ہوتے۔ ان مضرتوں کی روک تھام کی کوشش کے لیے مولانا نے متعلقات رسائل ترجمہ اصلاح دہلویہ، وغیرہ نام سے تحریر کیے مگر وہ ناکافی رہے۔ ان وجوہات کے علاوہ دوسری ضرورتوں کے تحت بھی مولانا نے یہ تفسیر لکھی جس کی خصوصیات کا اندازہ خود ان کے خطبہ میں ہوتا ہے۔

---

[1] اصلاح الرسوم صفحہ ۳۳

۱۔ آسان ترجمہ کیا، سمت لفظی کی رعایت رکھی۔

۲۔ ترجمے میں خالص محاورات استعمال نہیں کیے، فصاحت کے ساتھ سلاست کا خیال رکھا۔

۳۔ جس مضمون کو بہت ضروری دیکھا اس کی وضاحت کی جو ضروری بات ہوئی اس کو ف بنا کر بڑھا دیا۔

۴۔ جس آیت کی تفسیر میں بہت سے اقوال مفسرین کے ہیں ان میں جس کی ترجیح معلوم ہوئی صرف اس کو لے لیا بقیہ سے تعرض نہیں کیا۔

۵۔ قرآنی مطالب کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ مضمون کا ارتباط خود ظاہر ہو جائے اور کہیں اس کی ایک سرخی ربط کی لکھ کر اس کی تفسیر کر دی ہے۔

۶۔ اختلافیات کی تفسیر میں صرف مذہب حنفی لیا گیا ہے اور دوسرے مذاہب بشرط ضرورت حاشیے میں لکھ دیے گئے ہیں۔

۷۔ عوام کے ساتھ خواص کے افادہ کا بھی خیال کیا ہے، اس لیے ان کے لیے ایک حاشیہ بڑھایا ہے جس میں مدنی اور مکی سورتوں اور آیات و غیر مشہور لغات و ضروری وجوہ بلاغت متعلق ترکیب، خفی الاستنباط فقہیات، کلیات[1] و اسباب نزول و روایات و اختلافات، قرارت معبرہ، ترکیب یا حکم توجیہ، ترجمہ و تفسیر ایجاز کے ساتھ مذکور ہیں۔ یہ حاشیہ درس و تدریس کے وقت بہت کام آسکتا ہے۔ اس حاشیہ کی عربی عبارت اس لیے تجویز کی کہ عوام اس کو دیکھنے کی ہوس نہ کریں، ورنہ جب زبان سمجھتے اور مضامین نہ سمجھتے تو بہت پریشان ہوتے۔ اب امید ہے کہ یہ تفسیر مختصر یا ترجمہ مطول کہہ لیجیے عوام و خواص سب کے کام کا ہوگا۔[2]

اس طرح مولانا رح نے اپنی اس تفسیر میں علماء، طلباء، عوام خواص سب کا لحاظ کیا اور

۱۔ خطبہ تفسیر بیان القرآن صفحہ ۲

۲۔ ایضاً " "

غلط قسم کے تراجم کی گمراہی سے عوام الناس کو بچایا۔ مولانا تھانوی رح نے تفاسیر میں ایسا بیش بہا اضافہ کیا جس کے فائدوں کو نہ تو فراموش کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی نظر انداز۔

سید سلیمان ندوی رح نے اس کی خصوصیات پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

"کہ فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے، روایات صحیحہ اور اقوالات سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے، لغات اور نحوی ترکیبوں کی توضیح کی گئی ہے۔"[1]

"یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقتاً مفید ہے کہ تیرھویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے اس لیے تمام قدماء کی تصانیف کا خلاصہ ہے اور مختلف منتشر تحقیقات اس میں یکجا ملتی ہیں۔"[2]

اس تفسیر کی حقیقت اور صداقت کا احساس خود مولانا کے ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"یہ تفسیر میں نے کامل شرح صدر کے ساتھ لکھی ہے اس کی قدر تو ان لوگوں کو ہو گی جنھوں نے کم از کم بیس۲۰ معتبر تفسیروں کا مطالعہ کیا ہو۔ وہ دیکھیں گے وہ مقامات جہاں سخت اشکالات و اختلافات واقع ہوئے ہیں ان کا حل کیسی سہولت کے ساتھ قوسین کے اندر صرف چند الفاظ بڑھا دینے سے ہو گیا یہ اللہ تعالیٰ کا محض فضل ہے۔"[3]

یہ تفسیر اپنی اہمیت، خصوصیات اور مرتبے کے اعتبار سے اس کی مستحق ہے کہ اس کا مطالعہ اتنی گہرائی کے ساتھ کیا جائے کہ اس کی پوری حیثیت دیگر تفاسیر کے مقابلے میں واضح ہو کر سامنے آسکے۔

۱۔ سیرت اشرف صفحہ ۳۷۱

۲۔ ایضاً " "

۳۔ مآثر حکیم الامت صفحہ ۱۳۰، ۱۳۹

اُردو تفاسیر و تراجم کا مختصر خاکہ اور تفسیر بیان القرآن کا اجمالی تعارف

اُردو تفاسیر کی تاریخ پر بہت کم کتابیں ملتی ہیں لیکن جس حد تک میں معلومات فراہم کرسکی ہوں اُس کی روشنی میں ایک مختصر جائزہ پیش کر رہی ہوں۔

متفقہ طور پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح کو قرآن کے ترجمہ کا بانی مانا جاتا ہے لیکن اُن کا ترجمہ فارسی میں ہے۔ اُردو ترجمہ اُن کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر رح نے موضح القرآن کے نام سے کیا (۱۸۱۵ء، ۱۲۳۰ھ) تاریخیں "دائرۃ المعارف الاسلامیہ" صہ ۵۳۴ میں درج ہیں۔ لیکن موضح القرآن کے مقدمہ میں شاہ صاحبؒ اس کا نام موضح القرآن اور تاریخ تکمیل ۱۲۰۵ھ تحریر کرتے ہیں جیسا کہ اُن کی تحریر سے ظاہر ہے:

"اس کتاب کا نام "موضح قرآن" ہے، یہی اس کی صفت ہے اور یہی اس کی تاریخ ہے، ۱۲۰۵ھ، الٰہی وسیدی ومولائی تیری عنایت ہے اور تو ہی قبول کرا اپنے فضل سے، یا رؤف یا رحیم یا مالک الملک یا ذوالجلال والاکرام، اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" میں پناہ میں آیا اللہ کی شیطان مردود سے[1]"

---

[1] مقدمہ ترجمہ موضح القرآن، شاہ عبدالقادر دہلوی، مطبع احمدی دہلی، بحوالہ محاسن موضح القرآن مولانا اخلاق حسین قاسمی، صفحہ ۲۷

قاموس الکتب اردو جلد اوّل میں عبدالحق صاحب بابائے اُردو نے بھی اس کی تاریخ طباعت ۱۲۰۵ھ لکھی ہے۔

تراجم اور تفاسیر کی تحقیق کرنے والوں نے اُردو کا پہلا ترجمہ حکیم محمد شریف خاں کا تحریر کیا ہے اور اس کی تاریخ ۱۲۲۲ھ، ۱۸۰۷ء لکھی ہے۔

حامد حسن نے داستان تاریخ اُردو صفحہ ۶۴ میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن اُردو کے قدیم تراجم پر ڈاکٹر عبدالحق نے قرآن نمبر لاہور، مطبوعہ ۱۹۶۹ء صفحہ ۶۴۷ میں حکیم محمد شریف خاں کے ترجمے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں قرآن پاک کے کئی ترجمے ہوئے۔ شاہ عبدالقادر رح، شاہ رفیع الدین رح کے ترجمے بھی اُسی زمانے کے ہیں۔ ایک اور ترجمہ جو بادشاہ کے ایما سے ہوا وہ دلی کے نامور طبیب حکیم محمد شریف خاں مرحوم کا کیا ہوا ہے۔ یہ ترجمہ قلمی ہے لیکن افسوس کہ اختتام تفسیر کا دن اور تاریخ تو موجود ہے لیکن سن ندارد۔ حکیم صاحب کا انتقال جیسا کہ معلوم ہوا ۱۲۱۶ھ، ۱۸۰۱ء میں ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ترجمہ اس سے قبل کا ہوگا۔ حکیم صاحب اسے تفسیر کہتے ہیں لیکن درحقیقت ترجمہ ہے۔ البتہ موقعہ سے کہیں ایک آدھ لفظ صراحت کے لیے بڑھا دیا گیا ہے۔ اس کی زبان شاہ عبدالقادر مرحوم کے ترجمے کے مقابلہ میں زیادہ صاف ہے۔ لفظی پابندی میں اتنی سختی نہیں کی گئی ہے اور زبان کی ترکیب کا نسبتاً زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ نیز شاہ صاحبؒ کی طرح ہندی میں نہیں ہے[1]"

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ عالم کا دور جو ۱۷۵۹ء سے ۱۸۰۶ء تک پھیلا ہوا ہے۔ قرآن کریم کے تراجم کے لحاظ سے خاص اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس عہد کے کئی تراجم قرآن کا تذکرہ ملتا ہے۔

---

[1] قرآن نمبر، مطبوعہ لاہور صہ ۶۴۷

۳۔ اسی دور کا ایک اور ترجمہ عم پارے کا شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کا ملتا ہے۔ جس کی تاریخ ۱۱۸۴ھ، ۱۷۷۰ء ملتی ہے۔ اس ترجمے کو اُردو تراجم میں تاریخی ترتیب کے لحاظ سے اولیت کا شرف حاصل ہے۔ جس کے بارے میں جائزہ تراجم قرآنی کے مؤلف سیّد محبوب رضوی نے بھی لکھا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق بھی قرآن کا پہلا ترجمہ مراد اللہ انصاری کا مانا جاتا ہے۔

۴۔ اس کے علاوہ شاہ عالم کے عہد کے تراجم میں چراغ ابدی، ترجمہ پارہ عم عزیز اللہ بجرنگ اورنگ آبادی کا ملتا ہے جس کی تاریخ ۱۲۲۱ھ ہے۔

۵۔ ایک اور ترجمہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ڈاکٹر جان گل گرسٹ کی سرپرستی میں اور مولوی امانت اللہ میر بہادر علی حسنی، مولوی فضل علی، حافظ غوث علی وغیرہ کی رفاقت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ یہ حضرات علمار فورٹ ولیم کالج کے مترجمین میں تھے۔ یہ اس قلمی نسخے کے کاتب اور ناقل بھی ہیں۔ اس ترجمے کی قدامت کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ شاہ عبد القادر کے ترجمے کے تیرہ[۱۳] سال بعد شروع ہوا اور ایک سال میں مکمل ہوگیا۔ اس دور کا یہی ایک مکمل ترجمہ ہے جو آج بھی قلمی صورت میں موجود ہے اس کی اور شاہ صاحبؒ کی زبان کا موازنہ کیا جا سکتا ہے اور اس موازنہ کے نتیجہ میں شاہ صاحبؒ کی تنہا محنت اور مقبولیت کا اندازہ موجودہ دور کے محقق اور ناقدین کو خوب اچھی طرح ہوتا ہے۔ ان قدیم تراجم کے بعد درمیان میں اور بہت سے تراجم ملتے ہیں جن کا تذکرہ طوالت کے خوف سے چھوڑ دیا ہے۔ البتہ دور مولانا تھانوی رحہ سے قبل کی چند مشہور تفاسیر و تراجم کا مختصر ذکر اور کر رہی ہوں تاکہ ایک مختصر نقشہ سامنے آجائے۔

۶۔ سرسیّد کے ترجمہ و تفسیر کا دور بھی اس لیے اہم ہے کہ انھوں نے عیسائیوں کے مخالفانہ طرزِ بیان اور قرآنِ کریم کے مقابلہ میں اپنے مذہبی عقائد و رجحانات کی برتری پیش کرنے کے جواب میں ایسے ہی تفسیر و ترجمہ کی کوشش کی جو اس کا جواب اور ان کے غلط بیانات کی رد ہو سکے۔ ان کی تفسیر، تفسیر القرآن کی سات جلدیں سولہ[۱۶] پارے میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوئیں (۱۲۹۷ھ تا ۱۳۰۹ھ) سید نامر الدین محمد ابو المنصور

نے "تنقیح البیان" کے نام سے ۱۲۹۷ھ میں سرسیّد احمد خاں کی تفسیر کو تفسیر بالرائے قرار دیتے ہوئے اس کا رد نصرت المطابع دہلی سے شائع کیا۔ اسی طرح مراد آباد سے مطبع گلزار احمدی سے ۱۸۸۵ء میں محمد علی التحصیل بچھرانوی ضلع مراد آباد نے سرسیّد احمد خاں کی تفسیر کا رد "البرہان علی التحصیل من قال بغیر علم فی القرآن" کے نام سے کیا۔

۷۔ اس کے علاوہ تفسیر حقانی یا فتح المنان کے نام سے مولانا عبد الحق دہلوی حقانی نے تفسیر قرآن آٹھ جلدوں میں لکھی۔ اس کا مقدمہ بہت تفصیلی ہے۔ "البیان فی علوم القرآن" کے نام سے دلی پرنٹنگ پریس سے ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوا۔

۸۔ نواب صدیق حسن خاں بھی قرآن کی تفسیر لکھی، جو مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوئی۔

۹۔ مولانا ابو الکلام آزاد (غلام محی الدین) کی تفسیر القرآن کے نام سے دہلی، جید برقی پریس سے پہلی جلد ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی، جو سورۃ فاتحہ تا سورۃ انعام ہے، اور جلد دوم سورۃ الاعراف سے تا سورۃ مومنون تک مدینہ برقی پریس بجنور سے ۱۹۳۶ء میں طبع ہوئی۔

۱۰۔ تفسیر مواہب الرحمٰن سیّد امیر علی نے تیس[۳۰] جلدوں میں لکھی جو لکھنؤ نول کشور پریس سے ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔

۱۱۔ جامع التفاسیر کے نام سے نواب قطب الدین خاں نے بھی ایک تفسیر لکھی جو مطبع نظامی کانپور سے ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی۔

۱۲۔ سیّد ابو الاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن ۱۹۵۱ء مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور سے شائع ہونی شروع ہو کر چھ[۶] جلدوں میں مختلف پریس کے ذریعہ شائع ہو چکی ہے۔

۱۳۔ معارف القرآن کے نام سے مفتی شفیع نے تفسیر لکھنی شروع کی جس کا طرزِ بیان مولانا اشرف علی تھانوی رحہ کی تفسیر بیان القرآن کی روشنی میں اختیار کیا بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ تفسیر بیان القرآن کے طرز پر آسان زبان میں یہ تفسیر مفتی صاحب نے لکھی کیونکہ مفتی شفیع صاحب مولانا تھانوی رحہ کے خلیفہ تھے اس لیے ان کا رنگ ملتا ہے۔

غرض کہ ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی تفسیر و ترجمہ پر خاصا کام ہوا ہے۔ اس طرح مکمل اور نامکمل تراجم و تفاسیر کی تعداد کئی سو کے قریب ہوتی ہے جس سے اُردو تفاسیر پر خدمت کرنے والوں کی قرآنِ کریم سے دلچسپی و رغبت کا پتہ چلتا ہے اور یہ اطمینان ہوتا ہے کہ یہ بیش بہا ذخیرہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔ اب اس مختصر تذکرہ کے ساتھ ہی تفسیر بیان القرآن مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر کا ایک تعارف جو ایک ظاہری اور سرسری نظر میں ہو سکے پیش خدمت ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی حکیم الامتؒ کی 'تفسیر بیان القرآن' کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۲۶ھ میں تفسیر بیان القرآن کے نام سے شائع ہوا، اور دوسرا اڈیشن "مکمل بیان القرآن" کے نام سے ۲۰ر شوال المکرم ۱۳۵۳ھ میں شائع ہوا۔ اس کی وجہ مولانا نے خود تحریر فرمائی ہے کہ:

"اتنے طویل عرصہ کے بعد یعنی ستائیس سال کے بعد خود مولانا اور اُن کے احباب نے اس کا مطالعہ از اول تا آخر کیا۔ اس نظرِ ثانی کے نتیجہ میں بعض مقامات قابلِ ترمیم و اضافہ ہونے اور مطبوعہ سابق حواشی وغیرہ کی طرزِ تحریر میں بعض مقامات قابلِ ترمیم و اضافہ معلوم ہوئے اور مطبوعہ سابق میں حواشی وغیرہ کی طرزِ تحریر میں بعض مقامات کے خلاف ترمیم کر دی گئی تھی۔ جو مجھ کو ناپسند تھی۔ بنا بر علیہ یہ جی چاہتا تھا کہ یہ تفسیر مع ترمیم و اضافے اس طرز پر جس پر میں نے اصل مسودہ لکھا تھا طبع ہو جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری یہ تمنا بھی اس طرح پوری ہوئی کہ میرے برادر زادہ برخوردار مولوی شبیر علی سلمہٗ مالک اشرف المطابع تھانہ بھون نے اس طرح اس کی طباعت کا قصد کیا اور قابلِ ترمیم و اضافہ مقامات میں ترمیم و اضافہ کرنے کی مجھ سے درخواست کی، میں نے اس درخواست کو بخوشی منظور کر لیا اور نظرِ ثانی اس طرح کی کہ مولوی

عبدالکریم سلمہٗ گمتھلی اول تفسیر کے ان مقامات کو میرے سامنے پیش کرتے تھے ان میں غور کر کے میں نے تفسیر میں جا بجا مناسب ترمیم کر دی اور ان مقامات کا ایک معتد بہ حصہ وہ بھی ہے جو ترجیح الراجح کے سلسلہ میں شائع ہو چکا ہے اور بعض اہلِ علم نے متعدد مقامات کے متعلق کچھ عبارتیں بطور حاشیہ لکھ کر پیش کیں اب ان کو حاشیہ میں داخل کر دیا گیا اور منہیات سے امتیاز کے لیے ان کے آخر میں محشی کا اضافہ لکھ دیا گیا ہے۔ مزید نفع کے لیے میرے مؤلفہ دو رسالے جو قرآن کے متعلق تھے اس مرتبہ اس کے ساتھ شامل کیے گئے ایک مسائل السلوک، جس میں سلوک کے مسائل پر آیاتِ قرآنی سے نصاً یا استنباطاً استدلال کیا گیا ہے یہ تفسیر کے حاشیہ پر درج کیا گیا ہے اور دوسرا وجوہ المثانی جس میں قراءتِ سبعہ کو منضبط کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کا جس قدر مضمون جس جلد کے متعلق تھا اب اس کو ہر جلد کے آخر میں درج کر دیا گیا ہے۔ چونکہ اب یہ تفسیر بحمداللہ بہمہ وجوہ مکمل ہو گئی ہے اس لیے اس کا نام بھی "مکمل بیان القرآن" تجویز کرتا ہوں۔"[1]

اشرف علی ۲۰ر شوال المکرم
۱۳۵۳ھ

مولانا تھانوی کی مندرجہ بالا تحریر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا مفسرؒ نے ایک طویل عرصہ کے بعد بیان القرآن کے قدیم اڈیشن میں نظرِ ثانی کے بعد کچھ ترمیم و اضافے کیے اور قرآن سے متعلق اپنی دیگر تالیفات کو اس میں شامل کیا اور اس کا نام بیان القرآن سے مکمل بیان القرآن تجویز کیا جس سے درحقیقت ہمیں احساس اور اندازہ ہوتا ہے کہ بلا شبہ مولاناؒ کی گہری فکر و نظر علمی صلاحیت نے خود ان کی تحریر کردہ تفسیر کی خدمت پر

---

[1] مقدمہ مکمل بیان القرآن، جلد اول، صفحہ ۲، جدید اڈیشن سن طباعت ۱۳۵۳ھ، مطبع ادارہ تفسیر القرآن، دہلی۔

تنقیدی طریقہ کار کو اپنایا اور اسی طرح ہمیشہ علومِ اسلامیہ کے ہر عنوان پر زمانہ کی ضرورت کے لحاظ سے اپنا قلم اٹھایا۔ ان کی اس عظیم خدمت کا ذخیرہ دوسروں کے کام آتا رہے گا۔

تفسیر لکھنے کی ضرورت اور مقصد میں مولانا رح کے ذاتی مفاد و شہرت کا شائبہ نہیں بلکہ تفسیر سے قبل اُن کی تصانیف تحریر و تقریر کا کافی سرمایہ موجود تھا، لیکن اُس دور کی ضرورت اور احباب کے اصرار کے تحت تفسیر کی یہ خدمت ان کو اس لیے انجام دینے کی ضرورت پیش آئی کہ اس دور میں ترجمہ قرآن کا عام ذوق پیدا ہوا تھا۔ لیکن تجارت کی غرض کے ساتھ اس میں بے احتیاطی کے ایسے پہلو پیش آئے کہ قرآنِ کریم کی وضاحت میں دانستہ یا نادانستہ قواعد شرعیہ کے خلاف مضامین جمع ہونے لگے جس کی بنا پر ایسے مسلمان طبقوں کو نقصان ہونے لگا جو ایسے عام ذہن کے مالک تھے جو سطحی طور پر ترجمہ و تفسیر کے ان مطالب پر غور و فکر کیے بغیر اعتماد کرنے لگے۔ اس نقصان کو روکنے کے لیے حضرت تھانوی رح نے کچھ رسالے لکھ کر اصلاح کی غرض سے متنبہ کرنا چاہا لیکن یہ مقصد پورا نہ ہو سکا اور انھوں نے قرآنِ کریم کے ایسے مختصر ترجمہ و تفسیر کی ضرورت کو محسوس کیا جو نقصان دہ تراجم سے بے نیاز کر دے اور مسلمانوں کو قرآن کے صحیح ترجمہ و تفسیر سمجھنے میں مدد دے سکے۔ اگرچہ مولانا رح کے خیال میں متقدمین کے مکمل اور بہترین ترجمے موجود تھے لیکن جیسے شاہ عبدالقادر رح، رفیع الدین رح وغیرہ کے، لیکن اس دور کے مزاج اور زبان و بیان کی تبدیلیوں کی وجہ سے از سرِ نو بیان القرآن کے نام سے ترجمہ و تفسیر کی خدمت انجام دی۔ اس کے باوجود بھی انھوں نے اپنی اس تفسیر کو حرفِ آخر کا درجہ نہ دیتے ہوئے یہ بھی تحریر کر دیا کہ بزرگانِ عصر اس کی اصلاح کر سکتے ہیں، کیونکہ مولانا تھانوی رح حد درجہ احتیاط اور نظم و ضبط کے مالک تھے، اُن کی تحریر میں بھی احتیاط اور نظم و ضبط کا احساس ہوتا ہے۔ اس احتیاط کے باوجود علماء اور بزرگانِ دین کو اپنی تفسیر کی اجازت دینا اپنی تفسیر کو کسی خامی سے خالی نہ سمجھنا ان کے وسیع النظر اور عظیم مفسر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس مختصر سے تعارف اور ناقص رائے کے بعد مولانا تھانوی رح کی تفسیر بیان القرآن کا خاکہ پیش کر رہی ہوں، تفسیر بیان القرآن کا قدیم اڈیشن ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔ سن طباعت

۱۳۴۹ھ، ۱۹۳۱ء علیم مجتبائی دہلی ہے۔ تقریباً سولہ سو چھبیس (۱۶۲۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر جلد علیحدہ علیحدہ سو صفحات سے اوپر اور بعض حصے ایک سو اسّی (۱۸۰) صفحات پر مکمل ہوئے ہیں۔

مکمل بیان القرآن جدید اڈیشن بھی بارہ (۱۲) حصوں میں تقسیم ہے۔ ہر حصہ تقریباً ڈھائی پاروں پر مشتمل ہے۔ صفحات کی تعداد ہر جلد کی علیحدہ علیحدہ ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

جلد اوّل	۱۸۶	صفحات
؍؍ دوسری	۱۸۲	؍؍
؍؍ تیسری	۱۳۷	؍؍
؍؍ چوتھی	۱۵۶	؍؍
؍؍ پانچویں	۱۲۳	؍؍
؍؍ چھٹی	۱۴۴	؍؍
؍؍ ساتویں	۱۰۸	؍؍
؍؍ آٹھویں	۱۳۶	؍؍
؍؍ نویں	۱۴۲	؍؍
؍؍ دسویں	۱۱۸	؍؍
؍؍ گیارھویں	۱۴۲	؍؍
؍؍ بارھویں	۱۳۲	؍؍

کل تعداد صفحات ۱۷۲۶

ان صفحات میں وہ رسالے بھی شامل ہیں جن کا گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے۔

قدیم اڈیشن میں تفسیر لکھنے کی تاریخ تفسیر ہی میں مولانا رح نے تحریر کی ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ ماہ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ میں اس تفسیر کے لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلی جلد کا چوتھائی حصہ لکھنے کے بعد یہ سلسلہ درمیان میں رک گیا۔ پھر ماہ محرم ۱۳۲۲ھ کے وسط میں شروع

ہوا اور آخری جلد ماہ شعبان المعظم ۱۳۲۶ھ میں ختم ہوئی۔ اس کا پہلا اڈیشن اس طرح ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوا۔

تفسیر بیان القرآن کی ترتیب و تاریخ کا یہ نقشہ خود مولانا رح کی تحریروں کے حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس لیے امید ہے کہ انشاء اللہ صحیح اور قابلِ اطمینان ثابت ہوگا۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ

بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(ترجمہ) اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کرے اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور بُرے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہوں گے

تفسیر بیان القرآن مولانا اشرف علی تھانوی رح
سورہ آل عمران جلد ۲، ص ۱۵

تفسیر بیان القرآن سے قبل کی چند تفاسیر کا تحقیقی جائزہ

خصوصیات و تحقیقات تفسیر سرسید احمد خان رح

سرسید کی مذہبی خدمات میں ان کی تفسیر قرآن کی خدمت بہت اہم ہے۔ اس زمانے کے حالات میں سرسید کے خلوص اور نیک نیتی کے تحت ان کا یہ کارنامہ تاریخ میں نہ صرف ناقابلِ فراموش ہے بلکہ جدید ذہنوں کے لیے جو اسلام کے اصولوں پر تنقیدی نگاہ ہی نہیں بلکہ نقص کے پہلو تلاش کرتے ہیں عقلی دلائل سے بھرپور جواب کی اہمیت رکھتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب ہندوستان کے تمام اسلامی کتب خانے تباہ و برباد ہو گئے اور اس موقع پر عیسائی مفکرین اسلام کی صحیح تاریخی مستند روایات کو اپنی تصنیفات کے ذریعے توڑ مروڑ کر پیش کرنے لگے جیسا کہ ولیم میور نے اپنی تصنیف "لائف آف محمد" میں کیا جو چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان آئی تو سرسید بے چین ہو گئے اور انھوں نے ان اعتراضات کا مدلل اور منہ توڑ جواب دینے کے لیے کچھ لکھنے کا ارادہ کیا۔ مگر غدر کی وجہ سے ہندوستان کے کتب خانوں پر جو زوال آیا تھا اس کی وجہ سے ایسی اہم تصانیف کے لیے مواد کی فراہمی ایک مشکل مرحلہ تھا، لیکن جب مقصد کی تکمیل کی دھن اور فکر ہوتی ہے تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ لہٰذا سرسید کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ انھوں نے مضامین کے مواد کو حاصل کرنے کے لیے یورپ کا سفر کیا اور انڈیا آفس کے کتب خانہ سے کتابیں لیں۔ برٹش میوزیم کی لائبریری سے کچھ مواد جمع کیا۔ فرانس اور جرمنی سے عربی کتابیں اور چند لاطینی اور انگریزی قدیم کتب جو نایاب اور گراں قیمت تھیں، لندن

سے خریدیں اور شب و روز کی لگاتار محنت کے ساتھ بارہ حصوں میں مشتمل خطبات احمدیہ کے نام سے اپنی کتاب کی تکمیل کی اور ایک قابل انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرانے کے بعد ۱۸۷۰ء میں لندن سے شائع کی۔[1]

ان کتب کے مصارف کے لیے سرسید نے وہ روپیہ خرچ کیا جوان کو غدر کے زمانے کی تنخواہوں کا چڑھا ہوا ملا تھا اور غدر میں جو اسباب بجنور میں لٹ گیا تھا اس کے معاوضہ کا بہت سا روپیہ سرکار سے سرسید کو ملا۔ جس سے انھوں نے پہلے عیسائی مذہب کی ضروری کتابیں، بائبل کی تفسیریں اور دوسرے مذاہب کی کتابیں خریدیں اور لامذہبوں کی کتابیں جو بائبل کے خلاف لکھی گئی تھیں وہ بہم پہنچائیں۔ ایک انگریزی جاننے والے کو تنخواہ پر رکھا جو ان کتابوں کے ضروری مقامات کے ترجمے سناتا تھا اور کتب احادیث و تفسیر وغیرہ سے سندیں فراہم کرنے کے لیے ایک عربی داں کو معاوضے پر رکھا اور بائبل کے متعلق جو عام واقفیت اور اطلاع مذکورہ بالا ذریعوں سے حاصل ہوئی اس کو دس مقدموں اور دو تتموں میں بیان کیا۔

سرسیدؒ نے اسی دینی فریضے کی ادائیگی کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن تکالیف اور مشکلات کا سامنا کیا وہ بہت تفصیل سے کتب میں تحریر ہیں۔ لیکن ان کے اس جذبۂ صادق کی لگن، کاوش و خلوص کا اندازہ کہیں کہیں خود ان کی تحریروں سے ہوتا ہے جو انھوں نے انگلینڈ سے مولوی سید مہدی علی خاں کے نام خطوط میں بھیجیں۔

"ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔"

ولیم صاحب کی کتاب دیکھ رہا ہوں اس نے دل کو جلا دیا ہے۔ اُس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا۔ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی (سیرت) پر جیسا کہ پہلے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے اور

---

[1] بحوالہ حیاتِ جاوید، تالیف مولانا الطاف حسین حالی، حصہ دوم ص۲۱، شائع کردہ اردو بورڈ، نئی دہلی ۱۹۰۹ء

اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔"[1]

ہمارے قدیم مفسرین نے قرآن کریم کی تفسیر اور ترجمے کی خدمت زمانے کے حالات اور تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ حالات اور خیالات بدلتے رہتے ہیں۔ خصوصاً اس دور میں جب کہ یورپ کے اثر سے لوگوں نے ہر مسئلہ کو عقل و سائنس کی روشنی میں پرکھنا شروع کر دیا اور نتیجہ مذہب کے اصول اور قوانین کا معاملہ اس دور میں زیادہ نزاکت کی شکل اختیار کر گیا۔ کیونکہ مذہب کے قوانین ہمیشہ حال ہوتے ہیں اُن کو زیادہ سے زیادہ دلائل اور غور و فکر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان میں کچھ وسعت تو پیدا کی جا سکتی ہے لیکن ان کو بدلا نہیں جا سکتا۔ سرسید نے اسی دینی جذبے کے پیش نظر تفسیر لکھنے کی ضرورت محسوس کی۔

ان خصوصیات کے اعتبار سے سرسید کی تفسیر دیگر تفاسیر کے مقابلہ میں امتیازی حیثیت کی حامل ہے اور چند دیگر وجوہات کی وجہ سے جو مندرجہ ذیل ہیں ہندوستان کی اردو تفاسیر میں اس کا خاص مقام ہے۔

قدیم مفسرین کی کوشش اور نیک نیتی کے باوجود بے شمار روایتیں قدیم تفاسیر میں ایسی تحریر کی گئیں جن کی وجہ سے علمائے محققین کو یہ کہنا پڑا کہ کتب تفسیر روایات موضوعہ سے بھری ہوئی ہیں۔ کتب التفسیر الموضوعۃ بالاحادیث الموضوعۃ[2] انھوں نے رطب و یابس روایتوں سے اپنی تفسیر کو بھر دیا اور مخالفین کے اعتراضات کے لیے دروازہ کھول دیا۔

اسلام جب ایسے ممالک میں پھیلنے لگا، جہاں عربی زبان سے لوگ ناواقف تھے، اور وہاں کے لوگ قرآنِ کریم کی فصاحت اور بلاغت کا اندازہ نہ کر سکے تو اس ضرورت کو محسوس کیا گیا کہ ایک ایک لفظ پر صرفی و نحوی قواعد کی روشنی میں بحث کی جائے اور

---

[1] ص۱۳۷ حصہ دوم مذہبی خدمات، حیات جاوید، الطاف حسین حالی، مطبع پریس کانپور۔

[2] حیاتِ جاوید، حصہ دوم، ص ۲۶۰

اعجاز قرآن کی وجوہ کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے اور اس کو حتی الوسع علمار نے پورا کرنے کی کوشش کی۔

جب یونانی فلسفہ اور منطق اہلِ اسلام میں شائع ہوئی اور نئے نئے فرقے مسلمانوں میں جنم لینے لگے تو ہر فرقہ قرآن کی آیات کی تشریح اپنے عقائد اور اصول کے مطابق کرنے لگا۔ فلسفے اور منطق کی رو سے علمارِ متکلمین نے اسلام کی حمایت کا پہلو اس میں نکالا، تاکہ علوم عقلیہ سے مذہبِ حق کی تائید کی جائے۔ بعض مفسرین نے اپنی تفسیر کی بنیاد جزئیات فقہ کے استنباط اور اخلاقی مسائل میں اپنے مذہب کی بنیاد حمایت پر رکھی۔ مثال کے طور پر امام فخرالدین رازیؒ نے اپنی تفسیر کو حکمار اور فلاسفہ کے اقوال اور اس قسم کی باتوں سے پُر ہے۔ وہ علومِ عقلیہ کے عالم مانے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی تفسیر کے لیے بعض علمار کا خیال ہے۔ سوائے اس میں تفسیر کے سب چیزیں ہیں۔

دوسری تفسیر مثال کے طور پر قرطبی کی ہے۔ ان کی تفسیر میں تمام ابواب علمِ فقہ کی تفسیر میں اس طرح ملتے ہیں۔ بسا اوقات ان فقہی مسایل کی دلیلیں قائم کرنے پر پورا زورِ بیان صرف کر دیتے ہیں جب کہ آیت کی تشریح میں اس کا اتنا تعلق نہیں ہوتا۔

البتہ عربی تفاسیر میں مجموعی لحاظ سے امام ابو جعفر بن جریر طبری کی تفسیر کو مستند سمجھا جاتا ہے فن تفسیر میں اس کو مکمل مانتے ہیں۔[1]

علاوہ ان عربی تفاسیر کے اُردو تفاسیر میں تفسیر حقانی عبدالحق ہے۔ جس میں انھوں نے مخالفین کے اعتراضات کی رد کی کوشش کی ہے۔ اس لیے تاریخی واقعات کے ذریعے تفصیلی حوالے دیے ہیں۔

سرسید کی تفسیر میں اہلِ یورپ کے نظریات اور اعتراضات کا بھرپور جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا جو ضرورتیں سرسید کے زمانے میں دنیا کے مسلمانوں کے سامنے تھیں

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن اُردو، جلال الدین سیوطی، حصہ دوم، صفحہ ۶۰

اس سے پہلے دَور میں نہیں تھیں۔ جس بنا پر علمائے وقت کو ان کو پورا کرنے کا خیال نہ تھا۔ اُس صدی میں پوری دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں عیسائی قوموں کی حکومت کا رعب اور اثر نہ ہو۔ حکمراں عیسائی طبقہ عقل و دانش اور شائستگی میں ممتاز درجہ رکھتا ہے اُن کے یہاں رعایا کو مذہبی آزادی حاصل رہی ہے۔

انگریزوں کے گہرے اثرات مذہبی اعتبار سے مسلمانوں پر نہیں ہوئے تھے۔ مگر یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ رفتہ رفتہ مسلمان اپنے اسلاف سے بے تعلق ہو کر عیسائی مشن کو اسلامی روایات میں ہی نہیں بلکہ تہذیبی نکتہ نگاہ سے ان کے رگ و پے میں یہ مشن سرایت کر جائے گا جس کی وجہ سے اسلام کا رعب و وقار جو خود ایک امتیاز رکھتا ہے۔ حکومتِ وقت سے متاثر ہو سکتا ہے۔

دوسری ضرورت اسلام کو سائنس کے غلط حملے سے بچانے کی پیش آئی کیونکہ علوم جدیدہ سے جو تبدیلیاں مذاہب میں آئیں وہ صاف ظاہر ہوئیں۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ مصر و ترکی میں علوم جدیدہ کے نتائج اس طرح سامنے آئے کہ طرابلس کے عالم شیخ حسین آفندی نے اپنی کتاب حمیدیہ[1] میں تفصیل سے ان کا ذکر کیا ہے۔

> "مسلمان نوجوان جو مدارس میں علوم جدیدہ خاص طور سے فن طبیعیات کی تعلیم پاتے ہیں وہ اسلامی عقیدے سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ ان کو اس سے کچھ لگاؤ باقی نہیں رہتا۔ جو مسلمان علوم جدیدہ میں خاص طور سے فن طبیعیات کی تعلیم پاتے ہیں وہ خدا کے وجود کے منکر ہو جاتے ہیں (نعوذ باللہ) اور خدا کے وجود کا اقرار اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے لہٰذا جو اس کا بھی منکر ہو جائے تو اس کا اسلام کے دیگر اصولوں سے پھر کیا تعلق باقی رہ جاتا ہے۔"

---

[1] حمیدیہ شیخ حسین آفندی نے سنہ ۱۳۰۶ھ میں ان شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لیے لکھی جو علوم جدیدہ کی تعلیم سے مسلمانوں کے دل میں اصولِ اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ہیں۔ ملک شام میں لکھی گئی جس کا نام مصنف نے سلطان حمید خاں کے نامِ نامی پر حمیدیہ رکھا۔ بحوالہ حیاتِ جاوید صفحہ ۲۱، الطاف حسین حالی، مطبع کانپور، سنہ ۱۹۰۱ء سن طباعت

سرسید نے مسلمانوں کو خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کو اس قسم کی بے راہ روی سے بچانے کے لیے بہت سے اقدامات کیے ان میں سے ایک تفسیری کارنامہ بھی آتا ہے۔ یہ حقیقت تھی کہ مسلمان اس وقت کے جدید علوم سے بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے اور اس سے فرار کا مطلب یہ ہوتا کہ اس بات کو تسلیم کر لیا کہ اسلام فلسفہ جدیدہ اور اعتقادات سائنس کے سامنے شکست قبول کر لیتا ہے۔ لہٰذا ان تمام مضرتوں کو سامنے رکھتے ہوئے سرسید نے اسلام کے اصولوں کو دیگر مذاہب کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ عقل کی روشنی میں واضح دلائل سے پیش کرنے کی کوشش کی جس کا ثبوت ان کی تفسیر ہے۔ کیونکہ سرسید اپنی قوم کے ایک بڑے مصلح کی حیثیت سے عظیم رہبر اور درد مند انسان ثابت ہوئے۔ انھوں نے علمی اور عملی کارنامے انجام دے کر اپنی قوم اور دیگر انسانوں کے لیے ایسی ناقابلِ فراموش یادگاریں چھوڑی ہیں کہ تاریخی اعتبار سے ان کا نام زمانہ حال میں ان کے کارناموں کی وجہ سے روشن ہے۔ اسی طرح مستقبل میں بھی لوگ ان کو بھلا نہ سکیں گے۔

لیکن کتنا ہی بڑے سے بڑا انسان ہو اور زیادہ سے زیادہ خوبیوں کا مالک ہو کچھ نہ کچھ غلطیاں اور لغزشیں اُس سے بھی سرزد ہونے کا امکان رہتا ہے۔ اور ہو بھی جاتی ہیں دانستہ یا نادانستہ۔ بہرحال جب سرسید کے علمی کارناموں کی روشنی میں ان کا مذہبی علمی کارنامہ ان کی تفسیر کی شکل میں سامنے آیا اور اس پر مذہبی اصولوں کی روشنی میں تنقید کی گئی تو ان سے سرزد ہونے والی تفسیری غلطیوں کا بھی اندازہ ہوا۔ ان کا خود بھی تفسیری مطالعہ رہا اور جو ان کے ہم عصر تھے انھوں نے بھی ان حصوں پر اعتراضات اور نہیں تو ایسی تنقید کی جن پر سرسید نے اپنے نظریات کے مطابق وضاحت کی ہے۔ مثلاً:

معجزات کے سلسلہ میں سرسید کے نظریات نے قرآنِ کریم کی تفسیر میں اس طرح کی توجیہات کی ہیں جو عام مفسرین کے طرزِ بیان و تفسیر سے ان کو الگ کر دیتی ہیں جیسا کہ قرآنِ کریم کے الہامی ہونے میں کسی مفسر کا اختلافِ رائے نہیں ہے کیوں کہ خود قرآنِ کریم میں اس کا چیلنج ملتا ہے۔ فاتوا بسورۃ مثلہ[1] (ترجمہ) کہہ دیجیے اے نبی کہ وہ اس جیسی کوئی آیت لے آئیں۔

---

[1] سورہ یونس۔ پارہ ۱۱۔ آیت ۳۸

لیکن سرسید نے تفسیر القرآن میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"اس میں کچھ شک نہیں کہ قرآن مجید نہایت اعلیٰ درجہ کے فصاحت و بلاغت پر واقع اور جو کہ وہ ایسی وحی ہے جو پیغمبرؐ کے قلبِ نبوت پر نہ بطور معنی و مضمون کے بلکہ لفظ بلفظ ڈالی گئی تھی جس کے سبب سے ہم اس کو وحی متلو یا قرآن یا کلامِ خدا کہتے اور یقین کرتے ہیں اس لیے ضروری تھا کہ وہ ایسی اعلیٰ درجہ کی فصاحت پر ہو جو بے مثل ہو اور بے نظیر ہو مگر یہ بات کہ اس کے مثل کوئی کہہ سکا یا کہہ سکتا ہے اس کے من اللہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی۔"[1]

اسی طرح دوسری جگہ اپنی تفسیر کے دیباچہ میں سرسید لکھتے ہیں:

"سورت کو سورہ کہنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سورت شہر کی فصیل کو کہتے ہیں جس سے شہر محدود ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید کی آیات معینہ و محدودہ پر سورت کا اطلاق کیا گیا ہے۔"[2]

جب کہ غیاث اللغات اور سب لغت کے کتابوں کے حوالوں سے اس کے معنی یہ نہیں نکلتے۔ قرآنِ کریم میں ۱۱۴ سورتوں پر سب کا اتفاق ہے مگر سرسید کے خیال میں صرف ۲۹ سورتوں کے نام ہیں جن میں حروف مقطعات ہیں جیسا کہ دیباچہ میں بھی ظاہر کیا جا چکا ہے حالانکہ قرآنِ کریم کی بہت سی سورتوں کے نام ایسی صحیح احادیث میں موجود ہیں جو بہت سی دیگر کتب احادیث میں ملتی ہیں اور حروف مقطعات وہ ہیں جن کے معانی کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں۔ ان حروف کے معنی کیوں نہیں بتائے گئے تو اس کا جواب ہے کہ دوسری آسمانی کتب میں بھی جو کہ الہامی ہیں ایسے الفاظ موجود ہیں جن کا مفہوم آج تک نہیں معلوم۔ مثال کے طور پر توریت جو تین ہزار سال قدیم ہے اس میں بھی ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کے معانی اب تک صحیح طور پر

---

[1] تفسیر القرآن، سرسید احمد خاں، صفحہ ۳۲ و صفحہ ۲۹ تنقیح البیان میں بھی یہ عبارت نقل کی گئی ہے۔

[2] دیباچہ سرسید کی تفسیر القرآن کے حوالہ سے۔

طے نہیں کیے جا سکے۔

اس کے علاوہ قرآنِ کریم کی تفسیر کے لیے جن اصولوں اور شرائط کا تعلق آدابِ قرآن میں شامل ہوتا ہے ان کو بھی سرسیّد نے نظر انداز کیا ہے۔ مثلاً انھوں نے قرآن کی تفسیر کا دیباچہ جو نو صفحات پر مشتمل ہے بغیر بسم اللہ کے شروع کیا ہے جب کہ تقریباً تمام مفسرین نے اپنے تراجم و تفاسیر کا آغاز کرتے ہوئے خدا کے نام سے اس کی ابتدا کو مقدم رکھا ہے۔

دوسرے اس میں قرآن کے کسی پارے کا دوسرے پارے کے ختم کرنے میں کوئی امتیاز نہیں رکھا جس سے یہ اندازہ ہو جائے کہ قرآن کا پارہ ختم یا شروع ہوا ہے۔ اس کے ساتھ رکوع کا بھی کوئی نشان ضروری نہیں سمجھا۔

جیسا کہ "تنقیح البیان" میں ایک جگہ اسی سلسلہ میں تحریر ہے:

"نصرانی قرآن کے ترجموں کے مطابق اس تفسیر میں تمام سورتوں اور ترجموں کے آخر تک آیتوں کا شمار لکھ دیا ہے۔ جیسے (۱۷۲) ۲۸۲ وغیرہ"[1]

ان چند کمزوریوں یا لغزشوں کی نشاندہی کے بعد جب خاص طور سے ان کے ترجمے یا تفسیر کو نفسِ مضمونِ قرآن اور عقائد کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اندازہ ہو جائے کہ جو غلطیاں ان سے سرزد ہوئی ہیں وہ عوام کے لیے غلط فہمی کا باعث بن سکتی ہیں خصوصاً ایسے مسلمان طبقے پر جو شخصیت کے تاثر کے تحت اس مذہبی مسئلے میں بھی سرسیّد کی بات پر ایمان لانا ضروری خیال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مواقع پر مقالات و رسائل کے ذریعہ ان پر اعتراضات اور تنقید ہوتی رہی ہے، لیکن اعتراضات اور تنقید کرنے والوں کو اس کا بھی اندازہ ہونا چاہیے کہ ان کا مقصد تفسیر لکھتے وقت ان مسلمانوں کا پیشِ نظر تھا جو خدا، رسول اور عقیدۂ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں جیسا کہ ایک واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے جس کا ذکر

---

[1] تنقیح البیان صفحہ ۲، سیّد ناصر الدین محمود، بحوالہ قدیم نسخہ سرسیّد روم آزاد لائبریری علی گڑھ

کیا جائے گا۔ بلکہ خصوصیت سے ان غیر مسلم اقوام اور ایسے لوگوں کے لیے ہو جو ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا اور جانچنا ضروری سمجھتے ہوں۔ لیکن کوئی بھی تحریر صرف اس طبقے کی نظر سے نہیں گذرتی جس کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی جاتی ہو بلکہ اہلِ علم حضرات مطالعہ کرتے، اس کو پڑھتے اور غور و فکر کرتے ہیں۔

گذشتہ اوراق میں تفسیر کے صرف ان چند پہلوؤں کو اختصار سے چند مثالوں کے ذریعہ روشنی ڈالی ہے جہاں وہ عقلیت پسندی میں حدِ اعتدال سے بڑھ کر قرآنِ کریم کے بعض حصوں کی تفسیر میں آدابِ قرآن اور قدیم مفسرین کے تفسیری اصول سے ہٹ گئے ہیں جس کی وجہ سے اسلام کے بعض عقائد کو ٹھیس پہنچتی ہے اور آدابِ قرآن کے خلاف محسوس ہوتا ہے۔

سرسیّد کے تفسیر لکھنے کی ضرورت و اہمیت

تفسیر لکھنے سے سرسیّد کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ اس کے مضامین عام طور پر اہلِ اسلام کے نظر سے گذریں اس کا اندازہ ذیل کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب جو خود عالم تھے سرسیّد کے پاس آئے اور ان کا مقصد سرسیّد کی تفسیر کا مطالعہ تھا۔ سرسیّد نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ کو خدا کی وحدانیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت، حشر و نشر اور قرآن کے مضامین پر یقین ہوگا۔ انھوں نے کہا اللہ کا شکر ہے میں ان سب باتوں پر یقین رکھتا ہوں۔ تو سرسیّد نے جواب دیا میری تفسیر آپ کے لیے نہیں بلکہ ان لوگوں کے لیے ہے جو مذکورہ بالا عقائد پر یقین نہیں رکھتے یا ان میں متردد ہیں۔ اسی طرح سرسیّد نے اپنی تفسیر کے لیے ایک جگہ یہ بھی کہا:

"اگر زمانے کی ضرورت مجھ کو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی اپنے خیالات کا اظہار نہ کرتا بلکہ لکھ کر اسے ایک لوہے کے صندوق میں بند کروا جاتا اور رکھ جاتا کہ

اسے کوئی نہ دیکھے اور اب بھی بہت کم چھپواتا ہوں اور گراں بیچتا ہوں تاکہ صرف خاص خاص لوگ دیکھیں سر دست عام لوگوں میں اس کا شائع ہونا اچھا نہیں۔[1]"

سرسید نے اپنے مندرجہ بالا خیالات اور جن وجوہات کی بنا پر اپنی تفسیر تحریر کی ہے اس کے اظہار کے بعد وہ اصول بھی تحریر کیے ہیں جو انھوں نے اس تفسیر کے سلسلے میں اپنائے ہیں اور ان اصولوں کو تفصیل سے اس مقالہ کے باب میں پیش کیا جائے گا جس میں مختلف مفسرین کے ان تفسیری اصولوں سے بحث کی ہے جو انھوں نے تفسیر لکھتے وقت وضع کیے۔

خصوصیاتِ تفسیر سرسیدؒ

سرسید کی تفسیر کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ایسے روشن خیال لوگوں کو جو جدید علوم سے متاثر تھے انتہائی سائنٹفک طریقہ سے ان مسائل کو جو قرآن کے احکامات، قوانین اور واقعات کو پیش کرتے ہیں اُن کے سامنے واضح کیا۔

سرسید نے قرآن کی تفسیر کو پہلی مرتبہ ۱۲۹۷ھ میں شائع کرایا۔[2] پھر وقتاً فوقتاً اس کی جلدیں شائع ہوتی رہیں۔ لیکن نصف قرآن سے کچھ زیادہ کی تفسیر لکھ پائے تھے کہ ان کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا اور چھ جلدیں سورہ بنی اسرائیل تک چھپ سکیں اور ایک جلد بغیر چھپی ہوئی سورہ انبیاء تک اور چند مختصر رسالے جو تفسیر کے اجزا میں شمار کیے جا سکتے ہیں سرسید کی یادگار بن کر رہ گئے۔

سرسید نے اپنی تفسیر میں قدیم مفسرین کے تفصیلی مضامین سے بہت کم تعرض کیا ہے اور اُن مضامین کی تفصیلی تفسیر سے سرسید نے گریز کیا ہے جن کی اُس زمانے میں

---

[1] مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، دوسرا حصہ صفحہ ۱۸۱ و ۱۸۲

[2] حیاتِ جاوید حصہ دوم، مذہبی خدمات صفحہ ۲۱۴، مطبع کانپور پریس۔

ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ انھوں نے زیادہ تر اُن مضامین کی وضاحت پر اکتفا کیا ہے جن کا وہ غیر مسلموں کی نظر میں اعتراضات کا جواب دینا اسلام کی حمایت میں ضروری سمجھتے تھے جن سے قدیم تفاسیر خالی نظر آتی ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ نے سرسید کی زندگی کے تفصیلی حالات اور کارناموں کو کافی حد تک حیاتِ جاوید میں مکمل طور پر پیش کیا ہے اور اپنی اس تصنیف کے ایک حصہ میں مذہبی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسی سلسلے میں ان کی تفسیر قرآن کی خصوصیات اور وجوہات تحریر کی ہیں

ان کی تفسیر کی پہلی خصوصیت انھوں نے یہ پیش کی ہے کہ جب ان کی تفسیر کا قدیم مفسرین سے موازنہ کیا جاتا ہے تو سرسید کے یہاں قرآنِ کریم کے بعض وہ قصے تفصیل سے ملتے ہیں جن کو قدیم مفسرین نے تفصیلاً یا اجمالاً بیان کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں بعض واقعات کے اشارے جگہ جگہ ملتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض کی تفصیل بائبل میں ملتی ہے۔ اور بائبل کے بعض واقعات کی تصدیق قرآنِ کریم سے ضمناً ہو جاتی ہے۔ سرسید نے اس کو پورا کرنے کے لیے بائبل کا مطالعہ کیا اور ایسے واقعات کی تحقیق کی اور جو مضامین قرآن اور بائبل میں آپس میں مخالفت رکھتے تھے ان کو پیش کیا اور جو نہیں ملتے تھے اس کی وجہ بیان کی۔ اس طرح سے واقعات کی تفسیر کو قدیم مفسرین نے نظر انداز کر رکھا تھا سرسید نے اس کمی کو پورا کیا۔ حیاتِ جاوید میں اس کا ذکر اس طرح ہے:

> "ہمارے قدیم مفسرین نے اخبارِ ماضیہ کی تنقیح پر جو کہ قرآن مجید میں اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہوئے ہیں بہت ہی کم توجہ کی۔ اس کا سبب خواہ یہ سمجھو کہ ان کو ایسی ضرورت ہی نہیں پیش آئی اور خواہ یہ قرار دو کہ اس زمانے میں اطلاع کے ذریعے محدود تھے۔ دونوں صورتوں میں یہ فروگذاشت بلاشبہ تفسیر قرآن میں ایک بہت بڑی کمی کا باعث تھی۔"[1]

---

[1] حیاتِ جاوید، الطاف حسین حالیؔ، حصہ دوم صفحہ ۲۱۴۔ مطبع کانپور

toobaa-elibrary.blogspot.com

سرسید نے اپنی تفسیر میں بہت سے واقعات کو بائبل کی تفصیل کی روشنی میں پیش کیا ہے اور جس قصّے میں مطابقت پیدا نہ ہو سکی اس کا ثبوت حتی الوسع دوسرے ذرائع سے بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً جیسے طالوت اور جالوت کی لڑائی[1] کا قصہ جو سورۃ البقرہ میں ہے اور یہ قصّہ کتاب میں بھی بیان ہوا ہے مگر اس میں وہ مضمون جس کا قرآن کی اس آیت میں ذکر ہے[2] لیکن یہ مضمون کتاب قضاۃ کے ساتویں باب میں ہے جہاں جدعون کی مدیانیوں پر لشکر کشی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس لیے عیسائی مورخین نے قرآن کے اس بیان پر اعتراض کیا ہے کہ اس میں غلطی سے جدعون کے واقعات کو لشکر طالوت کے واقعات سے ملا دیا ہے حالانکہ دونوں واقعات جدا ہیں اور مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر واقع ہوئے ہیں۔ مگر سرسید نے اپنی تفسیر میں علمائے مسیحی کے اقرار اور شہادت سے یہ ثابت کیا ہے کہ کتاب شموئیل کے بعض حصّے صحیح نہیں ہیں اور جان کیٹو کا یہ قول نقل کیا ہے:

"جس مقام کو ہم غلط جانیں اُسے الحاق سمجھ کر خارج کر دیں اور باقی کو بلا کم و کاست صحیح جانیں کیونکہ ممکن ہے جنھوں نے الحاق کیا تھا انھوں نے باقی حصّوں میں تصرّف کیا ہو۔"[3]

۲۔ **دوسری مثال:** قرآنِ کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات کے ذیل میں خلق طیر[4] کی طرف اشارہ ہوا ہے جو موجودہ عہدِ جدید کی کتابوں میں مذکور

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۲۴۸، رکوع ۳۶

[2] إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ (ترجمہ) حق تعالیٰ تمھارا امتحان کریں گے ایک نہر سے جو شخص پانی پیے گا اس سے تو وہ میرے ساتھیوں میں سے ہے۔

[3] الطاف حسین حالی۔ حیات جاوید، حصہ دوم، صفحہ ۲۱۶

[4] أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ (سورہ آل عمران پارہ ۳ رکوع ۱۳) میں تم لوگوں کے لیے گارے سے ایسی شکل بناتا ہوں جیسے پرندہ کی شکل ہوتی ہے پھر اس کے اندر پھونک دیتا ہوں۔ جس سے یہ جاندار پرندہ بن جاتا ہے۔ (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ)

ہیں اس لیے عیسائی اس کو ایک غلط واقعہ قرار دیتے ہیں۔ مگر سرسید نے اپنی تفسیر میں ثابت کیا ہے کہ یہ واقعہ موجودہ عہدِ جدید میں نہیں۔ لیکن دو انجیلیں جو اناجیل طفولیت کے نام سے اب تک موجود ہیں جن کو ایک زمانے میں اکثر مشہور عیسائی عالم تسلیم کرتے ہیں اور عرصہ تک ایشیا اور افریقہ کے گرجاؤں میں پڑھی جاتی تھیں اور ان میں یہ واقعہ جس کا قرآنِ کریم میں اجمالی ذکر ہوا ہے بہت تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اور ان انجیلوں کا تمام ماحصل جو اس واقعہ سے متعلق ہے تفسیر میں نقل کیا ہے جس کی روشنی میں عیسائیوں کو اب یہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے کہ خلق طیر کا ذکر جو قرآن میں آیا ہے اس کی کچھ اصل نہیں

۳۔ **تیسری مثال:** عیسائی قرآنِ کریم کی بعض ان آیات پر اعتراض کرتے ہیں جن سے قومِ نوح اور قومِ عاد کے ہدایت کے لیے مبعوث ہونا ظاہر ہوتا ہے کیونکہ بائبل میں اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ مگر سرسید نے سورۂ اعراف کی تفسیر میں ان کتبوں کے بموجب جو حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے عہد میں عبدالرحمٰن حاکم یمن کو ملے تھے۔ اور پھر ۱۸۳۴ء میں انگریزوں کو یمن کی پیمائش کرتے ہوئے وہاں کے کھنڈرات میں ملے تھے۔ عیسائیوں کے دونوں اعتراضات کو رد کیا ہے اور "ریونڈر فاسٹر"[1] (Revendar faster) نے جو غلط نتائج ان کتبوں سے نکالے ہیں ان کی غلطی ثابت کی ہے۔

سرسید نے تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات جو قرآنِ کریم کے مضمون سے متعلق ہے اس کی طرف بہت توجہ دی ہے۔ ان سے پہلے مفسرین نے اپنے دور میں اس کی ضرورت نہ محسوس کرتے ہوئے خصوصی توجہ دینے کی کوشش نہیں کی سرسید نے اپنے دور کے لحاظ سے اس کو ضروری سمجھا کیونکہ مخالفین کے اعتراضات کا استدلال کے ساتھ جواب دینے کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو مطمئن کرنے کے لیے قرآن کے ہر قصے میں ناموں اور مقامات کو موجودہ زمانے کے تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات پر منطبق کرنا اور

---

[1] حیاتِ جاوید، الطاف حسین حالی، حصّہ دوم، صفحہ ۲۱۷

عدم انطباق کی صورت میں غلط ثابت کرنا یا اس کی وضاحت کرنا ضروری تھا۔

قدیم مفسرین نے بھی پچھلی امتوں کے حالات پر بہت تفصیل سے لکھا ہے جو صرف شکوک و شبہات سے خالی ذہنوں اور مسلمانوں کے ایک خاص طبقہ کے لیے قابلِ اطمینان ہو سکتا ہے لیکن عیسائیوں کے لیے جو تاریخی نکتہ چینیاں کرتے ہیں یا مسلمانوں کے اس طبقہ کے لیے جو مغربی مصنفین کے اعتراضات پر غور کرتا ہے اور ان کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔

قرآنِ کریم میں بعض قصے ایسے بھی ہیں جو بائبل میں نہیں ہیں جیسے ذوالقرنین یا اصحابِ کہف کا قصہ۔ سرسید نے ان قصوں کی تحقیقات میں حتی الامکان کوشش کی ہے اور ان قصوں کی تفصیل پیش کی ہے۔ لیکن قصہ ذوالقرنین میں "جی وانگٹی فغفورِ چین" کو ذوالقرنین کا مصداق ٹھہرایا ہے۔ اس سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ قرآن میں جتنے قصے بیان کیے گئے ہیں کوئی ایسا نہیں جو عرب اور اس کے قرب وجوار میں مشہور نہ ہو لہٰذا یہ بات قابل اور قرینِ قیاس نہیں کہ ایسے اجنبی ملک کے بادشاہ کا قصہ جس کے حالات نہ صرف عرب بلکہ اکثر دنیا کی قومیں ناواقف تھیں اس کتاب میں بیان کیا جائے جو عرب کے امیوں کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہو۔

بعض مفسرین نے سکندر رومی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے لیکن اس قسم کے نظریات تفسیر میں سرسید کے قول سے زیادہ مخدوش ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قصہ کی تفسیر میں تمام جزئیات کو تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات پر منطبق کیا گیا ہو اور باوجود اس قرآن کے وظیفہ مستمرہ[1] کے بھی خلاف نہ ہو

دوسری خصوصیت

سرسید کی تفسیر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کے زمانے کے معترضین جو اعتراضات

---

[1] حیاتِ جاوید، نسخہ قدیم، آزاد لائبریری علی گڑھ، صفحہ ۲۱۹

مسلمانوں کے مسائل واعتقادات پر کرتے ہیں وہ مسائل جو اسلام کے اہم اور بنیادی مسائل ہیں جیسے حج، جہاد، روزہ، طلاق، حرمت، ریا، معراج، بہشت اور دوزخ وغیرہ۔ ان تمام مسائل پر سرسید نے اپنی تفسیر میں بہت وضاحت اور صفائی سے بحث کی ہے۔ اور مناسب طریقوں سے وقت کے تقاضوں کے تحت شکوک و شبہات کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کی نظیر قدیم تفاسیر میں کم ملتی ہے۔

مختصراً دو مثالیں تحریر ہیں:

(۱) مثال ۱۔ جہاد کے مسئلہ پر سرسید کی تفسیر سے قبل دیگر تصانیف میں بحث کر چکے تھے مگر انھوں نے تفسیر میں جب اس مسئلہ کی تشریح کی تو ان تمام اعتراضات کی جڑیں اکھاڑ دیں جن کو تقریباً تیرہ سو[۱۳۰۰] برس سے اسلام کو عیسائیوں نے ملعون کرنے کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔

سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر میں سرسید نے ایک تقریر لکھی ہے جس میں مشرکینِ مکہ سے قتال کرنے کا حکم ہے اور اس کا کچھ حصہ مختصراً یہاں تحریر ہے:

"اکثر لوگ اسلام پر طعن کرتے ہیں کہ جو تکالیف کفار سے مسلمانوں کو پہنچی ہیں ان میں صبر و برداشت نہیں اور یہ باتیں مذہب کی سچائی اور اخلاق کے خلاف ہیں۔ یہ ایک بڑی غلطی اور ناسمجھی ہے۔ بے شک قرآن میں لڑائی کے احکامات نہایت نیکی اور انصاف پر مبنی تھے، لیکن بااقتدار حضرات نے ان کا استعمال غلط طریقے سے نفسیانی خواہشات کے تحت کیا۔ اور وحشی درندوں سے بدتر کام کیا اور علمائے اسلام نے ان کی تائید کے لیے ایسے ایسے مسئلے بیان کیے جو اسلام کی روحانی نیکی کے برخلاف تھے۔"[1]

"اسلام میں عفو و صبر کی خوبیاں جگہ جگہ ہیں اور ان پر رغبت دلائی ہے

---

[1] حیاتِ جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، صفحہ ۱۹۹ و صفحہ ۲۲۰

اور ساسخہ میں بدلہ لینے کی بغیر ظلم وزیادتی کے اجازت دی ہے کیا یہ قانون دنیا کے پیدا کرنے والے کے قانونِ قدرت کے مناسب نہیں ہے۔ اخلاق پر گفتگو عمدہ سے عمدہ تر ہو سکتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ عمل کرنے والی بات کونسی ہے جو کہی جا سکتی ہو اور اس پر عمل کیا جا سکتا ہو۔ؔ[1]

انجیل میں جو دنیا میں سب سے زیادہ اخلاق و ترقی کے برتاؤ کا درس دیتی ہے اور جس میں ہے کہ اگر کوئی ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی پیش کر دے۔ یہ مسئلہ اخلاق کے خیال سے بہت عمدہ ہے مگر کس زمانے کے لوگوں نے اس پر زیادہ سے زیادہ عمل کیا اور دنیا اگر اس پر عمل کرنے بھی لگے تو دنیا میں امن کیسے رہ سکتا ہے۔ یہ اخلاقی درس صرف خیالی خوشی حاصل کراتے ہیں۔

عیسائی مذہب کی بنیاد ایسی نیکی اور اخلاق پر قائم تھی کہ ایک نصیحت کام نہ آسکی خود مذہب نے بے انتہائی خوں ریزی کی مثالیں دکھائیں کیوں کہ قانونِ قدرت کے خلاف اصول قائم کیے گئے تھے۔

اسلام میں جو خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اس کے تمام قانون فطرت انسانی کے مطابق اور عمل کے قابل ہیں، رحم کی جگہ رحم ہے، لڑائی کی جگہ لڑائی ہے، معافی کی جگہ معافی ہے، تعلیماتِ اسلامی میں عدل و مساوات کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ اسلام فساد، دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا۔ امان دینے والے کی اطاعت اور احسان مندی کی ہدایت کرتا ہے۔ صرف دو صورتوں میں تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے۔ ایک تو جب مخالف طاقتیں اسلام سے جب کھلی عداوت رکھیں اور اسلام کو معدوم کرنے کی غرض سے مقابلے کے لیے آئیں۔ دوسرے جب کہ اس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو ان کی جان و مال محفوظ نہ رہ سکے۔ مگر صرف

---

[1] حیاتِ جاوید، مولانا الطاف حسین حالی صفحہ ۱۹۹ و صفحہ ۲۲۰

اس لیے کہ جبطور رعیت رہتے ہیں اور ان پر اس لیے ظلم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہیں تو کبھی ان کو تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ظلم برداشت کریں یا ہجرت کریں۔

ہاں جو لوگ خود مختار ہیں اور بطور رعیت کے نہیں ہیں اور دوسرے ملک کے باشندے ان مظلوم مسلمانوں کو بچانے کو جن پر صرف اسلام کی وجہ سے ظلم ہوتا ہے ہاں ان کے لیے امن اور مذہبی آزادی حاصل کرنے کو تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے لیکن علاوہ دین کے اس مقصد کے دنیا کے کسی مقصد کے لیے اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔

اس جنگ کا نام اسلام نے جہاد رکھا ہے اور جس پر روحانی ثواب کا وعدہ ہے اور یہ لڑائی ہرگز ناانصافی اور ظلم پر مبنی نہیں ہے اور نہ اخلاق کے خلاف ہے اور نہ قانونِ قدرت اور فطرتِ انسانی کے مخالف ہے۔

آغازِ جنگ کے بعد تلوار ہر ایک کی دوست ہوتی ہے۔ ثابت قدمی، بہادری، شہادت کا جذبہ اسی جنگ کی جان ہوتا ہے۔ اگرچہ عیسائیوں نے اس جنگ کو، ان آیتوں کے مفہوم کو خوں ریزی اور خوں خواری سے منسوب کیا ہے یہ ان کا قصور ہے اسلام کے اصول نہیں۔

سرسید نے سورۃ البقرہ کی تفصیل میں مسئلہ جہاد سے متعلق اجمال بیان کیا ہے مگر سورۃ انفال اور سورۃ توبہ کی تفسیر میں اس بحث کو نئے سرے سے اہتمام سے اٹھایا ہے اور اپنی تفسیر کی چوتھی جلد نصف کے قریب اس مسئلے کی تحقیق پر لکھی ہے۔

مثال ۲۔ علاوہ جہاد کے معراج کے مسئلے پر بھی سرسید نے تفصیل سے بحث کی ہے جو تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا حالی نے اس کا خلاصہ اور لب لباب لکھا ہے۔ اور معراج کے واقعہ کو عقلی دلائل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

تیسری خصوصیت

سرسید کی تفسیر کی تیسری خصوصیت پر مولانا حالی نے روشنی ڈالی ہے اس طرح

کہ اس تفسیر میں قدیم تفاسیر کے مقابلہ میں روایات کی طرف بغیر ضرورت بہت کم رجوع کیا گیا ہے جب کہ قدیم تفاسیر محققین اسلام کے اتفاق کے مطابق عموماً بے سند اور موضوع وضعیف حدیثوں اور یہودیوں کے قصوں سے پر ہیں۔

چوتھی خصوصیت

سرسید کی تفسیر کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس تفسیر میں قدیم مفسرین کی تفاسیر کی آیتوں کے متعلق تمام اقوال مختلفہ نقل کر کے ناظرین کے ذہن کو منتشر نہیں کیا بلکہ جو قول راجح معلوم ہوا صرف اس کو ذکر کیا۔ اور باقی مرجوح اقوال کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ اور اگر کہیں کیا تو اس قول کی کمزوری اور ضعف بیان کر دیا۔ آج کل ایسی تفسیریں جن میں قرآن کے معنی معین نہیں کیے جاتے اور بہت سے اقوال احتمالات نقل کیے جاتے ہیں بعض لوگوں کے دل میں شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں۔ خصوصاً موجودہ ذہنوں کے لیے جو تقلید کی قید سے آزاد ہیں۔ مفسّر کے تبحر علمی کے اعتراف کے بجائے دوسرے شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس وقت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ تفاسیر میں متعدد اقوال اور مختلف رائے بیان کر کے ان کو چھوڑ دیا جائے۔ اور قرآن کے معنی نہ متعین کیے جائیں۔

پانچویں خصوصیت

پانچویں خصوصیت مولانا حالیؔ نے بھی اپنی تصنیف حیات جاوید میں بہت اہمیت کے ساتھ اپنے علم کے مطابق واضح کی ہے وہ سرسید کی پہلی اور عظیم کوشش ان شبہات کو دور کرنے کی ہے جو علوم جدیدہ کی تعلیم سے قرآن مجید کے بعض مضامین کی نسبت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس تفسیر کے ذریعہ ان کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں جو بلیغ طریقہ اختیار کیا ہے اس کا پورا پورا اندازہ خود ان کی تفسیر کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے کیونکہ علوم جدیدہ کے اعتراضات کی رد کی گئی ہے اور

بہت سے مفسرین کے مسلک اور طریقہ سے ہٹ کر ایک نیا انداز اپنایا ہے۔ ہر ایک آیت کے معنی ایک خاص اپنے اصول کے موافق بیان کیے ہیں اس لیے یہ ناممکن تھا کہ مفسر کے بیان میں لغزشیں اور کوتاہیاں نہ ہوتیں۔ لیکن ان خامیوں کی وجہ سے تمام تفسیر کی مجموعی خوبی اور سرسید کی کاوشوں کو زائل بھی نہیں کیا جا سکتا بلکہ انصاف کا عین مقتضا یہ ہے کہ اگر تمام تفاسیر میں ایک آیت کے معنی بھی اسلوب قرآن اور اصول عربیت کے موافق ایسے بیان کیے گئے ہوں جن کی رو سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے اور یقینی طور پر رفع ہوتا ہو اور اس سے قبل مفسرین نے اس طویل عرصہ میں اس پر توجہ نہ دی ہو اور ان پر روشنی نہ ڈالی۔ اس مفسر کی عظمت کا معترف ہوتے ہوئے بلاشبہ تسلیم کرنا چاہیے کہ اس مخلصانہ جدوجہد کا نتیجہ ایک کامیاب شکل میں ذہنوں کو مطمئن کر دیتا ہے۔ اس روشنی میں سرسید کی اس محنت کو خلوص اور نیک نیتی کو ان علماء نے بھی تسلیم کیا ہے جن کو سرسید کی تفسیر میں لغزشوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ اگر اس کا تعلق قرآن کریم کی نزاکت اور باریکیوں سے نہ ہوتا اور اس کی جگہ سرسید کسی اور عنوان سے مذہب اسلام کے دلائل عقلی طور پر پیش کرتے تو یقیناً تاریخ اسلام کا ایسا شاہکار ہوتا جس کی مثال ملنی مشکل ہوتی اور اب بھی ان کی علمی اور عملی خدمات کا فیض ماضی حال اور مستقبل میں اس طرح جاری ہے کہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہوگا جہاں سرسید کے گلشن درسگاہ کا پھول نہ کھلا ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کا مختصر جائزہ

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی شخصیت علم و ادب کا ایسا عظیم مخزن تھی جس کی عظمت کا اعتراف ایسے دانشوروں نے کیا جو خود اپنی ذات سے فاضل، ادیب اور مصنف وقت تھے۔

مولانا کی علمی سیاسی خدمات کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہاں ان کا مرتبہ ان کی مشہور تصنیف ترجمان القرآن کی روشنی میں معین کرنا ہے۔

مولانا خاندانی اعتبار سے ایسے مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو علوم دینیہ حدیث و قرآن سے وابستہ تھا۔ اس لیے اپنی استعداد کے علاوہ یہ علوم ان کو ورثہ میں ملے تھے۔ خود فطری طور پر مولانا بچپن ہی سے ہی بہت ذہین اور اعلیٰ دماغ کے مالک تھے۔ قدرت نے ان کو دین و دنیا دونوں کے فہم کی صلاحیتیں اعلیٰ پیمانے پر ودیعت کی تھیں۔ ان کے اجداد میں شیخ جلال الدین کا نام آتا ہے جو ظاہری باطنی کمالات سے آراستہ تھے۔ مولانا آزادؒ کے والد مولانا خیرالدین کی ذات دوسروں کے لیے وعظ و تقریر، تصنیف و تالیف اور روحانی فیوض برکات کا ایک بڑا سرچشمہ تھی۔

علوم دینیہ سے فطری مناسبت کے ساتھ مولانا آزادؒ کا مزاج محض تقلیدی نہ تھا بلکہ تحقیقی، ادبی انداز کا حامل تھا۔ ان کا وسیع مطالعہ اور علمی ذوق و شوق ان کی تحریروں میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ علمی تشنگی دور کرنے کے لیے انھوں نے تحقیق و جستجو کے جن مشکل مراحل کو طے کیا ہے، اس کا اظہار انھوں نے اپنی کتاب "آزاد کی کہانی" میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"میرا دل شکوک و اضطراب سے لبریز تھا اور میں واقعی برہان و یقین کے لیے تشنہ تھا۔" [۱]

آٹھ سال کی عمر میں اُن کے حافظے اور ذہانت کا یہ عالم تھا کہ اپنے والد کے مرید حاجی مصلح الدینؒ کو قرآن کریم کی آیت لَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا الخ کی تفسیر کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات، اُن کے کوہِ طور پر جانے کی تفصیل کو ایک گھنٹے تک سنایا۔ بچپن کے اس واقعہ سے مولاناؒ کے تفسیر قرآن سے شغف اور گہری دلچسپی اور صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی تفسیر "ترجمان القرآن" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورت، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں طے کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں۔ تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا ایک بڑا حصہ میری نظر سے گذر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کی طرف سے ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔

اس تمام عرصہ کی جستجو و طلب کے بعد قرآن کو جیسا کچھ اور جتنا سمجھ سکا ہوں میں نے اس کو کتاب کے صفحوں پر پھیلا دیا ہے۔" [۲]

مولاناؒ نے ترجمان القرآن کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے خصوصیت سے ترجمان القرآن کی ان خصوصیات کی طرف توجہ دلائی ہے جس پر ان کی گہری نظر رہی ہے۔ مثال کے طور پر قرآنِ کریم کا ترجمہ اور اس کا اسلوب ہے۔ اس اندازِ بیان اور اسلوب میں وہ تمام خصوصیات جو گہرائی سے مطالعہ کرنے والے کے سامنے قرآنِ کریم کے حقائق رموز و اسرار کو بے نقاب کرتے جائیں گے۔

---

[۱] آزاد کی کہانی، مولانا آزاد، ص ۳۷۵، بحوالہ مولانا آزاد "فکر و فن" "ڈاکٹر ملک زادہ منظور"، ص ۲۵۵

[۲] دیباچہ ترجمان القرآن، ص ۶۰-۶۷

مولانا دیباچہ میں ہی دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"تفسیر کی ایک سطر پورے ایک صفحہ بلکہ بعض حالات میں پورے مقالے کے قائم مقام ہے۔ اکثر مقامات پر ایسا ہوا ہے کہ معارف و مباحث کا پورا ایک دفتر دماغ میں پھیل رہا تھا مگر نوک قلم پر پہنچا تو ایک سطر یا ایک جملہ بن کر رہ گیا۔" [1]

مولاناؒ کے ترجمہ و تفسیر کی خوبی یہ ہے کہ ایسا انداز اختیار کیا ہے جو ادبی ہونے کے ساتھ شانِ خداوندی کے جلال و عظمت کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم کی چند آیات کا ترجمہ اس طرح ہے:

"اے گروہِ جن و انس ہم اس دن پوچھیں گے کہ تم جو اپنی گمراہیوں کا آج اعتراف کر رہے ہو کیا تمھارے پاس ہمارے پیغمبر جو تم ہی میں سے تھے نہیں آئے تھے؟ ہماری آیتیں تمھیں نہیں سُنائی تھیں؟ اور آج کے دن جو تمھیں پیش آیا ہے، انھیں ڈرایا تھا؟" وہ عرض کریں گے ہم اپنے اوپر آپ گواہی دیتے ہیں کہ بلاشبہ آئے تھے اور انھوں نے ہمیں سب کچھ بتایا تھا پر ہم نے ان کا کہا نہ مانا، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی نے انھیں فریب میں ڈال دیا تھا۔ اب وہ خود ہی اپنے خلاف گواہ ہو گئے کہ بلاشبہ سچائی سے انکار کرنے والے تھے۔ اے پیغمبرؐ! یہ پیغمبروں کا ظہور اور دعوتِ حق کا اعلان اس لیے ہوا کہ تمھارے پروردگار کا یہ ڈھنگ نہیں کہ وہ ناانصافی سے بستیوں کو ہلاک کر دے اور وہاں کے رہنے والے (راہِ حق سے) بے خبر ہوں اور قانونِ الٰہی کی رو سے سب کے الگ الگ درجے ہیں ان کے کاموں کے مطابق اور

[1] دیباچہ ترجمان القرآن، جلد اوّل

انھیں درجوں کے مطابق نتائج پیش آتے ہیں اور جیسے کچھ انسان کے کام ہیں۔ تمھارا پروردگار ان سے غافل نہیں۔" [1]

مولانا آزاد کے مندرجہ بالا ترجمہ سے ترجمہ کی فصاحت و بلاغت کے علاوہ قرآن کا ترجمہ سہل طریقہ سے کرنے کی خصوصیت ملتی ہے کیونکہ مولانا سے پہلے کی قدیم تفاسیر و ترجمے مشکل انداز میں ہوئے تھے۔ ہر عہد کے اثرات ان پر اس قدر گہرے تھے کہ بقول مولانا آزاد:

"بعض صورتوں میں تو پردوں کی اتنی تہیں جمع ہو گئی تھیں کہ ایک کے بعد ایک اٹھاتے چلے جاوَ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ کا عالم دکھائی دے گا۔" [2]

دراصل یہودیوں کے قصص و روایات اور اسرائیلی تصوّر نے ہمارے یہاں کی بعض تفسیروں کو اس قدر گنجلک اور پیچیدہ کر دیا کہ ان کا سمجھنا مشکل تھا اور عام اس کو مستند سمجھنے لگے جس کے نتیجہ میں قرآن کا صحیح اور اصلی طریقۂ استدلال پیچیدگیوں میں گم سا ہو گیا اور قرآنِ کریم کے دلائل و براہین کی تمام صداقتیں تصنّع اور بناوٹ کی نذر ہو گئیں۔ مولانا آزادؒ کے خیال میں قرآنِ کریم کی تفسیر کے لیے ادب کا صحیح ذوق عربی لغت پر عبور شرطِ اوّل ہے۔ مولانا خود کیونکہ اس دَور سے گذر رہے تھے جن کے سامنے قدیم راہیں بھی تھیں، دوسری طرف عہدِ جدید کے تقاضے بھی۔ ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے تفسیرِ قرآن میں ایسی میانہ روی اختیار کرنے کی پوری کوشش کی جہاں اپنے اسلاف کی خدمات بھی نظر انداز نہ ہو اور عہدِ جدید کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں۔

مولانا آزاد عقل اور عشق دونوں کے قائل تھے اور دونوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ بقول (دیو، این، دھیر) ان کی ذات دو زمانوں، دو تہذیبوں اور دو مہتم بالشان ملتوں کے درمیان ایک نقطۂ وصل تھی۔ [3]

[1] ترجمان القرآن جلد دوم، ص ۲۹
[2] ترجمان القرآن، جلد اول، ص ۴۶
[3] مولانا ابوالکلام آزاد "فکر و فن" ص ۳۷

toobaa-elibrary.blogspot.com

درحقیقت مولانا آزاد ان علماء میں سے تھے جو اپنے اسلاف کے لیے باعثِ فخر تھے اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسے عالم تھے جن کے نقوش پر چل کر دین و دنیا کی راہوں کو پہچاننے کی اور سمجھنے میں نئی نسل کی مدد ملتی ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ ان کے بارے میں تحریر ہے:

"ان کے اندر ابنِ تیمیہؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، ابنِ قیمؒ، شمس الائمہ سرخسیؒ اور امیہ بن عبدالعزیزؒ اندلسی کی روح کے ساتھ جمال الدین افغانی اور عبدہ کی پرجلال اور پُرعزیمت شخصیتوں کی پرچھائیاں موجود تھیں[1]"

اور بقول جواہر لال نہرو!

"وہ ان قاموسیوں کی یاد دلاتے تھے جو انقلاب فرانس سے کچھ عرصہ پہلے موجود تھے[2]"

مولانا آزاد کتاب و سنت کی روشنی میں اسلام کو اس کی اصل شکل میں پیش کرنا چاہتے تھے اور یہی شاہ ولی اللہؒ تحریک کا بھی اصل مقصد تھا۔

مولاناؒ کے نزدیک قرآن کے استدلال کا پہلا اصول عقل و فکر کی دعوت ہے حقیقت تک پہنچنے کے لیے انسان خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لے تاکہ اسلام کی بنیادی حقیقت اس کے ذہن و دل میں اتر جائے اور پھر وہ محسوس کر گیا کہ پوری کائنات کے نظام میں ایسی ترتیب اور نظام قائم ہے جو ایک خالق ابدی کا مقصد اور وجود اور ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس طرح خدا پرستی کا عقلی تصور اسلام کا عظیم کارنامہ ہے۔

قرآنِ کریم عقل انسانی کے لیے ایسی دلیلیں اور صحت پیش کرتا ہے جو انسان کے وجدان کو بیدار کر کے صحیح شعور دے سکتا ہے۔

قرآن خود انسان کو فطرت کے ذریعے حقیقت کا معترف کرا دیتا ہے کیونکہ انسان بہت

[1-2] مولانا ابوالکلام آزاد، "فکر و فن" ص ۳۷۱

کچھ کرنے کی طاقت رکھتا ہے مگر فطرت کے خلاف جنگ نہیں کر سکتا۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جو چیزیں جتنی حقیقت سے زیادہ قریب ہوتی ہیں اتنی ہی زیادہ سہل اور دل نشین بھی ہوتی ہیں اور الجھاؤ بناوٹ اور تکلف سے پیدا ہوتا ہے[1] لہٰذا سچائی اور حقیقت میں سادگی اور دل نشینی کا معاملہ ہوتا ہے اور دل نشینی کی انتہا یہ ہے کہ جب کوئی ایسی بات سامنے آجائے جس میں ذہن اجنبیت نہ محسوس کرے اور دل میں اتر جائے، دماغ قبول کرے تو ایسی بات کی صداقت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

مولانا آزادؒ نے ترجمان القرآن کے اندازِ بیان میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ اندھی تقلید، اسرائیلی روایات اور یہودی خرافات کا غبار بالکل صاف ہو جائے۔ اس لیے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں ایک جگہ انھوں نے یہ اظہار کیا ہے:

"ہم نے یہ مطلب اس سادہ طریقہ سے بیان کر دیا جو قرآن کے بیان و خطاب کا طریقہ ہے[2]"

مولانا آزادؒ کی نثر کس قدر اعلیٰ ادبی طرز اور انفرادی انداز کی حامل ان کی دوسری تصنیفات مکتوبات الہلال وغیرہ میں ملتی ہے جو اس فصاحت اور بلاغت اور قارئین پر اثر انداز ہونے میں بے حد اثر رکھتی ہے۔ مگر وہی مولانا آزاد جب ترجمان القرآن میں اپنا طرزِ تحریر سادہ اور پُراثر اختیار کر لیتے ہیں تو یقین نہیں آسکتا کہ یہ وہی نثر نگار ہے کیونکہ ترجمان القرآن کا مقصد درس قرآن کی عالمگیر تعلیم و اشاعت تھا[3]۔

عالمگیر اشاعت کا تقاضا یہ تھا کہ اندازِ بیان صاف اور واضح ہو۔ اس لیے انھوں نے ایک جگہ خود تحریر کیا ہے:

"میں نے تجربہ کے لیے سورہ بقر کا مجرد ترجمہ ایک پندرہ برس کے لڑکے

---

[1] ترجمان القرآن، جلد اول ص۲۸ (تفسیر سورہ فاتحہ) مطبع جید برقی پریس دہلی، سنِ طباعت ۱۳۵۰ھ

[2] ترجمان القرآن، جلد اول، ص۷۹

[3] ابوالکلام "فکر و فن" ص۳۷۵

toobaa-elibrary.blogspot.com

کو دیا جو اُردو کی آسان کتابیں روانی کے ساتھ پڑھ لیتا ہے، پھر ہر موقع پر سوالات کر کے جانچا گیا۔ جہاں تک مطلب سمجھنے کا تعلق ہے وہ ایک مقام پر بھی اٹکا اور تمام سوالوں کے جواب دیتا گیا۔ پھر ایک دوسرے شخص پر تجربہ کیا جس نے بڑی عمر میں لکھنا پڑھنا سیکھا ہے اور ابھی اس کی استعداد اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اُردو کے تعلیمی رسائل بہ آسانی پڑھ لیتا ہے۔ یہ تین جگہ تین فارسی لفظوں پر اٹکا، لیکن مطلب سمجھنے میں اسے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ میں نے وہ الفاظ بدل کر نسبتاً سہل الفاظ رکھ دیئے[1]۔"

مولانا آزاد اپنی علمی قابلیت اور ادبی انشاء پردازیوں کے باوجود قرآن کریم کی وضاحت کے لیے بہت سادہ اور حقیقی مفہوم اور معانی کے قائل رہے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ ہر مفسر اپنے عہد کے تاثرات میں گِھرا ہوا ہونے کی وجہ سے اپنے ذاتی تاثرات کا پردہ معانی پر ڈال دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقت دبیز پردوں کی دھندلی ہوتی چلی جاتی ہے جیسا کہ انھوں نے اصول ترجمہ تفسیر پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر قرونِ اخیرہ تک جس قدر مفسرین پیدا ہوئے ان کا طریق تفسیر ایک روبہ تنزل معیارِ فکر کی مسلسل زنجیر ہے جس کی ہر پچھلی کڑی پہلی سے پست تر اور ہر سابق سے بلند تر واقع ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں جس قدر اوپر کی طرف بڑھتے جاتے ہیں حقیقت زیادہ واضح زیادہ بلند اور اپنی قدرتی شکل میں نمایاں ہوتی جاتی ہے اور جس قدر نیچے اترتے آتے ہیں حالت برعکس ہوتی جاتی ہے[2]۔"

پھر انھوں نے اس کا اندازہ لگانے کے لیے مثال کے طور پر ایک مقام سورہ بقرہ کی

---

[1] دیباچہ ترجمان القرآن، جلد اول، ص۲۳

[2] ؍؍ ؍؍ ص۶۵ مطبع حمید برقی پریس دہلی سن طباعت ۱۳۵۰ھ

ابتدائی آیتوں کا حوالہ دیا ہے۔

سورہ بقرہ کی ابتدائی آیتوں کی نسبت حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ:

"اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ سے مقصود عرب کے اہلِ ایمان ہیں اور وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ سے اہلِ کتاب کے اہلِ ایمان۔ امام ابن جریرؒ نے بھی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ لیکن بعد کے مفسرین اس پر قانع نہیں ہوئے اور عجیب عجیب دور از کار کاوشیں پیدا کر دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سب سے پہلے ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے مطلب کی نشست بگڑی، پھر قرآن نے تین گروہوں کی تقسیم کر کے جس حقیقت پر زور دیا تھا اس کی ساری خوبی اور موزونیت گم ہو گئی ہے[1]۔"

اسی طرح نومسلم اقوام کے قصص و روایات اول دن سے پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں سے اسرائیلیات کو (یعنی یہودیوں کے قصص و خرافات) ہمیشہ محققین نے چھانٹنا چاہا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان عناصر کے مخفی اثرات دور دور تک سرایت کر چکے تھے وہ برابر جسم تفسیر میں پیوست رہے۔

اس طرح مولانا آزادؒ نے جگہ جگہ اپنی تفسیر کی ابتداء سے قبل تاریخ تفسیر پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے ان وجوہات اور اسباب کو ترتیب وار چودہ نمبر تک ڈال کر بیان کیا جس کو مختصراً آگے پیش کیا جائے گا۔

بعض اسباب و مؤثرات جو فہم حقیقت میں مانع ہیں[2]

قرآنِ کریم کے مقدمہ تفسیر میں مولانا آزادؒ نے وہ رکاوٹیں جو قرآن کریم کو سمجھنے میں

---

[1] دیباچہ ترجمان القرآن جلد اول ص۶۹ مطبع جید برقی پریس دہلی سن طباعت ۱۳۵۰ھ

[2] ترجمان القرآن، مقدمہ ص۶۶، مولانا ابوالکلام آزاد

میں پیش آتی ہیں ان کو دور کرنے اور قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے کچھ اصول پیش کیے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ قرآنِ حکیم اپنے وضع، اپنے اسلوب، اپنے اندازِ بیان، اپنے طریقِ خطاب، اپنے طریقِ استدلال غرضکہ اپنی ہر بات میں دنیا کے وضعی اور صناعی طریقوں کا پابند نہیں ہے اور نہ اُسے پابند رہنا چاہیے۔ وہ اپنی ہر بات میں اپنا بے مثل اور فطری طریقہ رکھتا ہے اور یہی وہ بنیادی امتیاز ہے جو انبیاء علیہم السلام کے طریقِ ہدایت کو علم وحکمت کے وضعی طریقوں سے ممتاز کردیتا ہے۔

قرآن جب نازل ہوا تو اس کے مخاطبوں کا پہلا گروہ بھی ایسا ہی تھا، تمدن کے وضعی اور صناعی سانچوں میں اس کا دماغ نہیں ڈھلا تھا اور فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت پر قانع تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن اپنی شکل ومعنی میں جیسا کچھ واقع ہے ٹھیک ویسا ہی دلوں میں بس گیا اور اسے قرآن کے فہم ومعرفت میں کسی طرح کی بھی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ صحابہ کرامؓ پہلی مرتبہ قرآن کی کوئی آیت یا صورت سنتے تو اس کی حقیقت کو پالیتے تھے۔ لیکن صدرِ اول کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ روم وایران کے تمدن کی ہوائیں چلنے لگیں اور علوم وفنون وضعیہ شروع ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا ذوق بڑھتا گیا۔ قرآن کے فطری اصولوں سے طبیعتیں آشنا ہوتی گئیں، رفتہ رفتہ وہ وقت آگیا کہ قرآن کی ہر بات وضعی اور صناعی طریقوں کے سانچوں میں ڈھالی جانے لگی چونکہ ان سانچوں میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھیں اس لیے طرح طرح کے الجھاؤ پیدا ہونے لگے اور جس قدر کوششیں سلجھانے کی کی گئیں اور زیادہ الجھاؤ بڑھتے گئے۔

فطرت سے جب بُعد ہوجاتا ہے اور وضعیت کا استغراق طاری ہوجاتا ہے تو طبیعتیں اس پر راضی نہیں ہوتیں کہ کسی بات کو اس کی قدرتی سادگی میں دیکھیں وہ سادگی کے ساتھ حسن وعظمت کا تصور کر ہی نہیں سکتیں وہ جب کسی بات کو بلند اور عظیم دکھانا چاہتی تو کوشش کرتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ وضعیت اور صناعیت کے پیچ وخم پیدا کردیں۔ یہی معاملہ قرآن کے ساتھ پیش آیا۔ سلف کی طبیعتیں وضعی طریقوں میں نہیں ڈھلی تھیں اس لیے

وہ قرآن کی سیدھی سادی حقیقت بے ساختہ پہچان لیتے تھے لیکن خلف کی طبیعتوں پر یہ بات شاق گذرنے لگی کہ قرآن اپنی سیدھی سادی شکل میں نمایاں ہو، ان کی وضعیت پسندی اس پر قانع نہیں ہوسکتی تھی۔ انھوں نے قرآن کی ہر بات کے لیے وضعیت کے جامے تیار کرنے شروع کردیے اور چونکہ یہ جامہ اس پر راست نہیں آسکتا تھا اس لیے بہ تکلف پہنانا چاہا، نتیجہ یہ نکلا کہ حقیقت کی موزونیت باقی نہ رہی ہر بات ناموزوں اور الجھی ہوئی بن کر رہ گئی۔

تفسیرِ قرآن کا پہلا دور وہ ہے جب علومِ اسلامیہ کی تدوین وکتابت شروع نہیں ہوئی تھی، دوسرا دور تدوین وکتابت سے شروع ہوتا ہے اور اپنے مختلف عہدوں اور طبقوں پر آگے آتا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ابھی دوسرا دور شروع ہی ہوا تھا کہ یہ جامہ قرآن کے لیے بننا شروع ہو گیا لیکن اس کا منتہائے بلوغ فلسفہ وعلوم کی ترویج واشاعت کا آخری زمانہ ہے۔ یہی زمانہ ہے جب امام فخر الدین رازیؒ نے تفسیرِ کبیر لکھی اور پوری کوشش کی کہ قرآن کا سراپا اس مصنوعی لباس وضعیت میں سرتاپا پوشیدہ ہوجائے۔ اگر امام صاحب کی نظر اس حقیقت پر ہوتی تو ان کی پوری تفسیر نہیں تو دو تہائی حصہ یقیناً بیکار ہوجاتا۔

بہرحال یاد رہے وضعیت کے سانچے جتنے ٹوٹتے جائیں گے قرآن کی حقیقت ابھرتی جائے گی۔ قرآن کے اسلوبِ بیان کی نسبت لوگوں کو جس قدر مشکلیں پیش آئیں محض اس لیے کہ وضعیت کا استغراق ہوا اور فطریت کی معرفت باقی نہیں رہی۔ قرآن کے مختلف حصوں اور آیتوں کے مناسبات وروابط کے سارے الجھاؤ صرف اس لیے ہیں کہ فطریت سے بُعد ہو گیا اور وضعیت ہمارے اندر بسی ہوئی ہے۔

قرآن کی زبان کی نسبت بحثوں کا جس قدر انبار لگادیا گیا ہے وہ بھی محض اس لیے ہے کہ فطریت کے سمجھنے کی ہم میں استعداد نہیں ہے۔ نہیں رہی۔

قرآن کی بلاغت کا مسئلہ ہمارے وجدان کے لیے اس قدر سہل مگر ہمارے دماغ کے لیے اس قدر دشوار کیوں ہو رہا ہے صرف اس لیے کہ وضعیت کا خود ساختہ ترازو ہمارے ہاتھ میں ہے اور ہم چاہتے ہیں اسی سے قرآن کی بلاغت بھی وزن کریں قرآن کا طریق

استدلال کیوں نمایاں نہیں ہوتا؛ اسی لیے کہ وضعیت کے استغراق نے منطق کا سانچہ ہمیں دیدیا ہے اور چاہتے ہیں قرآن کے دلائل و براہین بھی اسی میں ڈھالے جائیں۔ غرضکہ جس گوشہ میں جاؤ گے اس اصل کو سامنے پاؤ گے۔

۲۔ جب کسی کتاب کی نسبت یہ سوال پیدا ہوا اس کا مطلب کیا ہے؟ تو قدرتی طور پر ان لوگوں کے فہم کو ترجیح دی جائے گی جنھوں نے خود صاحبِ کتاب سے مطلب سمجھا ہو۔ قرآن تیئیس ۲۳ برس کے اندر بتدریج نازل ہوا، وہ جس قدر نازل ہوتا تھا صحابہ کرامؓ سنتے تھے نمازوں میں دہراتے تھے اور جو کچھ پوچھنا ہوتا تھا خود پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھ لیتے تھے۔ اُن میں سے بعض افراد خصوصیت سے فہم قرآن میں ممتاز ہوئے خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شہادت دی۔ مذہبی خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں بلکہ قدرتی طور پر ان کے فہم کو بعد کے لوگوں کے فہم پر ترجیح ہونی چاہیے، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں سمجھا گیا۔ بعد کے لوگوں نے اپنے اپنے عہد کی فکری موثرات کے ماتحت نئی نئی کاوشیں شروع کردیں۔ اور صریح سلف کی تفسیر کے خلاف ہر گوشہ میں قدم اٹھادیے گئے۔ کہا گیا "سلف ایمان میں قوی ہیں لیکن علم میں خلف کا طریقہ قوی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ روز بروز حقیقت مستور ہوتی گئی اور اکثر گوشوں میں ایک صاف بات الجھتے الجھتے بالکل ناقابلِ حل بن گئی۔

آفت پر آفت یہ ہوئی کہ پہلے ایک کمزور پہلو اختیار کیا گیا، پھر بڑھتے بڑھتے دور تک نکل گئے۔ پھر جب مشکلوں سے دوچار ہوئے تو نئی نئی بحثوں اور کاوشوں کی عمارتیں اٹھانے لگے۔ متون، شروح، حواشی اور منہیات و تعلیقات کا طریقہ یہاں بھی چلا اس لیے اور زیادہ الجھاؤ میں الجھاؤ ڈالے اور بعض صورتوں میں تو پردوں کی اتنی تہیں جمع ہوگئیں کہ ایک کے بعد ایک اٹھاتے چلے جاؤ "ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" کا عالم دکھائی دے گا۔

اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے قرآن کا کوئی ایک مقام لے لو۔ پہلے اس کی تفسیر صحابہؓ و تابعینؒ کی روایات میں ڈھونڈو، پھر بعد کے مفسرین کی طرف رُخ کرو اور دونوں

کا مقابلہ کرو صاف نظر آجائے گا کہ صحابہؓ و سلف کی تفسیر میں معاملہ بالکل واضح تھا۔ بعد کی بے محل دقیقہ سنجیوں نے اُسے کچھ سے کچھ بنادیا، اور الجھاؤ پیدا ہوگئے۔ مثلاً سورہ بقرہ کی ابتدائی آیتوں کی نسبت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ الخ سے مقصود عرب کے اہلِ ایمان ہیں اور وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ الخ سے اہلِ کتاب کے اہلِ ایمان۔ امام ابن جریرؒ نے بھی یہی تفسیر اختیار کی، لیکن بعد کے مفسرین اس پر قانع نہیں ہوئے اور عجیب عجیب دوراز کار بحثیں پیدا کردیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سب سے پہلے ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے مطلب کی نشست بگڑی۔ پھر قرآن نے تین گروہوں کی تقسیم پر زور کر کے جس حقیقت پر زور دیا تھا اس کی ساری خوبی اور موزونیت گم ہوگئی۔

(۳) نومسلم اقوام کے قصص و روایات اوّل دن سے پھیلنا شروع ہوگئے تھے ان میں سے اسرائیلیات کو یعنی یہودیوں کے قصص و خرافات کو ہمیشہ محققین نے چھانٹنا چاہا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان عناصر کے مخفی اثرات دور دور تک سرایت کرچکے تھے اور وہ برابر جسمِ تفسیر میں پیوست رہے

۴۔ ایک طرف تو صحابہؓ و سلف کی روایات سے تغافل ہوا، دوسری طرف روایاتِ تفسیر کے غیر محتاط حامیوں نے الگ الگ آفت بپا کردی اور ہر تفسیر جس کا سرا کسی نہ کسی تابعی سے ملادیا گیا، سلف کی تفسیر سمجھ لی گئی۔ متاخرین میں صرف عمادالدین ابن کثیر تنہا مفسر ہیں جو احادیث کے التزام کے ساتھ نقدِ روایات کا بھی لحاظ رکھتے ہیں اور حتی الوسع اس سے تغافل نہیں کرتے۔

۵۔ اس صورتِ حال کا سب سے زیادہ افسوسناک نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کا طریقِ استدلال دوراز کار دقیقہ سنجیوں میں گم ہوگیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کے تمام بیانات کا محور و مرکز اس کا طریقِ استدلال ہی ہے۔ اس کے ارشادات و بصائر اس کے قصص و امثال، اس کے مواعظ و حکم، اس کے مقاصد و مہمات سب اُسی چیز سے کھلتے اور اُبھرتے

سمجھے۔ یہ ایک چیز کیا گم ہوگئی گویا اس کا سب کچھ ہی گم ہوگیا۔

ہمیں ورق کہ سیہ گشت مدعا ایں جاست

انبیاءِ کرام کا طریقِ استدلال یہ نہیں ہوتا کہ منطقی طریقہ پر نظری مقدمات ترتیب دیں، پھر ان کی بحثوں میں مخاطب کو الجھائیں۔ وہ براہِ راست تلقین واذعان کا فطری طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ ہر دماغ وجدانی طور پر پا لیتا ہے، اور ہر دل قدرتی طور پر۔ لیکن ہمارے مفسرین متکلمین کو فلسفہ منطق کے انہماک نے اس قابل ہی نہ رکھا کہ کسی حقیقت کو اس کی سیدھی سادی شکل میں دیکھیں اور قبول کرلیں۔ انھوں نے انبیاء کرام کی فضیلت اس میں سمجھی کہ انھیں منطقی بنادیں، اور قرآن کی عظمت اس میں نظر آئی کہ اس کی ہر بات ارسطو کی منطق کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نکلے۔ اس سانچے میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے دلائل وبراہین کی ساری خوب روئی اور دل نشینی نظروں سے گم۔ حقیقت تو گم ہو ہی چکی تھی لیکن وہ بات بھی نہ بنی جو یہ لوگ بنانی چاہتے تھے۔ شکوک وایرادات کے بے شمار دروازے کھل گئے۔ جن کے کھولنے میں تو امام رازیؒ کا ہاتھ بہت تیز نکلا لیکن بند کرنے میں کچھ تیزی نہ دکھلا سکے۔

(۶) یہ آفت صرف طریقِ استدلال ہی میں پیش نہیں آئی بلکہ تمام گوشوں میں پھیلی۔ منطق وفلسفہ کے مباحث نے طرح طرح کی نئی مصطلحات پیدا کردی تھیں اور عربی لغت کے الفاظ ان مصطلحہ معانی میں مستعمل ہونے لگے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا موضوع فلسفۂ یونانی نہیں ہے اور نہ نزولِ قرآن کے وقت عربی زبان ان مصطلحات سے آشنا ہوئی تھی۔ پس جہاں کہیں قرآن میں وہ الفاظ آئے ہیں ان کے معانی وہ نہیں ہوسکتے جو وضعِ مصطلحات کے بعد قرار پا گئے ہیں۔ لیکن اب ان کے وہی مفہوم لیے جانے لگے اور اس کی بنا پر طرح طرح کی دور از کار بحثیں پیدا کردی گئیں۔ چنانچہ قدوم حدوث، حلول، احدیت، تثلیث وغیرہم نے وہ معانی پیدا کرلیے جن کا صدرِ اول میں کسی سامع قرآن کو وہم وگمان بھی نہ ہوا ہوگا۔

(۷) اسی تخم کے یہ بھی برگ وبار ہیں کہ سمجھا گیا۔ قرآن کو وقت کی تحقیقات علمیہ کا

ساتھ دینا چاہیے۔ چنانچہ کوشش کی گئی کہ نظامِ بطلیموسی اس پر چپکایا جائے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح آج کل کے دانشوروں کا طریقِ تفسیر یہ ہے کہ موجودہ علمِ ہیئت کے مسائل قرآن پر چپکائے جائیں۔

(۸) ہر کتاب اور تعلیم کے کچھ مرکزی مقاصد ہوتے ہیں اور اس کی تمام تفصیلات انہی کے گرد گردش کرتی ہیں۔ جب تک یہ مراکز سمجھ میں نہ آئیں دائرہ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ قرآن کا بھی یہی حال ہے۔ اس کے بھی چند مرکزی مقاصد ومہمات ہیں جب تک وہ صحیح طور پر نہ سمجھ لیے جائیں اس کی کوئی بات صحیح طور پر نہیں سمجھی جاسکتی۔ تذکرہ صدر اسباب سے جب اس کے مرکزی مقاصد کی وضاحت باقی نہ رہی تو قدرتی طور پر اس کا ہر گوشہ اس سے متاثر ہوا۔ اس کا کوئی بیان، کوئی تعلیم، کوئی استدلال، کوئی خطاب، کوئی اشارہ، کوئی اجمال ایسا باقی نہ رہا جو اس تاثر سے محفوظ ہو۔ افسوس یہ ہے کہ اختصار کا تقاضا مثالیں پیش کرنے سے مانع ہے اور بغیر مثال کے حقیقت واضح نہیں ہوسکتی۔ مثلاً آل عمران کی تفسیر وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ (۱۵) کی تفسیر نکال کر دیکھو کیا کیا دور از کار بحثیں نہیں کی گئیں۔ یہودیوں کے اس قول کی تفسیر میں کہ يَدُ اللهِ مَغْلُولَةٌ (۵: ۴۹) کن کن گوشوں میں نکل گئے اور کس طرح محل بیان اور سیاق وسباق کا صاف صاف مقتضا نظر انداز کردیا گیا۔

(۹) قرآن کی صحتِ فہم کے لیے عربی لغت وادب کا صحیح ذوق شرطِ اول ہے لیکن مختلف اسباب سے جن کی تشریح محتاجِ تفصیل ہے یہ ذوق کمزور ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب مطالب میں بے شمار الجھاؤ محض اس لیے پڑ گئے کہ عربیت کا ذوق سلیم باقی نہیں رہا اور جس زبان میں قرآن نازل ہوا تھا اس کے محاورات ومجازات سے بُعد ہوگیا۔

(۱۰) ہر عہد کا فکری اثر تمام علوم وفنون کی طرح تفسیر میں بھی کام کرتا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخِ اسلام کا یہ پُرفخر واقعہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ علمائے حق نے وقت کے سیاسی اثرات کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے اور کہیں یہ بات گوارا نہیں کی

کہ اسلام کے عقائد و مسائل ان سے اثر پذیر ہوں لیکن وقت کی تاثیر صرف سیاست ہی کے دروازے سے نہیں آتی اس کے نفسیاتی مؤثرات کے بے شمار دروازے ہیں اور جب کھل جاتے ہیں تو کسی کے بند کیے بند نہیں ہو سکتے۔ ان کے استیلاء سے عقائد و اعمال محفوظ رکھے جا سکتے تھے اور علمائے حق نے محفوظ رکھے لیکن دماغ محفوظ نہیں رکھے جا سکتے تھے اور محفوظ نہیں رہے یہاں ضرورت مثالوں کی ہے لیکن اس کی مثالیں تفصیل طلب ہیں اور اختصار کا تقاضا اجازت نہیں دیتا۔

(۱۱) چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہو گیا۔ شواذ و نوادر کے علاوہ عام شاہراہ تقلید کی شاہراہ ہو گئی اُس داءِ عضال نے جسم تفسیر میں پوری طرح سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لیے قدم اٹھاتا تھا کسی پیشرو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا۔ پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ اگر تیسری صدی میں کسی مفسّر سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے۔ کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لیے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے۔ رفتہ رفتہ تفسیر نویسی کی ہمتیں اتنی پست ہو گئیں کہ کسی متداول تفسیر پر حاشیہ چڑھا دینے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ بیضاوی اور جلالین کے حاشیوں کو دیکھ کر ایک بنے ہوئے سکان کی لیت پوت کرنے میں کس طرح قوتِ تصنیف رائیگاں گئی ہے۔

(۱۲) زمانے کی بدذوقی نے ہی ہر بدذوقی کو سہارا دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرونِ اخیرہ میں درس و تداول کے لیے ایسی تفسیریں مقبول ہوئیں جو قدما کے محاسن سے یک قلم خالی تھیں۔ وقت کا یہ سوء انتخاب ہر علم و فن میں جاری رہا ہے۔ جو زمانہ جرجانیؒ پر سکاکیؒ کو اور سکاکیؒ پر تفتازانی کو ترجیح دیتا تھا یقیناً اُس کے دربار سے جلالین ہی کو حسنِ قبول کی سند مل سکتی تھی۔

(۱۳) متداول تفسیر کو اٹھا کر دیکھو جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے وہاں اکثر اُسی قول کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہو گا جو اقوال

نقل کریں گے اُن سے بہتر اقوال موجود ہو گا لیکن اُ سے نظر انداز کر دیں گے۔

(۱۴) اشکال و موانع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھل گیا جس کے اندیشہ سے صحابہؓ و سلفؒ کی روحیں لرزتی تھیں۔ تفسیر بالرائے کو سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں۔ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے یا اس کی تفسیر کرنے میں عقل و درایت کو دخل نہ دیا جائے کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے حالانکہ خود قرآن کا یہ حال ہے کہ اوّل سے لے کر آخر تک تعقل و فکر کی دعوت دیتا ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ تفسیر بالرائے میں رائے بمعنی لغوی نہیں بلکہ رائے "مصطلحہ شارح" ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اُس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔

مثلاً جب باب عقائد میں ردّ و کد شروع ہوئی تو مختلف مذاہب کلامیہ پیدا ہو گئے۔ ہر مذہب کے مناظرین نے چاہا اپنے مذہب پر نصوص قرآنیہ کو ڈھالیں وہ اس کی جستجو میں نہ تھے کہ قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس کی کاوش تھی کہ کسی طرح اپنے مذہب مؤید دکھلائیں اس طرح کی تفسیر، تفسیر بالرائے تھی۔

یا مثلاً مذاہب فقہیہ کے مقلدین میں جب تحزّب و تشیّع کے جذبات تیز ہوئے تو اپنے مسائل کی پچ میں آیاتِ قرآنیہ کو کھینچ تان کرنے لگے۔ اس کی کچھ فکر نہ تھی کہ لغت عربی کے صاف صاف معانی اسلوب و بیان کا قدرتی مقتضا عقل و بصیرت کا واضح فیصلہ کیا کہتا ہے۔ تمام تر کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح قرآن کو اپنے مذہب کے مطابق کر دکھائے۔ یہ طریق تفسیر، تفسیر بالرائے ہے۔

یا مثلاً ایک گروہ متصوفین کا پیدا ہوا اور اپنے موضوع عقائد و اصول پر قرآن کو ڈھالنے لگا۔ قرآن کا کوئی حکم، کوئی عقیدہ، کوئی بیان تحریف معنوی سے نہ بچا یہ تفسیر بالرائے تھی۔

یا مثلاً قرآن کے طریقِ استدلال کو منطقی جامہ پہنانا یا کہیں آسمان اور کواکب نجوم کے الفاظ آ گئے ہیں یونانی علم و ہیئت کے مسائل چپکانے لگنا یقیناً تفسیر بالرائے ہے۔

یا مثلاً آج کل ہندوستان کے اور مصر کے بعض دانشوروں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ انہی کے لفظوں میں زمانۂ حال کے اصول، علم و ترقی قرآن سے ثابت کیے جائیں، یا بقول ان کے فلسفہ و سائنس کو اس کی ہر آیت میں بھر دیا جائے۔ گویا قرآن صرف اسی لیے نازل ہوا ہے۔ جو بات نیوٹن یا ڈارون اور ولیس نے بغیر کسی الہامی کتاب کی فلسفہ اندیشیوں کی دریافت کرلی اُسے چند صدی پہلے معموں اور پہیلیوں کی طرح دنیا کے کانوں میں پھونک دے اور پھر وہ بھی صدیوں تک دنیا کی سمجھ میں نہ آئے۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانے کے مفسر پیدا ہوں اور تیرہ سو برس پیشتر کے معمے حل فرمائیں۔ یقیناً یہ طریقِ تفسیر بھی ٹھیک ٹھیک تفسیر بالرائے ہے[1]

مولاناؒ کے الفاظ میں تحریر کردہ مندرجہ بالا تفسیر قرآن سے متعلق اصول اور وجوہات تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے آنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مولاناؒ نے تفسیر کے سلسلہ میں اس قدر لگن اور کاوش سے اس کا ابتدائی مقدمہ ترتیب دیا ہے کہ ان کی تفسیر کا مطالعہ کرنے والے کا ذہن ان پیچیدگیوں سے دوچار نہ ہو جو مفسر کے مقصد اور مطلب تک نہ پہنچ سکے اور قاری میں بذاتِ خود قرآن کی فہم کی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ براہِ راست قرآنِ کریم کے معانی و مطالب پر اس طرح غور و فکر کر سکے کہ جو قرآنِ کریم کا صحیح مقصد ہے وہ وضاحت سے سامنے آ جائے ایسا نہ ہو کہ قرآن کو اپنے ذہن و خیالات کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر کے اس میں غلط معانی و مطالب نہ پیدا کر دیے جائیں۔

اسی لیے انھوں نے قرآنِ کریم کی ضرورتوں کو تین جگہ تقسیم کیا ہے۔ مقدمہ تفسیر[1]

---

[1] ترجمان القرآن، جلد اول، دیباچہ ص۲۷

تفسیر البیان[2] اور ترجمان القرآن[3]۔

مقدمہ تفسیر میں انھوں نے قرآن مجید کے مقاصد و مطالب پر اصولی بحث کی ہے اور قرآن کے مطالب جامع اور کلی طور پر جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ تفسیر البیان بغور مطالعہ کے لیے اور ترجمان القرآن کا مقصد قرآن کی عالمگیر تعلیم و اشاعت کے لیے۔

غرض مولاناؒ کی تفسیر کی اہم خدمت تاریخ تفسیر کا ایک بیش قیمت حصہ ہے جو ہمیشہ تفسیر قرآن کی تاریخ میں قائم رہے گا۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ٥

(ترجمہ) "اے ہمارے رب ہم پر دار و گیر نہ فرمائیے اگر ہم بھول جاویں یا چوک جاویں اے ہمارے رب ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجیے جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے، اے ہمارے رب اور ہم پر کوئی ایسا بار نہ ڈالیے جس کی ہم کو سہار نہ ہو اور در گذر کیجیے ہم سے اور بخش دیجیے ہم کو اور رحم کیجیے ہم پر، آپ ہمارے کارساز ہیں سو آپ ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجیے"۔

سورۃ البقرہ بیان القرآن، مولانا تھانویؒ

جلد ۱، ص ۱۷۶

تفسیر حقانی

قرآنِ کریم کی تفسیر "تفسیر حقانی" محمد عبدالحق الحقانی دہلویؒ کی مشہور تفسیر مکمل ہے۔ اس تفسیر کا مقدمہ بہت تفصیل سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس مقدمہ میں مولانا عبدالحق نے ان وجوہات کا بھی ذکر کیا ہے جن کی بنا پر انھوں نے اس تفسیر کو مرتب کیا ہے اس میں خود ان کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:۔

"بمصلحتِ وقت مقدمہ تفسیر حقانی کو جس کی وجہ سے ہزاروں گمراہوں کو ہدایت ہوئی ایک ایسے نئے اسلوب میں بدلنا پڑا جو اول سے ہی عمدہ ہے اور جس میں صدہا ضروری مضامین کا اضافہ کرنا پڑا۔ اس لیے اس کا نام بھی "البیان فی علوم القرآن" رکھا گیا"۔ [۱]

اس ضرورت کے علاوہ انھوں نے تفسیر کی ضرورت کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ تفسیر کے دو جزو ہیں ایک نقلی، دوسرا عقلی۔ تفسیر کا دوسرا جزو عقلی بہت مشکل ہے لیکن زمانے کے لحاظ سے اس کی ضرورت بھی ہے۔ مفسرین نے عقلی جزو میں تفسیر کرتے ہوئے بہت افراط و تفریط سے کام لیا ہے اور بعض جگہ بہت زبردست ٹھوکریں کھائی ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے سرسید کی تفسیر "تفسیر القرآن" پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یورپ کے ملحدوں کی تقلید کر کے قرآن مجید کو بالکل محرف کر دیا ہے۔ خرقِ عادت،

---

[۱] تفسیر حقانی، مقدمہ جلد اول ص۱، مفسر مولوی عبدالحقؒ، مطبع دلی پرنٹنگ پریس دہلی۔

نوٹ: تفسیر حقانی کو تفسیر فتح المنان بھی کہتے ہیں۔

معجزات، ملائکہ اور جن و شیطان اور نعمائے جنت و عقوبات دوزخ کا محض انکار کیا گیا ہے اور پیغمبر علیہ السلام کی وحی نزولِ قرآن کو مجنونانہ خیال بتایا ہے اور وجودِ آسمان و اثر دعا و عینیت امور منصوصہ پر مضحکہ کیا ہے [۱]

الغرض اس قسم کی بے اعتدالیاں مفسروں نے کی ہیں خدا ان کو معاف کرے"۔ [۲]

اگرچہ قرآنِ کریم کی تشریح و تفسیر کا سلسلہ نزول قرآن کے بعد سے ہی شروع ہو گیا تھا اور آیاتِ قرآنی کی وہ تشریحات جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائیں احادیث کی شکل میں موجود ہیں۔ کلامِ الٰہی کی وضاحت کا سب سے پہلا ماخذ ہیں۔ اس کے بعد اس سلسلے کو جاری اور قائم رکھنے کے لیے خدا نے اپنے بہت سے بندوں کو قرآنِ کریم کے صحیح معنی اور مطالب سمجھنے کی صلاحیتیں عطا کیں تاکہ دوسروں کو بھی صحیح فکر و فہم قرآن کا سلیقہ آ جائے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود مفسرین کے پیش نظر اہم مسئلہ اپنے دور کا رہا۔ ہر مفسر نے اپنے دور کے لحاظ سے تفسیر کے ان مسائل کو زیادہ واضح کیا جو ضرورت وقت کا تقاضا سمجھے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ تفسیر کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ ہر تفسیر و ترجمہ میں اصل مقصد کو مختلف پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب تفسیر حقانی (تفسیر فتح المنان) لکھی گئی۔ اس وقت دہریت کا زور اور عقلیت پسندی کا چرچا تھا۔ مسلمانوں کو اپنے بچوں کو علم کے حصول کے لیے ایسے اداروں میں بھیجنا پڑا جہاں ملحدانہ خیالات پیدا ہونے کے خدشات تھے۔ ان خدشات کی وجہ سے مولانا عبدالحقؒ نے مقدمہ تفسیر میں خصوصیت سے مذاہب باطلہ کے رد کی طرف توجہ کی۔ دیگر مذاہب کے اصولوں کے مقابلے میں مذہب اسلام کے اصولوں کی عظمت اور صداقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی مکمل تفسیر خود اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

---

[۱] اور [۲] تفسیر فتح المنان یا تفسیر حقانی، جلد اول ص۱۹

tooba-e-library.blogspot.com

جس کے مطالعے سے ان کی علمی تحقیق کی قدر و قیمت اور افادیت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"علم تفسیر کی تعریف مولانا نے اس طرح کی ہے:

"علم تفسیر وہ علم ہے جس میں احوال قرآن میں من حیث القرآن بیان کیے جاتے ہیں اور بقدر طاقتِ بشریہ الفاظ سے جو کچھ خدائے پاک کی مراد ہے وہ ظاہر کی جاتی ہے۔ موضوع اس فن کا قرآن مجید ہے اور غرض اس علم سے معانی اور مطالب قرآن کا جاننا ضروری ہے اور مبادی اس کی یعنی علم میں کار آمد صرف، نحو اور لغت، معانی بیان فقہ واصول، حدیث و کلام وغیرہ علوم ہیں۔"[1]

پھر مولانا نے ان علوم کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے بحث کرنا مفسر کو ضروری ہے اور جن کے نہ معلوم ہونے سے قرآنِ کریم کے مطالب سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے جیسے:

(۱) ناسخ و منسوخ کا پہچاننا۔

(۲) شانِ نزول کے بارے میں صحیح تحقیق کیوں کہ اس میں متقدمین اور متاخرین کا اختلاف ہے۔ بعض مفسرین آیات کے لیے ہر جگہ ایک قصہ نقل کر کے اس کو شانِ نزول بتلاتے ہیں جو صرف تکلف ہے۔ بلکہ طویل قصص انبیاء جو مفسرین نے اپنی کتابوں میں نقل کیے ہیں بیشتر اہلِ کتاب سے نقل کیے گئے ہیں۔ صحابہؓ و تابعینؒ کبھی کبھی مشرکین و یہود کے مذہب اور ان کے عقائد و عادات کی وضاحت کے لیے قصص جزئیہ نقل کر کے یہ کہتے تھے کہ اس امر میں یا اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی اسی لیے شانِ نزول میں صحابہؓ کے اقوال مختلف ہوتے ہیں۔

مولانا عبدالحق تحریر کرتے ہیں:

"نزولِ قرآن سے نفوس بشریہ کی تہذیب اور عقائد باطلہ کا بطلان اور اعمالِ فاسدہ کی نفی ہے۔ پس لوگوں میں عقائدِ باطلہ کا پایا جانا اور باہم معاملات کا پیش آنا آیات احکام کے نزول کا سبب ہے اور لوگوں کا نڈر ہونا یا اس کی رحمت سے نا امید ہونا آیات تذکیر بایام اللہ و آلاء اللہ کے نزول کا سبب ہے۔"[2]

مولانا عبدالحقؒ نے تفسیر کے مقدمہ میں مفسر کے لیے دو چیزوں کے اہتمام کی طرف اور توجہ دلائی ہے اول یہ کہ جن آیات میں ایسے واقعات کی طرف اشارہ ہے جو متفرق جگہ مختلف عنوانات سے مذکور ہوں وہاں ان کو معلوم کیے بغیر پورا مطلب قرآن کا سمجھ میں نہیں آتا ہو ان قصوں کو مختصر طور پر بروایات صحیح بیان کر دینا مناسب ہے۔ دوسرے جہاں تخصیص عام وغیرہ تصرفات قصص میں ہیں وہاں ان کی تشریح کر دی جائے تاکہ مطلب اچھی طرح سمجھ میں آجائے اور جہاں احکام کی آیات ہوں وہاں احکام کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے اور آیات تذکیر بآلاء اللہ و وقائع حشر یا ان کی صورت بیان کر دینا چاہیے۔

مفسر کے لیے ان امور کے علاوہ (توجیہہ مشکل) یعنی کبھی کبھی کلام میں اپنی ناواقفیت کی وجہ سے بظاہر ایک شبہ معلوم ہوتا ہے یا مدلول آیت میں استبعاد معلوم ہوتا ہے یا دو آیتوں میں باہم تناقص پایا جاتا ہے یا مصداق آیت کے تصور کرتے ہیں۔ مبتدی کے ذہن پر اشکال ہوتا ہے یا کسی قید کا فائدہ پوشیدہ ہو۔ لہٰذا جب مفسر ان اشکالات اور شبہات کو حل کر دیتا ہے تو اس کو توجیہ مشکل کہتے ہیں جو ایک بڑا فن ہے اور مفسر کے لیے اس کا جاننا ضروری ہے۔

اس طرح مولانا کی تفسیر کا ان امور کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو ایک مدلل اور مکمل تفسیر کا بہترین نمونہ ملتا ہے کیوں کہ خود انھوں نے جن باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے مقدمہ میں وہ خود ایک مستقل تصنیف ہے، لہٰذا جس مفسر نے مقدمہ پر اتنی محنت کی ہوگی اس نے تفسیر کے سلسلے میں جو کوشش اور تحقیق و تشریح کی ہے وہ یقیناً عمدہ

[1] مقدمہ تفسیر حقانی، جلد اول، ص ۹۱

[2] تفسیر حقانی (تفسیر فتح المنان)، جلد اول، ص ۹۴

اُردو تفاسیر میں ایک خاص مقام کی حامل ہے اور دیگر مفسرین کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تفسیر "جامع التفاسیر"[1]

اُردو تفاسیر میں " نواب محمد قطب الدین خاں صاحبؒ " کی تفسیر "جامع التفاسیر" کا نام ان تفسیروں کے ساتھ ملتا ہے جو مکمل لکھی گئی ہیں۔ نواب صاحب نے تفسیر کے مقدمہ میں اس کا سبب[2] تالیف بھی تحریر کیا ہے جس کا مختصراً سبب یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں قرآنِ کریم کی تفسیر سے دلچسپی اور رغبت کا اظہار ہوتا تھا؛ کیوں کہ اس دور میں علومِ اسلامیہ خصوصاً قرآنِ کریم کی عظمت اور احترام دلوں میں تھا۔ اس لیے اس کا سیکھنا یاد کرنا کرانا، اس کے مطالب اور معانی پر محنت کرنا دین کا اہم جزو سمجھا جاتا تھا، تحصیل علم کی بنیاد ہی قرآن سے رکھی جاتی تھی اور قرآن کے معانی سمجھنے کے لیے عربی زبان سے واقفیت لازمی تھی اس لیے کئی کئی سال عربی سیکھنے پر محنت کی جاتی تھی، لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا۔ رفتہ رفتہ لوگوں میں دیگر علوم سے دلچسپی پیدا ہونے لگی اور علوم دینی سے تعلق کم ہونے لگا۔ اس غفلت کا جائزہ لیتے ہوئے علمائے وقت نے قرآن کے مقاصد اور اس کی اہمیت اور عمل کو برقرار رکھنے کے لیے دوبارہ تفاسیر اور تراجم پر محنت شروع کر دی۔ مختلف زبانوں میں یہ تراجم ہونے لگے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر نواب قطب الدین خاں نے یہ تفسیر " جامع التفاسیر " کے نام سے لکھی۔ اگرچہ تفسیر کا سلسلہ نواب صاحبؒ سے قبل کے علماء اور بزرگوں کے ذریعہ شروع ہوئے عرصہ گذر چکا تھا۔ لیکن بعد میں یہ سلسلہ روز افزوں ترقی کرتا رہا۔ ہندوستان میں اس سلسلہ کی بنیاد شاہ ولی اللہؒ نے ڈالی۔ جنھوں نے فارسی ترجمے سے قرآن کے ترجمہ کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ روز افزوں ترقی

---

[1] جامع التفاسیر نواب محمد قطب الدین خاں، مطبع نظامی کانپور، تاریخ طباعت سنہ ۱۲۸۳ھ

[2] جامع التفاسیر، حصہ اوّل، صفحہ ۱، ۲، ۳

کرتا رہا۔ ان کے صاحبزادوں نے یعنی شاہ رفیع الدینؒ و شاہ عبدالقادرؒ نے ترجمہ کا سلسلہ اُردو میں شروع کیا اور پھر مختلف علمائے کرامؒ نے دین کی یہ اہم خدمت انجام دی، جن میں کچھ مفسرین نے کام کو تکمیل تک پہنچایا، کچھ نے ضرورت، حالات، موقع محل کے لحاظ سے کچھ حصّوں کے ترجمہ و تفسیر پر ہی اکتفا کیا۔

نواب قطب الدینؒ نے بھی تفسیر کی اس اہم خدمت کو انجام دیا جن کی تفسیر کا مختصر جائزہ مندرجہ ذیل ہے:

تفسیر جامع التفاسیر

اس تفسیر کو نواب قطب الدین خاں نے مختلف تفاسیر و احادیث صحیح و مسائل فقہیہ کے حوالوں کے ساتھ پیش کرنے کی بلیغ کوشش کی، عوام و خواص کی فہم کو پیش نظر رکھا اور تفسیر کے مطالب کو جس کی وجہ سے شبہات اور اشکالات رفع ہو سکیں اور ان کو رفع کرنے کے لیے جگہ جگہ شاہ ولی اللہؒ کی فتح الرحمٰن اور موضح القرآن اور تفسیر جلالین و تفسیر معالم التنزیل اور بحر العلوم اور درِ منثور کے حوالوں سے کام لیا ہے۔ اور جس حدیث کی شرح سے کام لیا اس کے اشارات درج کر دیے ہیں جیسے شرح مُلّا علی قاری یا شیخ عبدالحق اور سید جمال الدین وغیرہ۔

اس تفسیر میں تحقیق لفظی اور عربی تراکیب بھی حاشیہ پر درج ہیں تاکہ اہلِ علم کے ذہن میں اگر کوئی شبہ و شک پیدا ہو تو دور ہو جائے۔ تفسیر کی ان ہی خصوصیات کی بنا پر محمد حسین خاں صاحب مطبع مصطفائی دہلی نے اس کو چھپوانا شروع کیا تھا کہ اچانک ہندوستان کی فضا خراب ہو گئی جس کی وجہ سے اس وقت یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اسی اثنا میں محمد ہاشم علی صاحب میرٹھی نے حاجی یار محمد صاحب کی خواہش پر جو اس تفسیر کے چھپوانے میں شریک تھے تفسیر کے منتشر اجزاء کو بہت عرق ریزی کے ساتھ ۱۲۷۴ھ میں جمع کیا اور بتاریخ بستم ماہ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ میں ترتیب دیا۔

یہ تفسیر سورۂ احزاب سے لکھی گئی اور سورۂ حجرات کے سیپارہ تک ختم کر دی گئی

اور سورۂ احزاب سے اس کے آغاز کا سبب یہ لکھا ہے کہ جب مظاہر حق مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ مولف نے تمام کیا تو کلام مجید کا درس سورۂ احزاب تک پہنچا تھا ان کو یہ خیال ہوا کہ یہیں سے درس کے موافق تفسیر تالیف ہو جائے اور طالبین کو جس قدر فائدہ پہنچ سکے غنیمت ہے۔ غرض اس طرح یہ تفسیر ہندوستان کی اردو تفاسیر میں اپنے دور کا ایک اہم نمونہ ہے۔

تفسیر مواہب الرحمٰن

مولانا سید امیر علی صاحب نے تفسیر قرآن مواہب الرحمٰن کے نام سے ایک تفسیر کی جس کو جامع البیان کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تفسیر کے آغاز سے قبل اس کا مقدمہ تحریر کیا جو ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اس میں انھوں نے قرآنِ کریم کی عظمت و اہمیت کے ساتھ ہی تفسیر کی اہمیت اور باریکیوں کو مختلف احادیث اور آیات قرآنی کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

اس مقدمہ میں انھوں نے قدیم مفسرین کے طبقات بیان کیے ہیں اور ان میں شیخ ابن جریر الطبریؒ کی تفسیر کی تعریف کی، بمقابلہ ان مفسرین کے جنھوں نے اسانید کا صحیح التزام کیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مختلف تفاسیر کے درمیان میرے نزدیک وہ جا ہیں خود ان کی تحریر شیخ ابن جریر الطبریؒ کے بارے میں ان الفاظ میں مندرجہ ذیل ہے:

"اگر سوال کیا جائے کہ پھر ہم کون تفسیر معتمد سمجھیں تو میں جواب دوں گا کہ تفسیر ابن ابو جعفر ابن جریر الطبری ﷺ المدنی، کیوں کہ علمائے معتبرین جن میں امام نوویؒ بھی ہیں سب نے اتفاق کیا ہے کہ اس کے مثل کوئی تفسیر تالیف نہیں ہوئی" ۲؎

اس حوالہ کے بعد سید امیر علی آگے اپنی رائے شیخ جریر ابن الطبریؒ کی تفسیر کے بارے

۱، ۲؎ سید امیر علی، تفسیر مواہب الرحمٰن، مقدمہ ص ۲۵۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ، سن طباعت ۱۹۲۶ء

میں جو پیش کرتے ہیں اس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ ہماری دیگر تفاسیر میں ہمارے یہاں یہ تفسیر نایاب اور نادر ہے ساتھ ہی تفسیر ابن کثیر کی بھی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

"میں نے تفسیر ابن کثیر کو دیکھا ہے کہ اس باب میں نفیس ہے اور اکثر مع الاسناد میں اور جن اسانید کو حذف کیا ہے ان کا حوالہ خود حافظ الحدیث معتمدین سے ہی ہے۔ چنانچہ کشف الظنون میں اس تفسیر کی تعریف مذکور ہے" ۱؎

غرض سید امیر علیؒ نے اپنی تفسیر لکھنے سے قبل عربی کی اہم تفاسیر معالم التنزیل کتب احادیث صحاح ستہ و "سراج المنیر" وغیرہ سے استفادہ کیا اور جن قصوں اور حکایات کے سلسلہ میں علمائے تحقیق کے ساتھ شبہ کیا ہے ان کو چھوڑ دیا ہے کیوں کہ جن پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ قرآن و سنت کی روشنی میں حاصل نہ ہو ان کو ترک کرنا ہی بہتر سمجھا۔ البتہ "سراج المنیر" کے قصے کسی خاص وجہ سے اس وقت نقل کیے ہیں جب مکمل طور پر ان کی تحقیق و تنقید کر لی گئی۔

اس طرح سید امیر علیؒ کے طرزِ فکر سے اور عبارت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی اس تفسیر میں تحقیق و محنت سے کام کیا ہے اور اس کی تکمیل کی کامیاب کوشش کی جو ان کے دور کے بعد بھی دینی خدمت کا ایک اہم حصہ نظر آتی ہے اور اردو تفاسیر میں یہ تفسیر ایسا اضافہ ہے جو دیگر مفسرین کے حوالوں سے مکمل اور جامع البیان ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہے۔

اس تفسیر کی مختصر خصوصیات جن کی طرف خصوصی التزامات کے ساتھ امیر علی نے اشارہ کیا ہے ترتیب وار مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ انھوں نے تفسیر منقول کے لیے اسانید صحیحہ سے روایات کو تفسیر ابن کثیر معالم التنزیل وغیرہ و کتب حدیث سے لیا ہے اور بلا سند اقوال جن کو تفسیر والے بغیر

۱؎ مقدمۃ التفسیر مواہب الرحمٰن، سید امیر علی، صفحہ ۲۵

نشان ذکر کرتے ہیں اعتماد نہیں کیا اور اسناد حذف کر کے صرف احادیث صحیحہ پر اکتفا کیا ہے۔

۲۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے قصص قرآن جو اہلِ کتاب سے منقول ہیں کسی معتمد عالم یا شیخ نے اس کو غلط بتایا یا جب وہ عوام میں ہی معروف نہ ہوں اگر کہیں ذکر کیا تو صرف نقل کیا اس سے کسی حکم شرعی کا استنباط نہیں کیا۔

۳۔ تیسرے سید امیر علیؒ نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل بیان کیے ہیں مثلاً قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی تشریح و تفسیر اس انداز سے کی ہے کہ توحیدِ خالص کی مکمل وضاحت ہو جائے۔

دلائل توحید کی تفسیر میں فلاسفہ اور متکلمین کے طریقہ سے ہٹ کر خالص اہل حق و صدق و صفا کا طریقہ اختیار کیا جو سلف صالحین سے ثابت ہے۔

مندرجہ بالا خصوصیات تفسیر کی روشنی میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تفسیر مواہب الرحمٰن امیر علی صاحبؒ کی کاوش و محنت کا عمدہ ذخیرہ ہے جس پر بہت اختصار اور جامعیت کے دائرے میں یہاں ذکر کیا ہے اگرچہ اور تفصیل سے روشنی ڈالی جا سکتی ہے لیکن مقالہ کے عنوان کے لحاظ سے زیادہ طوالت سے گریز کیا ہے۔ تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ ایک تعارف اس حد تک ہو جائے کہ اگر کسی کو شوق ہو تو دیگر بہت مشہور تفاسیر کے ساتھ اس کا مطالعہ بھی تفصیل سے کر سکے اور تحقیق و تنقید کے لیے ایک موضوع فراہم ہو جائے۔

اُردو تراجم کی روشنی میں تفسیر بیان القرآن کی خصوصیات

ترجمہ کا کام بظاہر جتنا آسان معلوم ہوتا ہے۔ اُسی قدر بعض اعتبارات سے مشکل بھی ہے اور دقیقہ رسی کا طالب بھی۔ تخلیقی ادب کی پیش کش میں بعض اوقات احتیاط کے اتنے مرحلوں سے نہیں گزرنا پڑتا جس قدر کسی زبان کا ترجمہ کرتے وقت۔ تاہم اگر ان مرحلوں کو سر کرنے کی کوشش نہ کی جاتی تو آج ہزاروں سال قدیم تحریریں خواہ وہ سقراط و افلاطون کے علمی افکار ہوں، یا ابنِ رشد، بوعلی سینا، ابو نصر فارابی کے کارنامے ہوں یہ سب لسانی دائروں میں محدود رہ کر فنا ہو جاتے۔ لیکن علم دوستوں نے ترجموں کے ذریعہ علم کے ان دفینوں کی دولت کو عام کر دیا۔ اور انھیں عالمی ورثہ بنا دیا۔

ہندوستان میں دوسری زبانوں کے علاوہ جن ادبی سرمایوں کو اُردو میں منتقل کیا گیا ان میں ایک بڑی تعداد قرآنِ کریم کے ترجموں کی ہے۔ اگرچہ ابتدا میں اس مقدس الہامی کتاب کے ترجمہ کو مناسب نہ سمجھا گیا بلکہ سخت مخالفت کی گئی اور قرآنِ کریم کو اس کی اصلی زبان عربی ہی میں رائج رکھنے کی کوشش کی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ موحدین کی سلطنت کے زمانہ میں جو عبداللہ منہاس[1] کی تحریر کے مطابق ۵۲۴ھ تا ۶۶۷ھ تک الجزائر سے اندلس

---

[1] محمد عبداللہ منہاس، مصنف رسالہ پیامِ امین، مضمون تراجم قرآن شرقی زبانوں میں ص ۲۶ مطبع آفتاب برقی پریس امرتسر، ۱۹۲۴ء سنِ طباعت۔

تک پھیلی ہوئی تھی، وہاں جب قرآن کا ترجمہ پہلی بار بربری زبان میں کیا گیا تو علماء نے اس کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اس ترجمہ کا نام و نشان بھی نہ رہنے دیا۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فارسی ترجمۂ قرآن "فتح الرحمٰن" نے اردو ترجموں کے لیے پہلی مرتبہ اک راہ ہموار کی۔ فتح الرحمٰن کا قلمی نسخہ مکتبہ مشرقیہ دارالعلوم اسلامیہ پشاور میں موجود ہے اور متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ البتہ ایک قدیم ترجمہ فارسی میں شیخ سعدیؒ کا بھی ملتا ہے۔ لیکن عام طور سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ترجمہ کو مقبولیت اور شہرت حاصل رہی ہے۔

فارسی کے ان تراجم کے ذریعہ اُردو ترجمہ قرآن کا سلسلہ بہت تیزی سے شروع ہوا اور بکثرت ترجمے کیے گئے۔ ان میں سے چند ان اہم تراجم کی مختصر تاریخی اہمیت اور خصوصیات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو مولانا تھانویؒ سے قبل کیے گئے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں مولانا تھانوی کی تفسیر البیان کے اُردو ترجمہ کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جا سکے۔ اور ان سے قبل کے اردو تراجم کی افادیت کا اندازہ کیا جا سکے۔ لہٰذا اس سلسلے میں چند دیگر تراجم قرآن کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے نمونے مثالوں کے ساتھ پیش کرتے ہوئے مولانا تھانوی کے ترجمہ اور ان مترجمین کے ترجموں میں جو فرق ہے ان کی نشاندہی اور ان تراجم کی خصوصیات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ قدیم اہم اور معروف تراجم میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے صاحبزادے شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمۂ قرآن کا مختصر خاکہ درج ذیل ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے قرآن کریم کا مکمل بامحاورہ ترجمہ پہلی بار کیا۔ شاہ صاحب کا خاندانی مدرسہ اس وقت مدرسہ شاہ عبدالعزیز قائم تھا جو دہلی میں محلہ کلاں محل کے قریب تھا۔ آج بھی اس گلی کا نام گلی شاہ عبدالعزیز اور مسجد شاہ عبدالعزیز ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے اپنے لیے مسجد اکبرآبادی کو منتخب کیا اور یہیں تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس مسجد میں سید احمد بریلوی قرآن مجید کا ترجمہ اور حدیث مولانا عبدالقادر کے درس میں سنتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے ۶۳ سال کی عمر پائی۔ آپ کا وصال ۱۲۳۰ھ میں ہوا۔[1] شاہ صاحبؒ اپنے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیزؒ کی سرپرستی میں رہے۔ شاہ فضل الرحمٰنؒ گنج مرادآبادی کے بقول شاہ ولی اللہؒ کی ساری اولاد علم و فضل میں یگانہ تھی۔ ان میں صاحب نسبت صرف شاہ عبدالقادرؒ تھے۔ صاحب نسبت اس کو کہتے ہیں کہ وہ جس بات کا ارادہ کرے۔ خدا تعالےٰ اسے پورا فرما دے (مقالات پروفیسر خلیق احمد نظامی)

شاہ عبدالقادرؒ کے قرآن کریم کے ترجمے کو جو مقبولیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اہلِ علم اور اربابِ طریقت دونوں اس ترجمہ کو الہامی قرار دیتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کے اُردو ترجمہ الہامی کہنے کی وجہ علمائے دین یہ تحریر کرتے ہیں کہ شاہ صاحبؒ نے قرآنِ کریم کے الفاظ کی لغوی تشریح عربی زبان کی رعایت سے کی ہے اور معانی میں ہر لفظ کی تشریح اس طرح کی ہے کہ جو معنی صاحبِ کلام حق تعالیٰ شانہٗ کی مراد ہے اس کی چند مثالیں دیگر تراجم کی روشنی میں مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) تقویٰ کا ترجمہ شاہ صاحبؒ نے قرآن کے متعدد مقامات میں بچنا یا پرہیزگاری کیا ہے لیکن بعض مقامات پر بجائے پرہیزگاری یا بچنے کے "ادب بڑا" یا "دلوں کا ادب" ترجمہ کیا ہے۔ آیات یہ ہیں "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ"[2] کا ترجمہ جس کو ادب بڑا" کیا ہے۔ اور "تَقْوَی الْقُلُوْبِ"[3] کا ترجمہ "دلوں کا ادب" کیا ہے۔

علاوہ ترجمہ کی ان پر موقعہ رعایات کے علاوہ اہم خصوصیات جو الہامی بصیرت کا ثبوت پیش کرتی ہے وہ یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کے یہاں انبیاء علیہم السلام اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند مقامات اور درجات کا احترام نبوت و رسالت کا لحاظ و رعایت ہے۔ جبکہ

---

[1] محاسن موضح القرآن، مولانا اخلاق حسین قاسمی، پریس لال کنواں دہلی۔ سن طباعت ۱۹۷۷ء

[2] سورۃ حجرات۔ پارہ ۲۶

[3] سورۃ الحج پارہ ۱۷

عام طور پر قرآنِ کریم کے مترجمین اور مفسرین نے اُردو ترجمہ میں کہیں نہ کہیں کوتاہی نہ کی ہو سوائے شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے ترجمۂ قرآن کے کیونکہ انھوں نے ایسے تمام موقعوں پر شاہ صاحبؒ کی پیروی کی ہے جس کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) آیت قرآنِ کریم وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ[1] (اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں) تفسیر ابن کثیر کے اردو مترجم مولانا محمد صاحبؒ جوناگڑھی اور مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے بیان القرآن میں یہ ترجمہ کیا ہے۔ حالانکہ اس کا مفہوم تکلیف پہنچنا نکلتا ہے۔ تنگ دل کے لفظ سے یہ تشریح نہیں ہوتی ہے کیونکہ اُردو میں تنگ دل سے مراد کنجوس اور بخیل کے لیے جاتے ہیں۔ یہاں اس کا مطلب اور موقع کیونکہ یہ نہیں۔ لہٰذا یہ ترجمہ صحیح نہیں محسوس ہوتا۔ اس کے برعکس شاہ صاحبؒ کے ترجمہ میں جو وضاحت اور تاثیر نظر آتی ہے وہ باوجود قدیم ہونے کے جدید تراجم پر فوقیت رکھتا ہے اور شاہ صاحبؒ کی گہری نظر اور علمی بصیرت کا بین ثبوت پیش کرتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے يَضِيقُ کا ترجمہ "جی رکتا ہے" کیا ہے۔ یعنی جی رکنے سے مطلب اندر ہی اندر ایسی گھٹن ہونا جس سے طبیعت میں انقباض پیدا ہوتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے یہی مطلب پیش کیا ہے۔

(۲) اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد نے "حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ"[2] ان کو تمہاری بہبود کا ہوکا ہے اُردو میں حریص کے معنی اچھے مفہوم میں نہیں لیے جاتے، لیکن عربی میں لفظ حریص کے معنی خواہش مند اور بہت چاہنے والے کے آتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اس کا لفظی ترجمہ اس طرح کیا ہے "تلاش رکھتا ہے تمھاری"۔ فائدہ میں شاہ صاحبؒ وضاحت اس طرح کرتے ہیں "چاہتا ہے کہ امت میری زیادہ ہو" حریص کے معنی کا موازنہ شاہ صاحبؒ اور نذیر احمد دہلویؒ کے یہاں فصاحت و بلاغت، ادب و احترام اور معانی کے لحاظ سے ایک بڑے فرق کو محسوس

۱؎ سورۃ الحجر، پارہ ۱۴ ۲؎ سورۂ توبہ، پارہ ۱۰

کراتا ہے "ہوکا ہو گیا ہے" اور "تلاش رکھتا ہے تمھاری" میں، حسب مراتب اور معانی کے فرق کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے جب کہ نذیر احمد دہلویؒ اردو ادب کے عناصر خمسہ میں سے ایک مانے جاتے ہیں۔

دوسری مثال سورۂ یوسف کی آیت لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنِ[1] کے ترجمہ میں ملتی ہے جس کا ترجمہ شاہ صاحبؒ نے اس طرح کیا ہے۔ "میں پاتا ہوں بو یوسفؑ کی" اگر نہ کہو کہ بوڑھا بہک گیا ہے۔

اس ترجمہ کو ایک طویل عرصہ گذرنے کے بعد بھی بعد کے اکثر مترجمین نے اس آیت کے ترجمہ میں شاہ صاحبؒ کا اتباع کیا ہے اِلّا ایک دو حضرات کے جیسا کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب نے کنز الایمان میں اور ان کے بعد مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن میں اس طرح ترجمہ کیا ہے۔

"اگر تم یہ نہ کہو کہ میں سٹھیا گیا ہوں"

اس ترجمہ میں شاہ صاحب والے ترجمہ کی وہ خصوصیت نظر نہ آئی جس میں ایک پیغمبر وقت کی عظمت و رفعت کا احترام الفاظ میں ملحوظ ہو۔

اسی طرح ایک جگہ اور وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا[2] کا ترجمہ قدیم مفسرین سے لے کر اب تک "بے انصافی نہ کیجیے" یا فارسی میں "جور مکن" کیا ہے۔ لیکن شاہ صاحبؒ نے اس ترجمہ میں بھی ہر پہلو کی رعایت کرتے ہوئے اجتہاد سے کام لیا ہے وہ ترجمہ کرتے ہیں کہ "دور نہ ڈال بات کو" یعنی آپ ٹالنے کی بات نہ کیجیے گا، جلدی فیصلہ کر دیجیے۔ جو اس ترجمہ سے زیادہ انصاف و عظمت کا احساس دلاتا ہے۔

مختصراً یہ کہ ان مثالوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمہ قرآنِ کریم میں جس احتیاط اور ادب و احترام کو قرآن کی عظمت و بلندی و مضامین کے اعتبار سے شاہ صاحبؒ نے ملحوظ رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے اور ترجمے ان خوبیوں سے مکمل مزین نہیں نظر آئے۔

شاہ صاحب کے ترجمے کی خوبیوں کو ہر مفسرؒ نے سراہا بھی ہے اور اپنایا بھی۔ ان

۱؎ سورہ یوسف، پارہ ۱۲ ۲؎ سورہ ص، پارہ ۲۳

میں مولانا تھانویؒ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ مولانا تھانویؒ نے اس ترجمہ میں جن امور کا لحاظ رکھا ہے اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ لیکن کہیں کہیں مولاناؒ نے تمام مفسرین اور شاہ صاحبؒ کے ترجمہ سے ہٹ کر اپنا ایک الگ طریقۂ کار ترجمہ میں پیش کیا ہے جس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً، سورۂ مومنون میں اکثر مفسرین نے اللہ تعالیٰ کی تعریف میں ایک سے الفاظ اپنائے ہیں۔ لیکن مولانا تھانویؒ نے ترجمہ یہ کیا ہے:

"جس وقت تم اور تمھارے ساتھی کشتی میں بیٹھ چکو تو یوں کہنا شکر ہے
خدا کا جس نے ہم کو کافروں سے نجات دی[1]"

غرض مولانا تھانویؒ اور شاہ صاحبؒ کے ترجمہ میں جو خاص فرق محسوس ہوتا ہے وہ محاوراتی اور کتابی زبان کا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے ترجمے میں محاورات اور دلّی کی ٹکسالی زبان ہندی کے الفاظ بہت سادگی اور خوبصورتی سے استعمال کیے ہیں اور مولانا تھانویؒ نے ترجمہ کرنے میں کتابی زبان استعمال کی ہے جس کا اظہار انھوں نے وجوہات کے ساتھ مقدمہ میں تحریر کیا ہے کہ اس میں جو فرق ہے اس کی نشان دہی کی جا سکے اور مولانا تھانویؒ کے ترجمے کی خصوصیات کا جائزہ لیا جا سکے۔

قرآن کریم چونکہ صرف ایک ادبی کتاب ہی نہیں بلکہ ایک مذہبی صحیفہ بھی ہے، اس لیے اگر اس کی ترجمانی میں لوگوں نے احتیاط کو مدِ نظر رکھا ہے، تاہم ترجموں میں غلطیاں یا کوتاہیاں سرزد ہونا بالکل ممکن تھا اس لیے اہلِ علم نے جہاں قرآنِ کریم کے اُردو ترجمے کیے وہاں ان ترجموں پر نقد و تبصرہ بھی کیا جو کسی اعتبار سے معیار سے فروتر نظر آئے۔ خود مولانا تھانویؒ نے جن کے ترجمے پر ہم اس مقالے میں روشنی ڈال رہے ہیں بعض قرآنی تراجم پر تنقیدیں بھی سپردِ قلم کیں اور ان کی اصلاح کے لیے مشورے بھی دیے[2]۔ اس

---

[1] سورۂ مومنون، پارہ ۱۸

[2] مولانا تھانوی: اصلاح ترجمۂ دہلویہ، مطبع انتظامی کانپور ۱۹۱۱ء (یہ ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ پر مولانا تھانویؒ کی تنقید ہے)۔

کے علاوہ مولانا بعض مصالح کے پیشِ نظر صرف تنقید و اصلاح پر ہی اکتفا نہ کر سکے تو خود علیحدہ مکمل قرآن کا ترجمہ کیا اور تفسیر بھی لکھی جو مکمل بیان القرآن کے نام سے آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔

اپنے اس ترجمے اور تفسیر کی تیاری اور اشاعت کے بارے میں جو تفصیلات اور معلومات مولاناؒ نے خود تحریر کی ہیں ان کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

مولانا تھانویؒ نے ماہ ربیع الاوّل ۱۳۲۰ھ کے آخر میں اس ترجمہ کو لکھنا شروع کیا لیکن اوّل پارے کے چوتھائی حصّہ کا ترجمہ اور تفسیر لکھ پائے تھے کہ یہ سلسلہ بند ہو گیا، کیوں بند ہو گیا اس کی وجہ مولاناؒ نے تحریر نہیں کی۔ انھوں نے دوبارہ ماہ محرم ۱۳۲۲ھ کے وسط میں ترجمہ اور تفسیر کے کام کو پھر شروع کیا اور تکمیل کے بعد پہلی مرتبہ ۱۳۲۶ھ میں اسے شائع کیا گیا۔ اس مطبوعہ نسخے پر اس کا نام "بیان القرآن" درج کیا گیا تھا۔ ترجمہ اور تفسیر کی یہ پہلی اشاعت بھی کافی مقبول ہوئی۔ لیکن اس پہلی اشاعت کے بعد جب مولاناؒ نے خود اس کا کہیں کہیں سے مطالعہ کیا تو آپ کو بعض حصّے قابلِ اعتراض معلوم ہوئے۔ خود مولانا کا بیان ہے کہ بیان القرآن کے چھپتے وقت اس کے حواشی میں بعض جگہ ان کے علم اور رائے کے خلاف ترمیم کر دی گئی تھی لیکن اس کے بعد دوبارہ موان ترمیم و اضافوں کے جو نظرِ ثانی کے وقت خود مولاناؒ نے کی تھیں ان ہی کی منشا سے اصل مسودہ کو مولوی شبیر علی صاحب مالک اشرف المطابع تھانہ بھون نے طبع کرا دیا اور اس میں ان کے دو رسالے[1] جو قرآن کریم سے متعلق تھے مع ترجیح الراجح کے بعض حصّوں کے شامل کیے اور اس کے ساتھ ہی بعض وہ عبارتیں ان علماء کی اس میں شامل کر دیں جو بطور حاشیہ انھوں نے پیش کی تھیں۔ ان عبارتوں کو مولانا تھانویؒ کے حاشیوں سے امتیاز کے لیے لفظ محشی لکھ کر علیحدہ اضافہ کر دیا گیا۔ ان اضافوں کے بعد مولانا تھانویؒ نے اس کا نام "بیان القرآن" سے "مکمل بیان القرآن"

---

[1] "مسائل السلوک"، "وجوہ المثانی"، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مکمل بیان القرآن، جلد اوّل۔ ص ۲

تجویز کردیا۔ اور اس نام سے ان کی زندگی میں ۱۰ر شوال المکرم ۱۳۵۲ھ میں طبع ہوا۔ اور اپنی اس شکل میں آج موجود ہے۔

اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قرآنِ کریم کے ترجمے میں عوام و خواص دونوں کی فہم کی رعایت رکھی ہے۔ نہ تو اس قدر سادہ سہل اور مخصوص طبقہ کی زبان میں ترجمہ کیا ہے کہ ایک عام کتاب اور قرآنِ کریم کے ترجمے کا فرق ہی نہ محسوس ہو اور نہ اس قدر پیچیدہ اور مشکل الفاظ سے مزیّن کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک درمیانی درجہ کا طالب علم نہ سمجھ سکے۔ البتہ جہاں گہری اور دقیق علمی بحثیں ہیں جو علم کلام، فقہ، نحو، صرف، قرارت جیسے مسائل سے متعلق ہیں ان کی وضاحت کے لیے قدیم مفسرین کے حوالے دیے ہیں اور اکثر ایسے نکات انھوں نے حاشیے میں عربی زبان میں تحریر کیے ہیں صرف ان علمار کے لیے جو اُن کو پڑھ اور سمجھ سکتے ہوں۔ کیونکہ اُن کا مقصد عوام کے لیے ایسے مسائل کے لیے نہ تھا جس کی وضاحت خود ان کی تحریر سے اس طرح ہوتی ہے:

"حاشیے کی عبارت عربی اس لیے تجویز کی ہے کہ عوام اس کو دیکھنے کی ہوس ہی نہ کریں، ورنہ جب زبان سمجھتے اور مضامین نہ سمجھتے بہت پریشان ہوتے"[2]

لیکن ترجمے میں انھوں نے عوام کا بھی لحاظ کیا ہے اس کے لیے لکھتے ہیں:

"یہ تفسیر مختصر یا ترجمہ مطول کہہ لیجیے عوام و خواص سب کے کام کا ہوگا"[3]

مولانا تھانوی نے اپنے کیے ہوئے ترجمے میں جن امور کی رعایت کی ہے وہ ترتیب وار مندرجہ ذیل ہیں:

---

[1] مندرجہ بالا تاریخیں آغاز و اختتام دوبارہ شائع ہونے کی خود مولانا نے مکمل بیان القرآن کی جلد اوّل پر مقدمہ میں تحریر کی ہیں۔

[2] مکمل بیان القرآن، جلد اوّل، ص ۵

[3] ایضاً ، ، ص ۵

(۱) ترجمہ آسان زبان میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ تحت لفظی کی بھی رعایت کی ہے جیسا کہ شاہ عبدالقادرؒ نے اپنے ترجمے میں کیا ہے۔

(۲) ترجمے میں خالص محاورات استعمال نہیں کیے کیونکہ ہر جگہ کے محاورات مختلف ہوتے ہیں اس لیے "کتابی" زبان پسند کی ہے۔

(۳) نفسِ ترجمے کے علاوہ جس مضمون کو بہت ضروری سمجھا اس کی تشریح لفظ (ف) بنا کر کردی ہے لیکن اس اپنی تشریح کرنے میں بھی اُن کے مزاج میں اس درجہ احتیاط تھی کہ تحریر کرتے ہیں:

"باوجود اتنی رعایت کے بھی غیر علمار اور طلبار کے لیے بہت سے مقامات میں علمار سے استغنا نہیں ہو سکتا لہٰذا مناسب بلکہ واجب یہ ہے کہ ایسے حضرات صرف اپنے مطالعہ فہم پر اعتماد نہ کریں بلکہ حسب ضرورت علمار یا منتہی طلبہ سے اس کو سبقاً سبقاً سمجھ کر پڑھ لیں، ورنہ اَقل درجہ اتنا تو ضرور ہے کہ مطالعہ کے وقت جہاں ذرّہ برابر بھی اشتباہ رہے وہاں خود غور کر کے نہ نکالیں بلکہ نشان کر کے علمار سے وہ عبارت دکھلا کر حل کر لیں بدون اس کے احتمال بلکہ یقین غلط فہمی کا ہے"[1]

مندرجہ بالا تین اصولوں کے علاوہ چار امور مولاناؒ نے اور تحریر کیے ہیں جن کا تعلق ترجمے سے نہیں بلکہ تفسیر سے ہے اس لیے یہاں ان کو ترک کر دیا ہے، لیکن انھوں نے اپنے رسالے "اصلاح ترجمہ دہلویہ"[2] میں قرآنِ کریم کا ترجمہ کرنے والے کے لیے ایک جامع مختصر فتویٰ مع شرائط کے ترتیب وار دیا ہے جس کا عنوان انھوں نے "خلاصہ فتویٰ جامع شرائط مترجم" رکھا ہے۔ لہٰذا ترجمہ کی ضروریات اور خصوصیات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے

---

[1] مکمل بیان القرآن، مولانا اشرف علی تھانویؒ، جلد اوّل، ص ۴

[2] مولانا تھانویؒ، اصلاح ترجمہ دہلویہ، ص ۳۷، مطبع انتظامی کانپور، سن طباعت ۱۹۱۱ء

ہم یہاں مختصراً اس کی بھی ترتیب پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ مولانا تحریر کرتے ہیں کہ: ترجمہ کرنے والے کو عربی زبان سے واقف ہونا چاہیے اتنی اچھی طرح کہ عربی سے ترجمہ کر سکے براہِ راست، کیونکہ ترجموں کے ذریعہ ترجمہ کرنے سے اصلی معنوں سے دوری ہو جاتی ہے۔

۲۔ دوسرے فنونِ عربی یعنی صرف، نحو، بلاغت ولغت میں مہارت ہو تاکہ ترجمہ کرتے وقت صیغوں کو الفاظ کی ترتیب وتراکیب، اسالیب کلام ودقائق ونکات کی رعایت کر سکے، کیونکہ ان کے چھوڑنے اور نہ سمجھنے سے ترجمہ کرنے میں صریح غلطیاں ہو جاتی ہیں۔

۳۔ تیسرے الفاظ کے لغوی معنی جاننے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ترجمہ کرنے والے کے لیے اصطلاحاتِ شرعیہ سے واقف ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اصطلاحی الفاظ کا ترجمہ لغوی معنی میں کرنے سے متکلم کا مقصد بدل جاتا ہے۔

۴۔ چوتھے علمِ حدیث کو استادوں سے پڑھا ہو تاکہ قرآنِ کریم کا مطلب بیان کرنے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کردہ اسبابِ نزول میں کوئی اختلاف نہ پیدا ہو۔

۵۔ پانچویں مجتہدین کے مذاہب کی معلومات ہوں تاکہ (فقہیات کی تفسیر میں اجماع کی مخالفت نہ کرے) قرآن کے فقہی مسائل کے سلسلہ میں اجماعِ امت سے اختلاف نہ ہو۔

۶۔ چھٹا امر مولاناؒ کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ اہلِ سنت کے عقائد کی تفصیلات سے بخوبی واقف ہو، علمِ کلام جانتا ہو تاکہ تفسیر وترجمہ میں بدعات کے عقائد سے محفوظ رہے۔

۷۔ ساتویں چیز مترجم میں یہ ہونی چاہیے کہ وہ ان مفسرین کے اقوال سے واقف ہو جو علمِ تفسیر کی تکمیل صحیح تحقیقات رکھتے ہوں اور ان ناسخ ومنسوخ زیادت وحذف سے

ا؎ مولانا اشرف علی تھانویؒ، "اصلاح ترجمہ دہلویہ"، مطبع انتظامی کانپور، سن طباعت ۱۹۱۱ء

باخبر ہو جن کو ترجمہ وتفسیر میں نقل کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔

۸۔ آٹھویں علمِ اصول اور معقولات کم از کم اتنا جاننا چاہیے کہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ عقلی اور شرعی تفسیری بیان میں دلائل پیش کر سکے۔

۹۔ نویں قرآنِ کریم کے مشکل اور جامع معانی رکھنے والے مقامات کی مشترک تاویل، تعارض کے دور کرنے یا نسخ کے بیان میں یا مبہم تفسیر یا مجمل تفصیل وغیرہ کی صورت میں ترجمے پر قناعت نہ کرے بلکہ حاشیے میں وضاحت کرتے ہوئے ایسے امور کو صاف بیان کر دے۔ (اصلی عبارت):

"مواضع مشکلہ ومجملہ میں تاویل مشترک یا رفع تعارض یا بیان نسخ یا تفسیر مبہم، یا تفصیل مجمل وغیرہ کے اظہار کے لیے صرف ترجمے پر اکتفا نہ کرے بلکہ بطور شرح یا حاشیے کے امور مذکورہ کی توضیح کر دے"۔ا؎

۱۰۔ دسویں ضرورت مترجم کے لیے یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا جس زبان میں ترجمہ کرنا مقصود ہو اس زبان پر پوری قدرت اور مشق ہو صرف کتابی استعداد کو کافی نہ سمجھے۔ بغیر قدرت زبان کے قرآن کے الفاظ کا صحیح اور اچھا ترجمہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہو گی۔

۱۱۔ علمی استعداد کے علاوہ مولاناؒ کی دور اندیش نگاہ نے ان صلاحیتوں کو بھی ضروری سمجھ کر پیش کر دیا ہے جس کا تعلق ذاتی طور پر افعال واعمال سے ہوتا ہے جیسا کہ وہ اس اصول میں تحریر کرتے ہیں کہ مترجم کے اعمال نیک ہوں، عقائد صحیح ہوں، تاکہ ترجمہ وتفسیر میں ایسے خیالات کار فرما نہ ہوں جو بدعت کے نزدیک ہو جائیں یا اپنے میلانِ طبیعت کا ساتھ دیں تاکہ خلاف دیانت، خیانت سے بچا رہے۔

۱۲۔ دوسری خوبی اس میں یہ ہو کہ وہ اپنے دور کے قابلِ اعتبار علماء کی نظر میں مقبول ہو۔

۱۳۔ ترجمہ کرنے والا ذہین ہو تاکہ اختلافی مسائل کو اور اقوال کو ذاتی صلاحیت ذہانت

ا؎ اصلاح ترجمہ دہلویہ، مصنف مولانا اشرف علی تھانوی، ص۳۷

کی وجہ سے بھی صحیح طریقہ سے پیش کرسکے۔ اور باریکیوں کا اندازہ کرتے ہوئے مخالفین کے شکوک کو معقول طریقہ سے دور کرسکے۔

۱۴۔ ایک اہم ضرورت کا احساس یہ بھی دلایا کہ قرآن کا ترجمہ قرآن کی آیات کے ساتھ ساتھ کیا جائے، کیونکہ صرف تراجم کے شائع ہونے سے اصلی عبارت کے زائل ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

۱۵۔ مترجم کے مزاج میں تکبر اور خودرائی نہیں ہونی چاہیے تاکہ کسی مقام پر شرح صدر نہ ہونے پر علماء سے پوچھے اور ان کی خدمت میں جانے کو خلافِ شان نہ سمجھے اور اپنی کوتاہی معلوم ہونے پر اصلاح کرسکے۔

ان تمام ضرورتوں کو مولانا تھانویؒ نے بہت تاکید سے بیان کیا اور ضروری قرار دیا ہے۔ ترجمہ یا تفسیر کرنے والا اگر ان سب باتوں پر کاربند نہ ہوگا تو ترجمہ کرنے میں جلدی کرنے کی وجہ سے گنہگار، خطاکار اور جاہل ثابت ہوگا۔ لہٰذا ان کے نزدیک ان سب شرائط اور ذمہ داریوں کو پورا کرنا بہت ضروری ہے ورنہ قرآن کا ترجمہ ناقص اور نامکمل ہوسکتا ہے اور مندرجہ بالا جتنی باتیں پیش کی گئی ہیں ان میں سے دو ایک یا کچھ زائد اوصاف کا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ تقریباً ان تمام شرائط کی پابندی پر ہی ترجمہ و تفسیر کی صحت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

خود مولاناؒ نے اپنے ترجمے اور تفسیر کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی ہے ان کے نام خود ان کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق یہ ہیں:

(۱) تفسیر بیضاوی (۲) تفسیر جلالین (۳) تفسیر رحمانی (۴) اتقان فی علوم القرآن (۵) معالم التنزیل (۶) روح المعانی (۷) مدارک (۸) خازن (۹) تفسیر فتح المنان (تفسیر حقانی) (۱۰) تفسیر ابن کثیر (۱۱) لباب النقول (۱۲) درمنثور (۱۳) تفسیر کشاف (۱۴) قاموس۔

بعض تراجم قرآن کا بھی مطالعہ کیا۔ ان کتب کے علاوہ بہت سے نام مولاناؒ نے تحریر نہیں کیے۔ اس کے علاوہ ضرورت پڑنے پر مولاناؒ نے بعض کتب فقہ و حدیث کا مطالعہ بھی کیا،

جن کے نام بھی حاشیوں میں ملتے ہیں۔ مثلاً احادیث کی کتابوں میں ۔ ابوداؤد، صحیح مسلم، ترمذی شریف، ابن ماجہ، بخاری شریف، مسند احمد، نسائی، الجامع الصغیر، وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ اور منطق کی کتب میں صدرا کا حوالہ ملتا ہے۔ فقہی کتابوں میں درمختار، تبیانؒ، شرح العوامل وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

ان مشہور و معروف صحیح کتابوں کے حوالوں کے ذریعہ مولانا تھانویؒ کے ترجمہ و تفسیر کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان تمام کاوشوں کے ساتھ کچھ امور کا لحاظ انھوں نے آسانی سے سمجھنے کے لیے کیا اور رکھا ہے جن کا ذکر کردینا بھی مناسب ہے۔

مولانا نے ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ ہر سورت کا اور آیت کا اوّل سے آخر تک ربط قائم رکھتے ہوئے ترجمہ و تفسیر سے قبل بعض مشکل مضامین کا شروع ہی میں تقریر کے طور پر ایک خلاصہ پیش کردیا ہے تاکہ آئندہ آنے والے مضمون کے ترجمہ و تفسیر میں کوئی دقت نہ ہو۔ دوسرے مضمون سے قبل اس کا ایک عنوان مضمون کی مناسبت سے سرخی کے طور پر لکھ دیا ہے جس کی وجہ سے بہت سی ذہنی پیچیدگیاں ساتھ دور ہوجاتی ہیں۔

تیسرے اخلاقیات میں صرف حنفی مذہب سے استدلال کیا ہے اور دوسرے مذاہب ضرورت کی بنا پر حوالے کے لیے حاشیے میں دیدیے ہیں۔

ان تمام کے علاوہ بھی کچھ اور اصول جو تقریباً بیس کے قریب ترتیب وار مولاناؒ نے تحریر کیے ہیں ان کا تعلق ترجمہ سے نہیں بلکہ تفسیر سے زیادہ ہے اس لیے اس مضمون میں ان کی وضاحت سے گریز کرتے ہوئے صرف ان امور کو پیش کردیا ہے جن کا تعلق ترجمے سے ہے۔

مولانا تھانویؒ کے ترجمے قرآن کے اس جائزے اور تحقیقات کے بعد چند اور مختصر

لہ یہ مولانا تھانویؒ کا ایک مختصر مجموعہ بعض ان تقریرات کا ہے جو ان کے ہمشیرزاد مولوی سعید احمد مرحوم نے تفسیر کے مختلف مقامات اُن سے پڑھتے وقت ضبطِ تحریر کرلی تھیں، مگر سعید صاحب کی وفات ہونے کی وجہ سے اس کی تکمیل کی نوبت نہیں آئی (بحوالہ حاشیہ بیان القرآن جلد اول ص ۱)

خا کے ترجمے کے حوالے کے ساتھ دیگر تراجم کی روشنی میں پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ مولاناؒ کے ترجمے اور دیگر تراجم میں جو فرق ہے وہ سامنے آ ئے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہاں ایک قدیم اور نامکمل شاہ مراد اللہ انصاری کے ترجمہ کا ایک نمونہ پیش کریں گے۔ کیونکہ جدید تحقیقات[۱] کی روشنی میں یہ ترجمہ شاہ عبد القادرؒ اور رفیع الدین دہلویؒ کے ترجموں سے بھی زیادہ قدیم معلوم دیتا ہے اور اردو میں قرآن کا پہلا ترجمہ جو شاہ رفیع الدین دہلویؒ سے پندرہ سال قبل کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا صحیح طور پر پتہ نہیں ملتا کہ یہ کب کیا گیا۔ دوسرے اس کا صرف عم پارے کا ترجمہ تفسیر مرادیہ کے نام سے مطبع رحیمیہ دیوبند سے طبع ہو کر حال ہی میں آیا ہے۔

ترجمہ سورہ فاتحہ

۱۔ سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہان کا۔ ۲۔ نہایت رحم والا۔ ۳۔ مالک انصاف کے دن کا۔ ۴۔ تجھی کو ہم بندگی کریں تجھی سے مدد چاہیں۔ ۵۔ چلا ہم کو راہ سیدھی۔ ۶۔ راہ اُن کی جن پر تو نے فضل کیا، نہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بھٹکنے والے[۲]

اور یہ فائدہ اصل قرآن شریف مترجم ہندی کا ہے اور اس سورۃ میں اللہ صاحب نے بندوں کی زبان سے فرمایا ہے کہ اس طرح کہا کریں جن پر تو نے فضل کیا۔ ان سے چار فرقے مراد ہیں:

نبیئین[۱]، صدیقین[۲]، و شہدار[۳] و صالحین۔ اور جن پر غصے ہوا اُن سے یہود اور گمراہوں سے نصاریٰ مراد ہیں۔

---

۱ شاہ مراد اللہ انصاری، تفسیر مرادیہ، مطبع رحیمیہ دیوبند

۲ ترجمہ سورہ فاتحہ، تفسیر مرادیہ۔

ترجمہ مولانا تھانویؒ (سورہ فاتحہ)

سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے۔ جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں، جو مالک ہیں روزِ جزا کے۔ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں۔ تبلاو یجیے ہم کو رستہ سیدھا۔ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے[۱]

مولانا تھانویؒ کے اور شاہ مراد اللہ انصاری کے ترجموں کا موازنہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ معانی و بیان کے اعتبار سے تو دونوں ترجموں میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے جب کہ تاخیر و تقدیم کا وقت کے لحاظ سے برسوں کا فاصلہ ہے۔ البتہ دونوں کی زبان الفاظ میں فرق محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کا ترجمہ شاہ صاحبؒ نے "صاحب سارے جہاں" کا کیا ہے۔ اور مولانا تھانویؒ نے "مربی ہیں ہر ہر عالم کے" کیا ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ اسی سورۃ میں مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا ترجمہ شاہ صاحبؒ نے کیا ہے "مالک انصاف کے دن کا" اور مولانا تھانویؒ کا ترجمہ ہے "مالک ہیں روزِ جزا کے"۔ پھر ایک اور جگہ شاہ صاحبؒ نے اسی سورت میں إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کا ترجمہ کیا ہے "تجھی کو ہم بندگی کریں تجھی سے مدد چاہیں" مولانا تھانویؒ کا ترجمہ اس طرح ہے "ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں"

ان چند ترجموں کے حصوں کے موازنہ میں معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؒ نے اپنے ترجمے میں بقول خود اُن کے عام محاورات سے بچتے ہوئے کتابی زبان استعمال کی ہے اس لیے ان کے ترجمے میں فصاحت، شستگی اور روانی ملتی ہے۔ شاہ صاحب کا ترجمہ ابتدائی ترجمہ کے دور کا ترجمہ ہونے کے باوجود بہت صاف اور آسان ضرور ہے لیکن زبان آج کے دور

---

۱ بیان القرآن، مولانا اشرف علی تھانوی، جلد اول ص۱

کی ترقی پذیر اُردو کے مقابلہ میں زیادہ شستہ، بلیغ، اور فصیح نہیں معلوم ہوتی جس کا اندازہ مندرجہ بالا ترجمہ کے الفاظ صاحب اور مربّی، جزا، انصاف، مدد، اعانت، بندگی، عبادت وغیرہ سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مولاناؒ کے ترجمہ میں ایک تسلسل اور ربط قائم رہتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے یہاں تحت لفظی کا خیال خصوصی طور پر رکھنے کی وجہ سے جملے پڑھتے وقت الگ الگ ٹکڑوں کی شکل میں لگتے ہیں۔ غرض مجموعی طور پر دونوں ترجمے اپنی جگہ جداگانہ خصوصیات کے حامل ہیں۔ لیکن آج کے اعتبار سے مولانا کے ترجمے کو زیادہ مقبولیت اور معنویت اس لیے حاصل ہے کہ انھوں نے بہت سے اُردو ترجمے ہونے کے بعد جس جس کمی کا احساس کیا اس کو اپنے ترجمے میں پورا کرنے کی کوشش کی جس کو کامیابی حاصل ہوئی اور اُس سے فائدہ اٹھانے کا اہلِ علم کو موقعہ مل رہا ہے۔

شاہ صاحبؒ کے اور مولاناؒ کے ترجمہ کے اس موازنہ کے بعد اور دوسرے تراجم کا جائزہ اسی طرح لیتے ہیں۔ ایک مختصر جائزہ ڈپٹی نذیر احمد دہلویؒ کے ترجمہ قرآن کا پیش ہے۔ تاکہ ان مترجمین کے ترجمہ میں نذیر احمدؒ کے ترجمہ کی تحقیق و تنقید بہ آسانی ہو سکے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے ترجمہ کی یہ خدمت ڈھائی برس کی مدت میں انجام دی اس کوشش کے ساتھ کہ مشکل اور دقیق انداز سے ہٹ کر آسان با محاورہ زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا جائے۔ اس کوشش میں انھوں نے کچھ اجتہاد اور تصرفات بھی کیے ہیں جو باوجود سلیس ہونے کے کلامِ الٰہی کی عظمت و پیغمبرانہ شان کے مرتبہ کے لحاظ سے نامناسب اور گراں محسوس ہوتے ہیں۔ اگرچہ نسبتاً شاہ رفیع الدینؒ و شاہ عبدالقادرؒ کی زبان آسان اور سہل معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ ترجمے فارسی تراجم کے بعد پہلے اُردو ترجمے تھے۔ ان میں اُردو زبان کی روانی، شستگی، سلاست کا احساس کم ہوتا ہے نسبتاً ڈپٹی نذیر احمدؒ کے ترجمے کے۔ لیکن زیادہ آسان کرنے کی بے پناہ کوشش نے ان کو راہِ اعتدال سے کہیں کہیں ہٹا دیا ہے کہ معانی اور مطالب میں ڈپٹی نذیر احمدؒ سے لغزشیں ہو گئی ہیں۔ ترجمہ کرنے کی وجہ انھوں نے قرآنِ کریم کے دیباچہ[1] میں تحریر کی ہے کہ ہندوستانی مسلمان جو عربی زبان

---

[1] قرآنِ کریم مترجم، جامع المصاحف، مولوی حافظ نذیر احمد، ص۲

کی صرف و نحو کی پیچیدگیوں سے ناواقف تھے اور علومِ اسلامیہ کے علاوہ قرآنِ کریم جو خاص اسلامی نظامِ حیات کا مکمل و مدلل درس ہے عربی زبان میں تھا جس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کو اسلامی اصولوں سے بُعد اور ناواقفیت تھی اس لیے انھوں نے قرآنِ کریم کا ترجمہ ایسی آسان زبان میں کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانانِ ہند قرآنِ کریم کے احکامات و ہدایات اور مقصد کو سمجھ سکیں۔ اس کوشش میں اُن کی خلوصِ نیت کو گہرا دخل تھا۔ لیکن اہلِ علم حضرات نے ان کے ترجمے پر مطمئن نہ ہو سکے جیسا کہ خود مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کی تصحیح کے لیے ایک مختصر رسالہ "اصلاح ترجمہ دہلویہ"[1] کے نام سے لکھا۔ اس رسالہ کا مقصد زبان و بیان کے ان حصوں کی اصلاح تھا جس سے عوام کو ان غلط اعتقادات سے بچانا بھی تھا جو ترجمہ کی خامیوں کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے جس کا اظہار اپنی تحریر میں مولاناؒ نے اس طرح کیا ہے:

> "قرآن مجید کا ایک اُردو ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا لکھا ہوا دہلی سے شائع ہوا جس کے با محاورہ ہونے کی شہرت کو سن کر منگا کر دیکھا، محاورہ بے محاورہ ہونے کا فیصلہ تو اہلِ زبان کا کام ہے اور نہ اس سے کوئی ضروری غرض ہے۔ مگر دو چار متفرق مقامات پر نظر ڈالنے سے اتنا معلوم ہوا کہ اس میں خود مطالب قرآنیہ بھی کہیں کہیں متن سے کہیں حاشیہ سے بدل گئے ہیں اور جن کا اثر عقائد و احکام تک پہنچا جس سے نفع کی بجائے مسلمانوں کو نقصان کا خطرہ ہو گیا اس لیے اس کا انسداد عام مسلمانوں کے حفاظتِ دین کی وجہ سے ضروری تھا۔"

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ان کمزوریوں کو ضبطِ قلم کر کے بغیر کسی بحث و جدال کے اصلاح کے لیے ایک رسالے کی شکل میں ان خدشات سے بچایا جو ترجمہ کی تحریر یا عبارت کے غلط سمجھنے سے پیدا ہوئے۔ مثال کے طور پر کچھ حصے نذیر احمد کے ترجمے کے نمونے

---

[1] اصلاح ترجمہ دہلویہ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مطبع نول کشور، پریس لاہور

کے لیے مندرجہ ذیل ہیں:

سورۃ بقرہ میں نذیر احمد صاحب نے وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ۔

ترجمہ: "اور ہر ایک کے لیے ایک سمت (مقرر) ہے جدھر کو (نماز میں) وہ اپنا منہ کرتا ہے"۔[1]

اس آیت سے پہلے اور بعد کی چند آیتوں میں قبلہ سے متعلق بحث ہے۔ نذیر احمد نے حاشیے میں اس کی تشریح ص ۲۴ میں اس طرح کی ہے:

"مسلمان جیسے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کی حالت میں مسلمان تھے ویسے ہی کعبہ کی طرف، ویسے ہی ریل اور کشتی میں ہر طرف"۔

مولانا تھانویؒ نے اس آیت کا ترجمہ بیان القرآن میں یہ کیا ہے:

"اور ہر شخص کے واسطے ایک قبلہ رہا ہے جس کی طرف وہ منہ کرتا رہا ہے سو تم نیک کاموں میں تگا پو کرو"[2]

ترجمہ کے بعد مولاناؒ نے تشریح اس طرح کی ہے:

"دوسری حکمت تحویل قبلہ میں یہ ہے کہ عادۃ اللہ جاری ہے ہر (مذہب والے) شخص کے واسطے ایک قبلہ رہا ہے جس کی طرف وہ عبادت میں منہ کرتا ہے چونکہ شریعت محمدیہ بھی مستقل ایک دین ہے اور اس کا قبلہ بھی خاص ہو گیا ہے جب حکمت سب پر ظاہر ہو چکی ہے تو مسلمانوں اب تم اس بحث کو چھوڑ کر اپنے دین کے کاموں میں تگا پو کرو"[3]

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ترجمہ اصلاح دہلویہ میں اس کی تصحیح اس طرح کی ہے:

---

[1] سیقول، سورہ بقر، ترجمہ قرآن، نذیر احمد، ص ۲۴
[2] مولانا اشرف علی تھانویؒ، تفسیر بیان القرآن، جلد اول، ص ۷۵
[3] ایضاً " " " ص ۷۵

"اگر قبلہ کا علم ہو اور استقبال پر قدرت ہو تو پھر ریل اور کشتی میں بھی استقبال فرض ہے، ہر طرف کیسے جائز ہے اور اگر علم یا قدرت نہیں تو ریل اور کشتی کی کوئی تخصیص نہیں، پھر یہ کہ عبارت میں ایسی قید بڑھانا ضروری ہے جس سے اطلاق جواز کا شبہ نہ پڑے"۔[1]

مولانا تھانویؒ کے مزاج میں احتیاط اس حد تک ملتی ہے کہ مسائل کے سمجھنے میں عام ذہن کے حضرات کو خصوصیت سے غلط فہمی سے بچانے کے لیے مستقل محنت کی ہے جس کا ثبوت اس رسالہ میں تصحیح سے ملتا ہے۔

دوسرا ترجمہ مولوی نذیر احمد کا مندرجہ ذیل ہے:

آیات سورۃ بقرہ

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ڭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

ترجمہ: اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے آگے جھکو، تو شیطان کے سوا (سب کے سب) جھک پڑے، اس نے نہ مانا اور شیخی میں آ گیا اور نافرمان بن بیٹھا۔

ترجمہ مولانا تھانویؒ

"اور جب وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو کہ سجدے میں گر جاؤ آدم کے

---

[1] مولوی حافظ نذیر احمد، قرآن مجید مترجم "جامع المصاحف"، ص ۸، سن طباعت اور مطبع کا نام نہیں دیا۔ سید محبوب رضوی نے جائزہ تراجم قرآنی میں تحریر کیا ہے کہ یہ ترجمہ مع ان کے حواشی کے پہلی مرتبہ غالباً ۱۸۹۹ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۰۱ء میں مطبع انصاری دہلی میں طبع ہوا، ص ۱۴۱، مطبع نیشنل پرنٹنگ پریس، سن طباعت اول ۱۹۴۰ء

toobaa-elibrary.blogspot.com

سامنے، سو سب سجدے میں گر پڑے بجز ابلیس کے کہ اس نے کہنا نہ مانا اور
غرور میں آگیا اور ہو گیا کافروں میں۔[1]

ان دونوں ترجموں کے موازنوں میں چند لفظی اور معنوی فرق ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ میں فَسَجَدُوا کا ترجمہ ہے سب جھک پڑے۔ یہاں معنوی اور لغوی اعتبار سے سجدہ میں اور جھکنے میں فرق ہے۔ ایک فرق یہ ہے کہ عربی میں جھکنے کے لیے رَکَعَ یَرْکَعُ آتا ہے اور سجدہ کے لیے سَجَدَہ، یَسْجُدُ۔ لہٰذا مولانا تھانوی رح کے یہاں الفاظ کی تشریح اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے زیادہ واضح ہے۔ نسبتاً ڈپٹی صاحب کے۔ دوسرے قرآن کریم میں صاف ابلیس کا نام لے کر یہ ظاہر فرمایا اللہ تعالیٰ نے سوائے ابلیس کے سب سجدے میں گر گئے۔ تو یہاں ڈپٹی نذیر احمد ابلیس کا ترجمہ شیطان کرتے ہیں۔ لہٰذا صرف لفظ شیطان سے خاص سرکش شیطان کی وضاحت نہیں ہوتی بغیر اس کا نام لیے ترجمہ میں تحریر کرنے سے عوام کے لیے اور سہولت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تیسری بات اس ترجمہ میں "شیخی میں آگیا" اور "نافرمان بن بیٹھا" مولانا تھانوی کا ترجمہ ہے "غرور میں آگیا اور ہو گیا کافروں میں سے" وَاسْتَکْبَرَ کا ترجمہ کبر و غرور زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ معنی کے اعتبار سے بھی اور موقع محل کے اعتبار سے بھی بمقابلہ لفظ شیخی۔

اس مختصر موازنہ سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ نہ صرف تفسیر بلکہ قرآن کریم کے لفظی ترجمہ میں بھی عربی و اردو الفاظ پر اس قدر عبور ہونا ضروری ہے کہ ترجمہ کی ذرا سی لغزش سے مفہوم اور معنی میں بعد پیدا نہ ہو ورنہ غلط فہمی کا خدشہ ہو جاتا ہے۔ مولانا تھانوی رح کی علمی بصیرت نے اور دور رس نگاہ نے اس خدشہ کو دور کرنے کے لیے ترجمہ اصلاح دہلویہ کے نام سے ایک رسالہ تحریر کر کے عوام کو ٹھوکر کھانے سے بچایا۔

حضرت تھانوی رح کا مقصد اور کوشش اچھی طرح واضح ہو جائے۔ کچھ مثالیں

---

[1] مولانا اشرف علی تھانوی رح، بیان القرآن جلد اول، سورہ بقرہ صہ ۲۲، مطبع اشرف الجامع۔ تھانہ بھون سن طباعت ۱۳۵۳ھ

مولوی نذیر احمد رح کے ترجمے کی گذشتہ اوراق میں پیش کی گئیں ہیں، قرآن کے ترجمہ کے موازنہ کے ساتھ اور اب رسالے کے حوالے سے تفصیل سے چند نمونے اور پیش ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ قرآن کریم کی آیت: یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا[1]
ترجمہ: وَرَابِطُوْا کا ترجمہ مولوی نذیر احمد رح نے تحریر کیا ہے:
"آپس میں مل کر رہو[2]"

مولانا تھانوی رح فرماتے ہیں:
"ربط بمعنی مل کر رہنے کے اُردو کا محاورہ ہے آیت میں یہ مراد لینا صحیح نہیں بلکہ قدم یا قلب کا ثابت رکھنا مراد ہے[3]"

۲۔ اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً[4] کا ترجمہ سورہ نساء میں نذیر احمد کرتے ہیں:
"اپنے باپ کی پہلی بیوی سے نکاح کر لینا[4]"

مولانا رح نے اپنے رسالے میں تصحیح اس طرح کی ہے:
"پہلی اور دوسری اس میں سب برابر ہیں جو سوتیلی ہو اس میں یہ تخصیص صحیح نہیں[5]"

۳۔ اسی طرح فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ[6] کا ترجمہ مولوی نذیر احمد کرتے ہیں:
"پکے پکے گنبد"

مولانا تھانوی رح لکھتے ہیں:
"برج معنی گنبد اُردو محاورے میں مستعمل ہوتا ہے۔ عربی محاورے میں مطلق

---

[1] سورۃ آل عمران، پارہ ۴، رکوع ۲۰
[2،3] اصلاح ترجمہ نذیریہ دہلوی، مولانا تھانوی رح، ص ۸
[4] اصلاح دہلویہ، مولانا تھانوی رح، سورہ نساء، ص ۹
[5] 〃 ایضاً 〃 〃 〃
[6] 〃 ایضاً 〃 〃 〃

بنائے رفیع کو کہتے ہیں خواہ گنبد کی شکل ہو یا دوسری صورت ہو۔[1]

۴۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ کا ترجمہ نذیر احمد نے یہ کیا ہے ترجمہ قرآن میں:

"بے شک (کوہ) صفا و مروہ خدا کی ٹھہرائی ہوئی آداب گاہوں میں سے ہے"

آگے تشریح یہ کرتے ہیں کہ:

"حج کا دستور اسلام سے پہلے بھی تھا۔ اسلام نے اصلاح کر کے عبادت کا رنگ دے دیا۔"[2]

مولانا تھانویؒ لکھتے ہیں کہ:

"اس عنوان سے مفہوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے وہ محض دستور تھا اور کبھی اس میں عبادت کی حیثیت نہیں ہوئی۔ حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں اس کا عبادت ہونا منصوص ہے اور دوسرے انبیاء علیہم السلام نے بھی حج کیا ہے۔

۵۔ سورہ انفطار کِرَامًا کَاتِبِیْنَ کا ترجمہ دو فرشتے تھے مگر اب ان کا نام پڑ گیا ہے اس سبب سے ہم نے ترجمہ نہیں کیا، نذیر احمد کا ترجمہ یہ ہے اور مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں:

"کو ہمارے عرف میں نام پڑ گیا ہو مگر ترجمہ میں تو مدلول قرآنی کا لحاظ واجب ہے۔ سو وہاں صفت ہی مراد ہے تو یہ مقصود نہیں اس لیے ترجمہ لفظی واجب ہے۔"

مندرجہ بالا مثالوں سے ہمارے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا تھانویؒ نے مولانا نذیر احمدؒ کے ترجمہ میں جو اصلاحات کی ہیں وہ قرآن کریم کے معانی کی نزاکت کے پیش نظر کی ہیں۔ اگر قرآنی مطالب واضح اور صاف تشریحات کے دائرے میں نہ تحریر کیے گئے تو اہل علم کے قطع نظر مسئلہ ان لوگوں کا اہم ہوتا ہے جو لفظی مطالب کے ظاہری طور پر وہ معنی

۱؎ اصلاح دہلویہ، مولانا تھانویؒ، سورہ نساء، ص۹

۲؎ قرآن مجید مترجم، مولوی حافظ نذیر احمد ص۲۴، سورہ بقرہ ۲، پارہ سیقول، رکوع ۱۹

لے لیتے ہیں جو قرآن و سنت کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ احکام شریعت کا تقاضہ علماء کو اس پر مجبور کرتا ہے کہ وہ ان غلطیوں کو دور کر دیں جن سے بگاڑ کا خطرہ لاحق ہو۔ لکھنے والے کا ذہن اگرچہ خود صاف ہو جو تشریح اس کے ذہن میں ہو وہ تحریر سے اگر ظاہر نہ کی گئی تو عام انسانی زندگی مسائل پر دین کے خلاف اثر پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے مثلاً سورہ طلاق میں یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ میں مولوی نذیر احمد نے تحریر کیا ہے:

"مرد عورت کو اچھا موقع دیا گیا ہے کہ پھر ملاپ کر لیں اور مرد اپنی طلاق کو واپس لیں جس کو اصطلاح شرع میں رجوع اور رجعت کہتے ہیں"

مولانا تھانویؒ لکھتے ہیں:

"کہ رجعت کیونکہ ایک خاص قسم کی طلاق میں جائز ہے۔ اس لیے علی الاطلاق عدت میں رجعت کے جواز کا حکم کرنا غلط و باعث غلط اندازی عوام ہے"[1]

اس قسم کی تشریحات میں کیونکہ احکامات شرعی کے غلط جواز کا احتمال ہوتا ہے۔ اس لیے ترجمہ قرآن میں ایسی تمام باریکیوں کا لحاظ اور واقفیت نہایت ضروری ہوتی ہے جس کا اہتمام مولانا تھانویؒ نے اپنے ترجمہ و تفسیر میں حتی الوسع کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تفسیر بیان القرآن کو منجملہ دیگر خصوصیات کے ترجمہ کی فصاحت و بلاغت باریک بینی کی وجہ سے عوام و خواص میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اگرچہ ان ترجموں کو بھی جن کا اب تک تذکرہ اور مثالیں مولانا تھانویؒ کے ترجمہ کے ساتھ پیش کی گئیں قرآن کے اردو تراجم میں سر فہرست مانا جاتا ہے۔ اپنی قدامت اور بہترین کوششوں کے لحاظ سے آج بھی اردو کے بعد کے تراجم ان کی اتباع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جن کا حوالہ شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ میں دیا گیا ہے کہ مولانا تھانویؒ نے بعض الفاظ ترجمے میں اسی ترکیب سے تحریر کیے ہیں جو ہمیں شاہ عبدالقادرؒ اور ڈپٹی نذیر احمدؒ کے یہاں ملتے ہیں۔ لیکن مولانا تھانویؒ کا اردو ترجمہ اس لحاظ سے بھی زیادہ قابل ذکر ہے کہ ان کے یہاں بقول خود ان کے

۱؎ اصلاح ترجمہ دہلویہ، مولانا تھانویؒ، ص۳۴

toobaa-elibrary.blogspot.com

"عوام و خواص دونوں کی رعایت کی ہے۔" یہی وجہ ہے کہ مولانا تھانوی کی تفسیر بیان القرآن علماء کے لیے بھی قابلِ استفادہ ہے اور عوام بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ ان مجموعی خصوصیات کے لحاظ سے اُردو تراجم میں مولانا کا ترجمہ امتیازی خوبیوں کا حامل نظر آتا ہے اور امید ہے کہ جس قدر گہرائی سے اس کا مطالعہ کیا جائے گا اسی قدر مولانا کی علمیت و دینی بصیرت اور گہری نظر کا احساس روز افزوں ترقی کرتا رہے گا اور تفسیر بیان القرآن کی خوبیاں واضح ہوتی رہیں گی۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا

(ترجمہ) اور مضبوط پکڑے رہو اللہ کی رسّی کو اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو اور باہم نااتفاقی مت کرو

تفسیر بیان القرآن، مولانا تھانوی
سورہ آل عمران، جلد ۲، ص ۴۴

تفسیر بیان القرآن کا جائزہ کلامی فقہی اور تفسیر بالماثور کے نکتہ نظر سے

تفسیر بیان القرآن کی کلامی حیثیت

قرآن کا سب سے اہم باب خدا کی ذات صفات، حشر نشر، جنت وجہنم وغیرہ کی کلامی امور پر مشتمل ہے۔ وحدانیت و ربوبیت کے مسائل قرآن کی ابتداء سے لے کر انتہا تک تمام آیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید کے مفسرین اپنی تفسیروں میں ان مذکورہ مسائل سے بحث کرتے ہیں اور ان کے اردگرد پھیلے ہوئے شبہات کی تردید کرتے ہیں۔ کلامیات کے گرد گھومنے والے شبہات عموماً ہر دور میں یکساں ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے انداز اور بعض جزئی تفصیلات میں اختلاف واقع ہوتا رہتا ہے۔ اگرچہ وہ مسائل اور شبہات محدود ہیں، لیکن ہر دور میں ملحدین کی عقلی دقیقہ سنجیوں نے اتنے گوشے نکالے ہیں اور اس قدر کتابیں لکھی ہیں کہ ایک کتب خانہ تیار ہو گیا ہے۔ ملحدین کی ان ہی عقلی موشگافیوں نے ہر دور کے مفسرین کو ان کے جواب دینے پر مجبور کیا ہے اور انھوں نے قرآن کے کلامیات کو مدلل طریقہ پر تمام شبہات کو رد کر کے پیش کیا۔

کلامیات پر ہونے والے اعتراضات چونکہ عقلی ہوتے ہیں، اس لیے مفسرین نے ان مسائل کی تفسیر میں عقلی دلائل سے کام لیا ہے۔ بلکہ بعض مفسرین نے تو زمانہ کے عقلی رد سے متاثر ہو کر اپنی تفسیر کی بنیاد ہی عقلیات پر رکھی ہے اور قرآن کی ہر آیت کی تفسیر عقلی طور پر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں اس قدر غلو کیا ہے کہ قرآن کی تفسیر تحریف کی سرحد سے جا ملی جیسا کہ زمانہ قدیم میں فرقہ معتزلہ و ان کے بعد آنے والے فرقہ باطنیہ اور

اور قرامطہ نے کیا ہے۔ معتزلہ نے یونانی فلسفہ سے مرعوب ہو کر قرآن کی تاویل شروع کی، پھر ان کے بعد فرقہ باطنیہ نے عقل ونقل کے درمیان تطبیق کی کوشش کرتے ہوئے تمام عقائد بلکہ عبادات تک کی تحریف کر ڈالی۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اپنی کتاب "التعنیہ" میں کہتے ہیں:

"فالقرامطة الذين يضاهون الصابئة للفلاسفة والمجوس الثنوية حرفوا وعطلوا۔ وحرفوا الايمان بالله وكذلك الايمان باليوم الاخرة، وكذلك عمل الصالح حتى جاءت به شريعة عن اسماء الاعمال انما هي رموز واشارات الاحقا فهم كقولهم ان الصلوة معرفة اسرارنا، والصيام، كتمان اسرارنا، والحج زيارة شيوخنا القدسين وامثال ذالك[1]

"قرامطہ جو صابی فلاسفہ اور ثنوی مجوس سے مشابہت رکھتے ہیں، انھوں نے تحریف کی اور احکام کو کالعدم کیا، انھوں نے ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اسی طرح عبادت میں تحریف کی اور شریعت کے اندر وارد شدہ عبادات کے اسمار کو رموز واشارات قرار دیا۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے نماز ہمارے اسرار کا نام ہے اور روزہ اسرار کو پوشیدہ رکھنے کا اور حج ہمارے مقدس شیوخ کی زیارت کا نام ہے۔ اسی طرح دوسرے امور ہیں"

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تفسیر لکھی تو اس زمانہ میں گرچہ معتزلہ اور فرقہ قرامطہ کے پیش آمدہ مسائل نہ تھے لیکن ان مسائل کی اصلیت بھی وہی قدیم شبہات تھے جن کو جدید طریقہ پر پیش کیا گیا تھا اور علمارِ اسلام کو اس کا جواب دینا تھا۔ حکیم الامتؒ سے پہلے جن لوگوں نے اُردو میں تفسیریں لکھیں اور مسائل کلامیہ سے بحث کر کے دورِ جدید کے شبہات کو دور کرنے کی کوشش کی ان میں سرِ فہرست سرسید احمد خاں تھے۔ انھوں نے شبہات کو دور کرنے کے لیے عقلی طریقہ اختیار کیا اور اپنے طور پر سائنٹفک طریقہ سے روشن خیال لوگوں کو علوم جدیدہ کے پیدا کردہ شبہات سے بچانے کی کوشش کی

[1] تالیف شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، طبع مصر

گویا انھوں نے جدید دور کے مطابق عقل ونقل کے درمیان تطبیق کی کوشش کی اور یورپ کے سائنسدانوں اور فلسفیوں کو تشفی بخش جوابات دینے سے پہلے قرآن کی آیات کو عقل وسائنس کے مطابق ڈھالا، لیکن عقل ونقل کے درمیان تطبیق کے سلسلے میں سرسید کے قلم میں بھی معتزلی اور باطنی مفسرین کی طرح شدید لغزش آئی۔ اور عقل ونقل کی تطبیق میں شرح وتفسیر کے دائرے سے نکل کر تاویل بے جا کی منزلوں میں آگئے۔ بعض مرتبہ قرآن کی آیتوں کی ایسی تاویل کی کہ وہاں تاویل کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ سرسید کی اس تاویلی کوشش نے علمار کے ایک طبقہ میں جو سلف صالحین کے مسلک کے پابند تھے اور اس کو برحق سمجھتے تھے ایک ہیجان پیدا کر دیا اور انھوں نے ان کو جواب دینے پر مجبور کر دیا۔

سرسید کے بعد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مکمل تفسیر "البیان القرآن" میں جدید شبہات کا جواب دیتے ہوئے تاویل وتحریف سے کام نہیں لیا۔ اگرچہ انھوں نے بھی عقلی طور پر بعض مسائل کو ثابت کیا اور عقلی طور پر پیدا شدہ شبہات کی تردید کی، حکیم الامت تھانویؒ نے اگرچہ اس کا عنوان عقل ونقل کی تطبیق کا نہیں دیا ہے، لیکن دراصل عقل ونقل ہی کے پیدا شدہ شبہات کی تردید کی ہے۔ اس لیے یہاں عقل ونقل کے درمیان تطبیق کے سلسلہ میں ان کی رائے جاننا ضروری ہے کہ کیا وہ عقلیات و شرعیات کی تطبیق کو ضروری سمجھتے ہیں؟

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مکمل بیان القرآن میں نقلیات کے عقلی ہونے کی صراحت کی ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ اسلام کے اصولی مسائل مثلاً توحید ورسالت وغیرہ تمام تر عقلی مسائل ہیں۔ عقلیات سے ان کا کوئی تصادم نہیں ہے بلکہ وہ عین مطابق عقل ہیں۔ البتہ فروعات کا عقلی ہونا ضروری نہیں ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ وہ فروعات عقلیات کے متعارض نہیں ہو سکتے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اسلام کے اصول یعنی توحید ورسالت مسائل عقلی ہیں، جیسا آیت یَعْقِلُوْنَ اس طرف اشارہ ہے اور فروع کا عقلی ہونا ضروری نہیں۔ البتہ کسی دلیل قطعی کے خلاف نہ ہونا ضرور ہے۔ افسوس ہے کہ آج بھی نوخیز طبائع ان دونوں کو

مخلوط کر کے عجب چکر میں پڑ جاتے ہیں جس کا آخری انجام بددینی ہے، خوب سمجھ لو۔[۱]"

حکیم الامتؒ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ فروعات کا عقلی ہونا ضروری نہیں، یعنی یہ ضروری نہیں کہ عقلی دلیل سے ان کا صحیح ہونا سمجھ میں آجائے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ فروعات ان عقلی دلائل سے متعارض نہیں ہو سکتے، جن کی صحت پر اتفاق ہے۔ یہاں پر اس کی وضاحت بھی اہم کردینا کہ حکیم الامتؒ کا یہ نظریہ تطبیق بین العقل والنقل ہے سلف صالحین کے نظریہ کے مطابق ہے۔ متقدمین میں یہ نظریہ صراحت کے ساتھ ابن تیمیہؒ کے یہاں ملتا ہے۔ جنھوں نے عقل و نقل کے درمیان تطبیق کے لیے "کتاب الموافقۃ" لکھی ہے۔ چنانچہ انھوں نے تصریح کی ہے کہ عقل و نقل کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے۔ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

" المنقول الصحیح لا یعارضہ معقول صریح قط، وقد تاملت ذالک فی عامۃ ما تنازع الناس فیہ فوجدت ما خالف النصوص الصحیحۃ الصریحۃ شبہات فاسدۃ یعلم بالعقل بطلانہا بل یعلم بالعقل ثبوت نقیضہا الموافق للشرع وھذا تاملتہ فی مسائل الاصول الکبار، کمسائل التوحید والصفات ومسائل القدر والنبوات والمعاد وغیر ذلک ووجدت ما یعلم بصریح العقل لم یخالفہ سمع قط، بل السمع الذی یقال انہ یخالفہ اما حدیث موضوع او دلالۃ ضعیفۃ۔ فلا یصح ان یکون دلیلاً لو تجرد عن معارضۃ العقل الصریح فکیف اذا خالفہ صریح المعقول"[۲]

حکیم الامت تھانویؒ کے یہاں بھی چونکہ عقل و نقل کی تطبیق وہی سلف صالحین کا نظریہ تھا، اس لیے انھوں نے نقلیات کو عقلیات سے قریب تر کیا اور اپنے زمانہ کے پیدا شدہ شبہات

---

[۱] مکمل تفسیر بیان القرآن جلد اول، سورہ بقرہ ص ۹۲، طبع شدہ تاج پبلشرز دہلی"

[۲] "الموافقۃ" ج ۱، ص ۸۶، (مصری)

کو رائل کرنے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے التزاماً انھوں نے دورِ حاضر کے پیدا شدہ تمام شبہات کا استیعاب نہیں کیا بلکہ شبہات کے جواب دینے میں صرف ان شبہات کو خاص کیا ہے جن کا مرجع کوئی دلیل صحیح تھی جیسا کہ حکیم الامتؒ نے اپنے نہج کے بارے میں اپنے مقدمہ میں لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"شبہات کے جواب دینے میں صرف ان شبہات کو خاص کیا ہے، جن کا منشاء کوئی دلیل صحیح تھی، جیسے کوئی آیت یا کوئی حدیث یا کوئی امر ثابت بالعقل یا بالحس" اور جن کا منشاء کوئی امر صحیح نہیں ہے بلکہ وہ خود بلا شبہ دعویٰ بلا دلیل ہے، اس کے جواب میں چونکہ طلب دلیل کافی ہے، اس لیے اس سے تعرض نہیں کیا گیا اور بہت سے شبہات نفس تقریر و ترجمہ سے مندفع ہو گئے۔"[۱]

اس طرح انھوں نے مباحث کلامیہ متعلقہ ذات و صفات وغیرہ میں وارد شدہ شبہات کو انتہائی ایجاز و اعجاز کے ساتھ رفع کیا ہے اور طبقہ خواص اور طبقہ عوام دونوں کے ذہن کو ملحوظ رکھا ہے۔ کلامی بحث میں جہاں طبقہ خواص علماء کو پیچیدہ بحث پر متنبہ کرنا ہوتا ہے وہاں وہ حاشیہ کی عربی عبارت میں تحریر کرتے ہیں اور اعتراضات کو دفع کرتے ہیں، لیکن اس میں بھی اختصار ہی سے کام لیتے ہیں۔ انھوں نے کلامی مباحث کو زیادہ پھیلایا نہیں ہے۔ بلکہ شبہات واردہ کو اختصار کے ساتھ صرف مندفع کیا ہے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

"مسائل کلامیہ فقہیہ کی ہر آیت کے متعلق اسی قدر تحقیق پر اکتفا کیا گیا ہے جس پر تفسیر قرآن کی موقوف تھی۔"[۲]

حضرت تھانویؒ متکلمین کے مباحث عقلیہ کو اپنی تفسیر میں سمیٹ کر قاری کے ذہن کو پراگندہ و پریشان نہیں کرتے ہیں بلکہ اختلافیات سے انھوں نے احتراز کیا ہے اور اگر کہیں خواص کا خیال کر کے ذکر بھی کیا ہے تو عربی عبارت میں، تاکہ خفی الاستنباط فقہیات و کلامیات میں عوام نہ پڑیں

---

[۱] خطبہ تفسیر بیان القرآن جلد اول ص ۵

[۲] ،، ایضاً ،، ،، ۶۰

بلکہ کلامیات کے عقلی دلائل بیان کرتے وقت بھی ان کا اندازِ بیان خالص علمی اور منطقی ہوتا ہے اور دلائل میں انھوں نے منطقی قواعد کی پوری رعایت کی ہے۔ وہ اپنے مقدمہ میں خود لکھتے ہیں:

"تقریرِ مدلول آیات میں قواعد میزانیہ منطقیہ کی پوری طور سے رعایت کی گئی ہے جس کا لطف اذکیاء اور علماء کے جی سے پوچھنا چاہیے۔" [1]

لیکن مدلولات کی تقریر حضرت حکیم الامتؒ نے جس انداز اور اختصار سے کی ہے اس کو گہری نظر سے پڑھنے والے علماء ہی سمجھ سکتے ہیں، جو علوم رابعہ منطقیہ سے واقف ہوں، چونکہ ان کے پیشِ نظر علماء مدارس بھی تھے اس لیے ان کی زبان میں کلام کیا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھوں نے جدید ذہن کی رعایت نہیں کی ہے۔ بلکہ انھوں نے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے شبہات کی بھی رعایت کی ہے اور ان کا جواب اس قدر سلیس مختصر دیتے ہیں کہ تمام شکوک منٹوں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ حضرت تھانویؒ جدید علوم کے پیدا کردہ تمام شبہات سے واقف نہ تھے اور انھوں نے ان کتابوں کو پڑھا تھا اس لیے بہت سے ایسے نظریات کی تردید ان کی تفسیر میں نہیں ملتی ہے جو جدید دور کی پیدا کردہ ہیں۔ البتہ بعض جگہوں پر انھوں نے آیات کی تشریح ہی ایسی کی ہے جس سے پیش آمدہ شبہات ختم ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہم مسائل کلامیہ میں سے چند کو لے کر ناقدانہ جائزہ لیتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ حکیم الامتؒ نے علم کلام کی پیچیدہ بحثوں میں کون طریقہ استعمال کیا ہے۔ کہاں تک شبہات کی علمی تنقید میں وہ کامیاب ہیں اور اپنے نوکِ قلم کو "تاویل و تحریف" سے کس قدر بچایا ہے۔

حکیم الامتؒ کا قلم کلامیات میں اشاعرہ و ماتریدیہ کے نقشِ قدم پر چلتا ہے اور انھوں نے عقاید کے باب میں اس سے بالکل انحراف نہیں کیا ہے۔ ذات و صفات کے باب میں تشریح کرتے ہوئے انھوں نے امام مالکؒ کے اس جملہ کی پیروی کی ہے جسے انھوں نے استوٰی علی العرش کے بارے میں پوچھنے والے سے کہا تھا کہ:

---

[1] خطبہ تکمل بیان القرآن، ج ۱، ص ۶

"الاستوا معلوم، والکیف مجھول، والایمان بہ واجب والسوال عنہ بدعۃ" [1]

اس مسلک کی تشریح کرتے ہوئے آیت وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ، میں لکھتے ہیں:

"اور اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب آپ سے میرے بندے (قرب اور بُعد) میرے متعلق دریافت کریں تو آپ میری طرف سے اُن سے فرما دیجیے کہ میں قریب ہی ہوں اور باستثناء نامناسب درخواست کے منظور کر لیتا ہوں ہر عرضی درخواست کرنے والے کی جب کہ وہ میرے حضور میں درخواست دے۔" [2]

آگے فائدہ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"یہ جو فرمایا کہ جب دریافت کریں، سو ایک شخص نے دریافت کیا تھا اور یہ جو فرمایا کہ میں قریب ہوں تو جیسے حق تعالیٰ کی ذات کی حقیقت بے چون و چگون ہونے کی وجہ سے ادراک نہیں کی جا سکتی، اسی طرح ان کی صفات کی حقیقت بھی معلوم نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ایسے مباحث میں زیادہ تفتیش جائز نہیں، اجمالاً اتنا سمجھ لیں کہ جیسی ان کی ذات ہے، اُن کی شان کے مناسب ان کا قرب بھی ہے۔" [3]

قربِ خداوندی کے بارے میں انھوں نے تاویل سے بالکل کام نہیں لیا، اور نہ یہ بحث کی کہ قرب سے مراد قربِ ذاتی ہے یا صفاتی، البتہ وہ مطلقاً تاویل کے منکر بھی نہیں ہیں جیسا کہ "بیان القرآن" کے حاشیہ پر رسالہ "التواجہ بما یتعلق بالتشابہ" میں انھوں نے اس کی صراحت کی ہے بلکہ ان لوگوں کی تغلیط بھی کی ہے جو مطلقاً مسلک تاویل کو باطل کہہ کر ہزاروں اہلِ حق کی تضلیل کرتے ہیں۔ [4] تاویل کے باب میں حضرت تھانویؒ کا مسلک اشاعرہ اور ماتریدیہ کا ہے جو تاویل کو

---

[1] حاشیہ بیان القرآن، ج ۲، ص ۳

[2-3] تکمل بیان القرآن، ج اوّل، ص ۱۰۵

[4] دیکھیے حاشیہ بیان القرآن، ج ۲، ص ۳-۴

کو جائز قرار دیتے ہیں اور ذات و صفات کے باب میں غلو فی التاویل نہیں کرتے۔ حضرت تھانویؒ کے غلو فی التاویل نہ کرنے کی مثالیں "بیان القرآن" میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ ان تمام مقامات پر جہاں ہندوستان کے دوسرے مفسرین مثلاً سر سید احمد خاں وغیرہ جدید علوم اور مستشرقین سے متاثر ہو کر لغزش کھا گئے ہیں وہاں ان کا قلم مسلک سلف پر انتہائی ایجاز و اعجاز اور معقول انداز میں چلتا ہے۔

رفع عیسیٰ علیہ السلام

حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے فکر کی صلابت و درستگی اور افراط و تفریط سے سلامت روی اور تطبیق میں عقل و نقل کی بہترین مثال سورہ آل عمران کی بحث رفع عیسیٰ علیہ السلام ہے، جہاں انھوں نے سینکڑوں صفحات کا نچوڑ اس طرح عقلی و نقلی انداز میں پیش کیا ہے کہ قرآن کا ذکی طالب علم پھڑک اٹھتا ہے۔ اس بحث میں جہاں ان کے ہم عصر اور ان سے قبل سر سید وغیرہ لغزش کھا گئے تھے انھوں نے مستشرقین کے مباحث سے مرعوب ہوئے بغیر قرآن کے مدعا و منشا کی پیروی کی ہے اور بے جا تاویل سے احتراز کیا ہے۔ یہاں ان کی بحث کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔ حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

"یہود کہتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام مصلوب ہو کر دفن ہوئے اور پھر زندہ نہیں ہوئے اور عیسائی کہتے ہیں کہ بعد صلب و دفن کے زندہ ہو کر آسمان پر گئے۔ قرآن مجید نے اس قول "مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ" سے دونوں کی نفی فرما دی اور ان کے منشا اشتباہ پر "وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" میں تنبیہ۔

اگر کوئی منکر مدعی تواتر کا ہو تو جواب ظاہر ہے کہ وہاں موافقین تو خوف کے مارے جمع تھے نہیں، صرف مخالف یہودی تھے، سو اولاً وہ قلیل جو تواتر کے لیے کافی نہیں، ثانیاً تصرف الٰہی سے ایک شخص ان کا ہم شکل بنا دیا گیا، ان کو خود اشتباہ ہو گیا، اور بقول بعض علماء حاضرین کے غلط خبر اڑا دینے سے غائبین پر امر مشتبہ ہو گیا۔ بہرحال مشاہدہ نہ رہا، ثالثاً ان کا عدد ہونا خود مجوز

تواطؤ علی الکذب ہے، پس شرائط تواتر کے مفقود ہوئے۔[۱]

مزید اشکالات کو رفع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تنبیہ ضروری ۔ تقریر تفسیر سے بعض ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہو گئی جو آج کل دعویٰ بلا دلیل کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو گئی اور آپ مدفون ہو گئے اور پھر قیامت کے قریب تشریف نہ لاویں گے۔ اور اس بنا پر جو احادیث عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے متعلق ہیں، ان میں تحریف کی ہے کہ اس سے مثیل عیسیٰ ہے اور پھر اس مثیل کا مصداق اپنے کو قرار دیا ہے اور اس مدعی کے کل شبہات کے دو امر ہیں، ایک نقلی دوسرا عقلی۔ نقلی یہ کہ حق تعالیٰ نے آپ کے بارے میں لفظ "مُتَوَفِّيْكَ" فرمایا ہے۔ عقلی یہ ہے کہ جسد عنصری کا آسمان پر جانا محال ہے اور اس بنا پر قصۂ معراج میں تاویل کی ہے۔

نقلی دلیل کا جواب ظاہر ہو گیا کہ اگر متوفیک کے معنی وفات کے بھی لیے جاویں، تب بھی یہ وعدہ باعتبار وقت نزول من السماء ہے۔ اس سے وقوع موت یا نفی رفع یا حیات فی الحال کی لازم نہیں آتی۔ اور دوسرے دلائل سے رفع و حیات ثابت ہے۔ پس اس کا قائل ہونا ضروری ہے۔ رفع تو آیت "رَفَعَهُ اللّٰهُ" سے جو اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے نص ہے رفع الجسد میں اور بلا تعذر معنی حقیقی کے مجازی لینا ممتنع ہے اور دلیل تعذر مفقود ہے اور حیات احادیث و اجماع سے ثابت ہے۔"

حضرت تھانویؒ نے یہاں علامہ انور شاہ کشمیری کی کتاب "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" اور امام سیوطیؒ کی "الدر المنثور" و ابن اثیر سے احادیث نقل کیا ہے، پھر علماء امت کا اجماع نقل کیا ہے، اور عقلی دلیل کے جواب میں لکھا ہے:

"اور عقلی دلیل کے جواب کے لیے "اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" کافی ہے۔ البتہ جو امور ممتنع بالذات ہیں وہ عموم قدرت سے مستثنیٰ ہیں، ان کا عدم وقوع یقینی ہے اور رفع الجسد کا امتناع نہ ثابت ہوا اور نہ ثابت ہو سکے گا۔ پس

[۱] بیان القرآن، جلد۲ ص۲۳

دعویٰ مدعی کا محض باطل اور گمراہی ہے اور تحریف احادیث کی بنا الفاسد علی الفاسد ہے۔ پھر یقیناً مصداق ترجیح بلا مرجح ہے۔ دوسرا شخص ایسے مثیل ہونے کا اپنے لیے دعویٰ نہیں کرسکتا۔"[1]

حضرت تھانویؒ نے اس بحث میں منطقی و فقہی طرز پر استدلال اور فقہی منطقی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔ عموم مشترک، امتناع، بناء الفاسد علی الفاسد، ترجیح بلا مرجح۔ اس بحث کے علاوہ بھی انھوں نے دوسری جگہوں پر بحث کرتے ہوئے منطقی قواعد و اصول کی رعایت کی ہے۔ جس کا عام ترین فائدہ تو یہ ہوا ہے کہ جس وقت وہ کتاب لکھ رہے تھے اور جن لوگوں کو سامنے رکھ کر تفسیر کر رہے تھے، ان کا دماغ منطقی طرز استدلال اور منطقی اصطلاحات سے مانوس تھا اور اس طرز کو اختیار کرنے سے طویل خامہ فرسائی سے نجات مل گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کی تفسیر جامعیت کی شکل میں آگئی ہے اور تمام مباحث ضروریہ اس کے اندر جمع ہوگئے ہیں۔

حضرت تھانویؒ کی متکلمانہ جامعیت وعبور اور دقیقہ رسی کا اندازہ "بیان القرآن" کی ابتدائی چار پانچ جلدوں میں زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ ان جلدوں میں کلامی مباحث پر زیادہ لکھا ہے اور آخر کی جلدوں میں کلامی آیات کی مناسبت سے سابقہ بحثوں کے حوالے پر اکتفا کرتے ہیں۔ حضرت تھانویؒ کے ان کلامی مباحث کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے کلامی آرا کو نقل کرنے سے احتراز کیا ہے۔ اور تفسیر قرآن کو متکلمین اسلام کی آرا کا مجموعہ نہیں بنایا ہے، لیکن اس کے باوجود کلامی مباحث کے سلسلہ میں جن کتابوں سے مدد لی ہے ان کا کچھ تذکرہ "بیان القرآن" میں ملتا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) روح المعانی، سید محمود آلوسی۔
(۲) شرح عقائد، امام نسفی۔
(۳) التصریح بما تواتر فی نزول المسیح
(۴) رسالۃ التوجیہ الی ما فیہ التشابہ
(۵) رسالہ الفرش وغیرہ

[1] تکمیل بیان القرآن، ج ۲، ص ۲۳-۲۴

اگرچہ متقدمین کے یہاں تفسیر کا کافی ذخیرہ ہے اور انھوں نے قرآن کے کلامی حصوں پر تفصیل و تحقیق سے بحث کی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس دور کے کلامی شبہات کے لیے وہ تفسیریں مکمل طور پر کفایت نہیں کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ شبہات ان شبہات سابقہ سے کچھ نئے ہیں۔ اگرچہ مکمل طور پر نئے نہیں ہیں۔ اس لیے موجودہ علم کلام کے لیے حضرت تھانویؒ کی تفسیر "بیان القرآن" عظیم اہمیت کی حامل ہے، جس کے اختصار و تحقیق کے ساتھ مسلک سلف کی پوری پوری وکالت ہے اور وارد شدہ شبہات کا تحقیقی جواب بھی دیا گیا ہے۔ حضرت تھانویؒ کو شاہ ولی اللہؒ کے فکری نہج اور حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے کلامی مباحث سے بڑی روشنی ملی ہے۔ اس لیے ان کی فکر کلامیات میں صائب اور گہری رہتی ہے اور وہ خدا کی ذات وصفات کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں اور کلام خداوندی قرآن مجید کے اوپر وارد شدہ شبہات کا تحقیقی جواب دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے "بیان القرآن" اول میں کفار قریش کی شقاوت ازلی کے بارے میں جو دقیق ترین تحقیق پیش کی ہے وہ فکر و تحقیق کا بہترین کارنامہ ہے۔ اس تحقیق میں انھوں نے معقولات کو محسوسات کے پیرایہ میں پیش کیا ہے چنانچہ آیت "ان الذین كفروا سواء عليهم ءانذرتهم ام لم تنذرهم لا يؤمنون" کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"ترجمہ: بے شک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں، برابر ہیں ان کے حق میں، خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لاویں گے۔"[1]

ف: کوئی یوں شبہ نہ کرے کہ کافر تو بہت سے ایمان لے آتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس آیت میں سب کافروں کا بیان نہیں ہے بلکہ خاص ان کافروں کا ذکر ہے جن کی نسبت خدا تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوگا۔ اور اس آیت سے یہ غرض نہیں کہ ان کو عذاب الٰہی سے ڈرانے اور احکام سنانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص منصبی کام تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ ان کے ایمان لانے کی فکر نہ کریں اور ان کے ایمان نہ لانے سے مغموم نہ ہوں۔ ان کے ایمان لانے کی امید نہیں۔ اور اس سے یہ لازم نہیں

[1] بیان القرآن، جلد ۱، ص ۳۴

اتنا کہ پھر ایسوں کو احکام سنانا عبث ہوا. تو عبث فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں سپرد ہوا. بات یہ ہے کہ عبث اس کو کہتے ہیں جس میں کوئی فائدہ نہ ہو. یہاں اگر ان لوگوں کو فائدہ نہ ہوگا، نہ ہو، رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو فائدہ ہوگا. کہ ادائے پیغام کا ثواب ملے گا، پھر عبث کیسے ہوا؟

مزید محسوسات کے ذریعہ ایک اہم شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

تنبیہ :۔ "کوئی یوں نہ سمجھے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی نسبت یوں خبر دیدی اور خدا تعالیٰ کی خبر کے خلاف واقع ہونا محال ہے. تو اب ایمان نہ لانے میں ان کو معذور سمجھنا چاہیے؛"

بات یہ ہے کہ یہ فرمانا تو ایسا ہے جیسے طبیب حاذق کسی مریض مبتلائے دق کی نسبت کہے کہ اس کی دق درجہ چہارم پر پہنچ گئی ہے یہ اب اچھا نہ ہوگا. سو ظاہر ہے کہ وہ مریض اس طبیب کے اس کہنے سے مدقوق نہیں ہو گیا، مدقوق تو اپنی کسی بے احتیاطی کے سبب پہلے سے ہے. بلکہ طبیب کا یہ کہنا خود اس کے مدقوق ہونے کی وجہ سے ہوا ہے. اسی طرح یہاں یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کافر کا ناقابلِ ایمان ہونا اللہ تعالیٰ کی اس خبر دینے سے نہیں ہوا ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا یہ خبر دینا اس کافر کے ناقابلِ ایمان ہونے کی وجہ سے واقع ہوا ہے اور ناقابلِ ایمان ہونے کی صفت خود اس کی شرارت و عناد و مخالفتِ حق کے سبب پیدا ہوئی ہے"[1]

اس طرح حضرت تھانویؒ کی عبقریت معقول و منقول کے درمیان "بیان القرآن" میں پھیلی ہوئی ہے اور وہ متقدمین میں سے فراق مبتدعہ معتزلہ وغیرہ پر بھی حاشیہ کی عربی عبارت میں تردید کرتے ہیں. البتہ موجودہ دور کے مستشرقین کی تردید حوالہ کے ساتھ ان کی تفسیر میں نہیں ملتی ہے.

---

[1] بیان القرآن جلد ۱، ص۵

تفسیر بالماثور کے نکتۂ نظر سے تفسیر بیان القرآن

حضرت تھانویؒ کی تفسیر کی خاص خوبی ان کا سلف صالحین کے مضبوط اصولوں اور تفاسیر کی پیروی ہے. حضرت تھانویؒ کا پایۂ علم حدیث میں عمیق و وسیع تھا. وہ ایک متبحر عالم حدیث اور دقیق النظر محدث تھے. ان کی حدیثی واقفیت کا صحیح اندازہ اس کتاب سے ہوتا ہے جس کی تالیف انھوں نے اپنی نگرانی میں علامہ ظفر احمد تھانویؒ سے کرائی تھی. چونکہ احادیث پر ان کا کامل عبور تھا اور قرآن کے شارح اوّل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیروں سے وہ واقف تھے، اور قرآن کے خدائی کتاب کی حیثیت سے اس کی عظمت و جلالت، رسولِ خداؐ کی عصمت اور دیگر انسانوں کی بشری بھول و چوک سے آگاہ تھے. اس لیے وہ اوّلاً رسولِ خداؐ کی تفسیر کو جگہ دیتے ہیں اور اس کے مقابلے میں کسی کا قول اختیار نہیں کرتے. چنانچہ وہ خود اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"جن آیات کی تفسیر میں حدیث مرفوع آئی ہے اس کے مقابلے میں کسی کا قول نہیں لیا گیا ہے"[1]

روایاتی تفسیر کا انھوں نے اس قدر التزام کیا ہے کہ حاشیہ کی عربی عبارتیں مستقلاً روایات کی صحت و سقیم اور ضعف و صلابت پر بحث کرتے ہیں اور اس طرح ان تمام احادیث کا احاطہ کر لیا ہے جو کتب حدیث میں قرآنی آیات کی تفسیر سے متعلق وارد ہوئی ہیں. اس سلسلہ میں صحاح ستہ کے علاوہ جو حدیث کا ذخیرہ ان کے پیش نظر رہتا تھا وہ "لباب النقول"

---

[1] بیان القرآن ج ۱، مقدمہ ص۲

در منثور اور تفسیر ابن کثیر وغیرہ پر مشتمل ہے۔ تفسیری روایات میں حضرت تھانوی کا التزام صرف صحیح روایتوں کا ہے۔ جیسا کہ اس کی صراحت انھوں نے اپنے مقدمہ میں کی ہے۔[1]

حدیث کے بعد جس بنیاد پر انھوں نے تفسیر لکھی ہے، وہ صحابہؓ کا تعامل ہے۔ اس لیے سلف صالحینؒ جنھوں نے صحابہؓ کی تفسیروں پر اپنے اقوال کی بنیاد رکھی ہے ان کے مقابلہ میں متاخرین کے اقوال کو جو سلف صالحین کے خلاف تھے انھوں نے نہیں لیا ہے۔ چونکہ انھوں نے تفسیر بالماثور عن الرسول وعن الصحابہ کی پیروی کی ہے اور بیان القرآن میں احادیث نبویؐ اور آثارِ صحابہؓ کی پوری رعایت رکھی ہے اور ساتھ ساتھ امورِ عقلیہ کا بھی التزام کیا ہے۔ اس لیے ان کی یہ تفسیر اُردو تفاسیر کے درمیان تحقیق و تنقید اور تدقیق و تنقیح کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے جس سے نقلیات کا صحیح علم اور روایتوں کی صحت وضعف کا عرفان ہوتا ہے۔

یہاں اس کا تذکرہ ضروری ہے کہ حضرت تھانویؒ تفسیر میں روایتوں کی صحت اور تفسیر بالماثور کے التزام میں پہلے شخص نہیں ہیں۔ بلکہ ان سے قبل "فتح المنان" کے مصنف شاہ عبدالحق حقانی دہلوی اپنی تفسیر میں روایات صحیحہ اور تفسیر بالماثور کا نمونہ پیش کر چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس طریقۂ تفسیر کا ذکر "فتح المنان" کے مقدمہ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اس تفسیر میں روایت کو کتب حدیث سے اور درایت اس فن کے علمائے محققین سے نہایت احتیاط کے طور پر جمع کیا ہے۔"

نیز لکھتے ہیں:

"کوئی حدیث بغیر مستند کتب صحاح ستہ وغیرہا کے نہیں لائے۔"[2]

قرآن کی آیتوں اور سورتوں کی شانِ نزول میں مفسرین کی حدیثی واقفیت کی کمزوری سے بہت موضوع اور باطل احادیث داخل ہو گئی تھیں۔ اس لیے حضرت تھانویؒ نے شانِ نزول کے باب میں اس کا خاص اہتمام کیا ہے کہ ضعیف یا موضوع احادیث نہ آنے پائیں۔ شانِ نزول

[1] بیان القرآن ج ۱، مقدمہ ص ۵

[2] فتح المنان معروف بتفسیر الحقانی ص ۱۲۰

کے بیان احادیث و روایات آپس میں متعارض و متصادم بھی ہوتی ہیں اور بعض مرتبہ ایک ہی آیت کے بارے میں مختلف صحابہؓ سے مختلف واقعات نزول منقول ہوئے ہیں۔ ایسی جگہوں پر انھوں نے حاشیہ کی عربی عبارت میں تطبیق دی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اختلاف کے وجوہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اعلم انه ربما يقع اختلاف بين الروايات في سبب النزول ووجه الجمع بينهما ان السبب واحد منها والاخرى مقصودها بيان دخول الحكم الفلاني في عموم الامية، لا بيان لسبب كما نقل السيوطي في "لباب النقول" عن الزركشي، قال في البرهان قد عرف من عادة الصحابة والتابعين ان احدهم اذا قال نزلت هذه الاية، في كذا، فانه يريد بذالك انها تتضمن هذا الحكم. لان هذا كان السبب في نزولها فهو من جنس الاستعمال علم الحكم بالاية لا من جنس النقل لما وقع۔"

نیز آگے لکھتے ہیں:

"اور ایک صورت جمع کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آیت بعد واقعات متعددہ کے نازل ہوئی اور چونکہ آیت میں خود اشارہ کسی واقعہ مخصوصہ کی طرف ہوتا نہیں، اس لئے ممکن ہے کہ بعض لوگ تو کسی کو سبب نزول کا سمجھ رہے ہیں اور بعض لوگ دوسرے واقعہ کو اور اسی بنا پر اختلاف روایات اسباب نزول آیت میں آ گیا ہو، و نیز مجموعہ واقعات بھی سبب نزول آیت ہو سکتے ہیں۔"[1]

تفسیر بالماثور کا دوسرا اہم فائدہ صفات الٰہی، معجزات وغیرہ کے باب میں آیا ہے۔ کلامیات کے سلسلے میں احادیث نبویؐ اور تفاسیر سلف صالحین کو جن لوگوں نے مدِ نظر نہیں

[1] حاشیہ عطیہ بیان القرآن ج ۱، ص ۴

رکھا ہے۔ وہ افراط و تفریط کے بلکہ تاویل و تحریف کے سرے تک جا پہنچے ہیں۔ عقائد کے بارے میں وہ تشریحی معتبر ہوتی ہیں، جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و سلف صالحین سے مروی ہوں۔ ان کے علاوہ دیگر تفاسیر و تشریحات جو ان کی ذہنی کاوشوں کا ثمرہ ہوتی ہیں، معتبر نہیں ہوتی ہیں، کیونکہ خدا لم یزل کی ذات بے چون و چگوں اور ماورائے سرحد ادراک ہے۔ اس ذات کی کنہ و حقیقت تک رسائی رسول کے علاوہ کسی کے بس کی بات نہیں۔

حضرت تھانویؒ جس مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے پاس سلف صالحین کی تفسیروں کا ذخیرہ تھا اور اس مکتب فکر کا مزاج خود تفسیر بالماثور کا تھا۔ وہ احادیث اور اقوالِ صحابہؓ سے ہٹ کر تفسیر کرنا صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے جب حضرت تھانویؒ تفسیر لکھنے کے لیے بیٹھے تو اپنے مزاج کو بھی ایسا ہی پایا اور کتب سلف کی تفسیروں کو سامنے رکھ کر اردو میں "بیان القرآن" لکھا۔ چنانچہ خاص طور پر انھوں نے جن کتابوں کو سامنے رکھا ان تفسیروں میں روح المعانی، تفسیر ابن کثیر، تفسیر الدر المنثور، تفسیر بیضاوی، معالم التنزیل، خازن وغیرہ ہیں۔ یہ تمام تفسیریں تفسیر بالماثور کی پیروی کرتی ہیں اور ان کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کی تفسیریں یکجا ملتی ہیں۔ اس لیے حضرت تھانویؒ کو تفسیر بالماثور کے لیے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑی ہے، کتابیں دستیاب تھیں اور معتمد تھیں اس لیے ان سے نقل کرنے پر اعتماد کر کے اپنی تفسیر لکھی ہے۔

تفسیر بیان القرآن کی فقہی حیثیت

علوم اسلامیہ میں علم تفسیر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، اس لیے علم تفسیر کا موضوع "کتاب اللہ" ہے جو پورے دین کی اساس ہے۔ اسی لیے فہم قرآن اہم ترین دینی فریضہ ہے اور قرآن کا موضوع ہدایت ہے۔ انسان اپنی معاش و معاد دونوں ہی میں ہدایت الٰہی کا محتاج ہے۔ اس لیے کہ اس کائنات کا مطالعہ ایسے خالق کی نشان دہی کرتا ہے جو حی و قیوم اور قادرِ مطلق ہے اور ساتھ ہی ساتھ رحمان و رحیم بھی، صاحبِ عدل بھی اور صاحبِ عفو بھی۔ انسان اس خالق کے سامنے جواب دہ ہے۔ انسان کی موت ابدی موت نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کی تمہید ہے

اسی لیے آگے مرنے کے بعد خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا۔ اور وہ اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پائے گا۔ پس آدمی نہ صرف دنیاوی زندگی میں فلاح کا خواہش مند ہے بلکہ مرنے کے بعد جو زندگی آئے گی، وہاں بھی وہ نجات اور فوز و فلاح کا طالب ہے۔ خدائے رحمان و رحیم نے انسانوں کی ہدایت کے لیے نبی بھیجا اور نبیوں پر کتابیں اتاریں۔ اور سب سے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور سب سے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سب سے آخری کتاب "قرآن" کا نزول ہوا۔ پس قرآن انسان کی دنیوی زندگی کو اس صراطِ مستقیم پر چلانے کے لیے نازل ہوا جو اس کے لیے صرف یہ کہ دنیا میں امن و راحت اور سکون و طمانیت روحانی کا ذریعہ، بلکہ آخرت میں بھی نجات و فلاح کا ضامن ہو۔ اسی لیے قرآن ان بنیادی عقائد کی طرف راہ بری کرتا ہے جو اس کائنات کے مبدا و معاد، کائنات میں انسان کی حیثیت، خدائے حی و قیوم کی ذات و صفات، حیات بعد الموت، رسالت و نبوت، کتب سماویہ، ملائکہ، جنت و جہنم وغیرہ ما بعد الطبیعاتی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں۔

اسی طرح قرآن انسانوں کو پسند و ناپسند سکھاتا ہے۔ اخلاق عالیہ، عادات قبیحہ، اعمال فاضلہ اور خصائل رذیلہ کی نشاندہی کرتا ہے، انسانی لاشعوری گرہیں کھولتا ہے، اور اس کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کمالات کے تحصیل کا شوق پیدا کرتا ہے۔

إن الإنسان لربه لكنود

إن الإنسان خلق هلوعا۔ إذا مسه الشر جزوعا

وإذا مسه الخير منوعا

إذا مس الإنسان ضر دعانا

نسوا الله فأنساهم أنفسهم

اسی طرح قرآن انسان کی انفرادی، عائلی اور اجتماعی زندگی کو زیر بحث لاتا ہے، قومی اور بین الاقوامی تعلقات پر گفتگو کرتا ہے، معاہدات کے اصول بتاتا ہے، معاشرتی تعلقات کی استواری کے طریقے بتاتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ کاروبارِ تجارت کیا حلال ہے اور کیا حرام؟ حکمرانی کے کیا اصول ہیں؟ اور جنگ و صلح کے کیا ضابطے ہونے چاہئیں۔ اس طرح ایک

انتہائی مہذب اور وسیع تر سوسائٹی کو منظم کرنے کے لیے جامع ترین قوانین اپنی ساری شاخوں کے ساتھ قرآن کا موضوع ہیں۔

قرآن کتابِ عبرت و نصیحت بھی ہے، اس کی باتیں دلوں کو چھو لیتی ہیں، وہ مخاطب کے دلوں میں چھپی معرفتِ حق کی چنگاری کو سلگانے کے لیے کائنات میں چھپی ہوئی نشانیوں کو نمایاں کرتی ہے۔ اور اس طرح مقصدِ ہدایت و تذکیر کی تکمیل کے لیے سینکڑوں طبیعاتی حقائق پر سے پردے اٹھاتا ہے۔

اور نہ صرف یہ بلکہ زمانے کی راکھ تلے دبے ہوئے تاریخی واقعات کو درسِ عبرت بنا کر پیش کرتا ہے اور ماضی کی روشنی میں سبق حاصل کر کے مستقبل کی تعمیر کی ہدایت کرتا ہے۔ اس طرح قرآن کلامی حقائق، فقہی مباحث، قانون، اصولِ قانون، فلسفۂ قانون، طبیعات و مابعد الطبیعات، نفسیات، مظاہرِ قدرت اور تاریخ وغیرہ سبھی قسم کے مباحث کو اپنے مختصر سے حجم میں سمیٹے ہوئے ہے جو براہِ راست یا بالواسطہ ہدایتِ انسانی کے موضوع سے متعلق ہو سکتے ہیں اور جس کتاب کا موضوع اتنا وسیع ہو، ظاہر ہے کہ اس کی تفسیر و تشریح کا فرض بھی اتنا ہی وسیع نازک اور اہم ہوگا۔

یہ تو معانی و مضامین قرآن اور اس کے علوم کی طرف ہلکا سا اشارا ہوا۔ ورنہ یہ ایسا بحرِ زخار ہے جس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ دشوار ہے۔ اور جیسے جیسے علم و تحقیق کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا، علومِ قرآن کی وسعت کا مزید انکشاف ہوتا جائے گا۔

دوسری طرف قرآن کے اسالیبِ بیان، اس کی تعبیرات، اس کے امثال، استعاروں اور مجازات و کنایات کسی بھی مفہوم کے بیان کے لیے منتخب کیے گئے، مفرد الفاظ، جملوں کی تراکیب، کلمات اور جملوں کی فصاحت، موقع کلام، مخاطب کے حالات اور ان کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کے متضاد تقاضوں کی رعایت، تحسینِ کلام کے لیے مختلف صنعتوں کا استعمال اور قرآن کا معجزانہ طرزِ بیان، یہ سب کچھ اپنے دامن میں قرآن کے طالبِ علم کے لیے علم و تحقیق کی ایک وسیع دنیا سمیٹے ہوئے ہے۔

فقہی حیثیت

حضرت تھانویؒ عبقری صفت انسان تھے۔ ان کی نگاہ تمام علومِ اسلامیہ حدیث، تفسیر، فقہ، کلام اور تصوف میں گہری اور عمیق تھی۔ وہ بیک وقت محدث بھی تھے اور مفسر بھی، فقیہ بھی تھے اور متکلم و صوفی بھی۔ اس لیے قرآن کریم جو ان کی نظر و فکر کا محورِ اصلی ہے۔ اس کی تفسیر میں ان کی حدیثی، فقہی، کلامی اور تصوفی خصوصیات و صفات تمام تر نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں۔

حضرت تھانویؒ کو فقہ پر کامل عبور تھا اور ان کی نگاہ فقہ کے جزئیات و کلیات پر حاوی اور عمیق تھی۔ اس لیے تفسیرِ قرآن میں اکثر فقہی آیات پر فقہی مسائل کے ساتھ فقہی اصول و کلیات اور استنباط و استخراج کے طریقوں کی مختصر وضاحت کرتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے اپنی تفسیر عام طور پر طبقۂ متوسط کے پیشِ نظر لکھی ہے۔ اس لیے وہ قرآن کی تمام فقہی آیات پر ایک فقیہ کی حیثیت سے نہیں لکھتے ہیں اور جہاں اصول و استنباط اور طرقِ استخراج کا بیان کرتے ہیں وہ تفسیر کی متن میں نہیں لکھتے ہیں بلکہ حاشیہ کی عربی عبارت میں لکھتے ہیں۔

البتہ مسائل کے بیان میں وہ توسع برتتے ہیں اور اس کو عامۃ الناس کے فائدے کے پیشِ نظر اصل متنِ تفسیر میں لکھتے ہیں۔ لیکن ان اصل فقہی تبحر کا اندازہ حاشیہ کی عربی عبارت میں ہوتا ہے۔

اگر حضرت تھانویؒ کی تفسیر کی فقہی حیثیت کا موازنہ متقدمین کی فقہی تفسیروں سے کیا جائے جو علماء و فقہاء کے لیے لکھی گئی ہیں تو بے جا موازنہ ہوگا۔ لیکن اگر ان کے ہمعصر مفسرین کی تفسیروں کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ان کی تفسیر کے اندر ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔ خصوصًا جب کہ دوسری اُن کے وقت کی تمام اُردو تفسیروں میں فقہی استنباط و استخراج مسائل کی طرف اشارہ تک نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنی تفسیر کے اندر استخراج و استنباط کے طریقوں کی وضاحت کرتے ہیں اور مسائل مستنبط کر کے تفسیر کے طالب علم کے ذہن سے اپنے زمانہ کے اندر فقہاء مجتہدین کے اردگرد پھیلائے گئے شبہات کو دور کرتے ہیں اور فقہ سے واقف شخص کا ذہن فقہی استخراج و استنباط کی طرف مائل ہوتا ہے۔ حضرت تھانوی

کے اسی فقہی اشاریے کا عظیم نتیجہ ہمارے سامنے تفسیر "معارف القرآن" کی شکل میں ہوتا ہے جس کے اندر حضرت تھانویؒ کے خلیفہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ معارف و مسائل کے عنوان سے ہر جگہ فقہی استنباط و استخراج کے اصول کے ساتھ عصرِ حاضر کے پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔

حضرت تھانوی فقہی استنباط میں عصرِ حاضر کے ذہن کی رعایت سے بعض جگہ دورِ جدید کے مسائل پر تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔ اور بعض جگہوں کے ان مقامات کی نشان دہی کرتے ہیں جن سے دورِ جدید کے گمراہ ذہن پر خدا کی صراطِ مستقیم واضح ہوتی ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ کی آیت "یاایھا الذین اٰمنوا لاتقولوا راعنا وقولوا انظرنا واسمعوا وللکٰفرین عذاب الیم[1]" کے ذیل میں فائدہ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"ف: اس حکم سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر اپنے کسی فعل مباح سے کسی کو گنجائش گناہ کرنے کی ملے تو وہ فعل خود اس کے حق میں مباح نہیں رہتا ہے۔ مثلاً عالم کے کسی فعل سے کوئی جاہل سند لے کر خلافِ شرع کام کرنے لگے تو اگر وہ فعل ضروری نہ ہوگا تو خود اسی عالم کے لیے بھی منع ہو جائے گا۔"

اسی آیت کے ذیل میں حاشیہ کی عربی عبارت میں لکھتے ہیں:

"الفقہ۔ نہی المومنون سد اللباب وقطع للالسنۃ وابعاد عن المشابہۃ ۱۲ روح المعانی۔ فدلت الایۃ علی ذم امثال ھذہ الامور مما یجر الی المفاسد کذلک ۱۲[2]

---

[1] اے ایمان والو! تم (لفظ) راعنا مت کہا کرو اور اگر اس کے ظاہری مطلب عرض کرنے کی ضرورت پڑا کرے تو (لفظ) انظرنا کہہ دیا کرو کہ اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ ہماری مصلحت پر نظر فرمایئے، اور اس حکم کو اچھی طرح سن لیجیو، اور یاد رکھیو، کافروں کو سزائے دردناک ہوہی گی۔ جو پیغمبر علیہ السلام کی شان میں ایسی گستاخی اور وہ بھی چالاکی کے ساتھ کرتے ہیں۔ بیان القرآن، ج ۱، ص ۵۷

[2] بیان القرآن ج ۲، ص ۵۷

اس آیت سے فقہ کے مشہور اصول سد الذریعۃ الی الفساد" استخراج کر کے دورِ حاضر کے بہت سارے منکرات اور ان امور مباحات کی طرف توجہ دلائی ہے جن سے بعض مرتبہ منکرات اور محرمات پیدا ہو جاتے ہیں اس لیے ان کو چھوڑنا بھی اس اصول کے تحت واجب ہوگا۔ اسی طرح عصرِ جدید کے پیدا کردہ اس گمراہ کن اصول کی انھوں نے تغلیط کی ہے جہاں مشورہ میں کثرت رائے کا اعتبار ہوتا ہے وہ آیت وشاورھم فی الارض فاذا عزمت فتوکل علی اللہ کے تحت لکھتے ہیں:

(ترجمہ و تشریح) "اور بدستور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہیے تاکہ اس سے ان کا جی خوش ہو، پھر مشورہ لینے کے بعد جب آپ ایک رائے پختہ کر لیں، خواہ وہ ان کے مشورہ کے مطابق ہو یا مخالف سو خدا تعالیٰ پر اعتماد کر کے اس کام کو کر ڈالیے۔"

ترجمہ و تشریح کے بعد فائدہ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"اور یہ جو کہا گیا کہ خواہ وہ ان کے مشورہ کے موافق ہو یا مخالف ہو دلیل اس کی یہ ہے کہ لفظ عزم میں کوئی قید نہیں لگائی گئی اور اس سے معلوم ہوا کہ امورِ انتظامیہ متعلقہ بالرائے والمشورہ میں کثرت رائے کا ضابطہ محض بے اصل ہے ورنہ یہاں عزم میں یہ قید ہوتی کہ بشرطیکہ آپ کا عزم کثرت رائے کے خلاف نہ ہو۔"[1]

حضرت تھانویؒ نے یہاں کثرت رائے کے اعتبار کی تغلیط کی ہے، لیکن اس سلسلہ میں انھوں نے کچھ نہیں لکھا ہے کہ یہ حکم کیا صرف نبی کے ساتھ خاص ہے یا امیرِ وقت بھی اس حکم کا مخاطب ہے؟ مولانا ابوالکلام آزاد جو حضرت تھانویؒ کے معاصر ہیں۔ انھوں نے

---

[1] اور آپ ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ کر لیتے رہا کیجیے، پھر جب آپ بھی رائے پختہ کر لیں تو خدائے تعالیٰ پر اعتماد کیجیے (بیان القرآن جلد ۲، ص ۹۵)

تفسیر میں لکھا ہے:

"اس بارے میں دستور العمل یہ ہے کہ جماعت سے مشورہ کرو، پھر مشورہ کے بعد کسی ایک بات کا عزم کرلو، اور جب عزم کر لیا تو اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ، شوریٰ اپنے محل اور وقت میں ضروری ہے۔ عزم اپنے محل اور وقت میں، جب تک مشورہ نہیں کیا ہے، فیصلہ و عزم کا سوال نہیں اٹھتا ہے۔ لیکن جب مشورہ کے بعد عزم کر لیا گیا تو وہ عزم ہے اور کوئی رائے، کوئی نکتہ چینی، کوئی مخالفت اسے متزلزل نہیں کر سکتی، امام کے لیے ضروری ہے کہ جماعت سے مشورہ کرے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ صاحب عزم ہو" [1]

مولانا آزاد نے اگرچہ اس مسئلہ کی پوری وضاحت نہیں کی ہے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولاناؒ کے نزدیک مشورہ جو بھی فیصل ہو، اس کی تنفید کے لیے عزم امام کی ضرورت ہے اور پختگی کے ساتھ شوریٰ کے فیصلے پر جمنے کی تلقین ہے۔ البتہ مولانا محمد شفیع پاکستانی نے اپنی تفسیر "معارف القرآن" میں اس مسئلہ کی پوری وضاحت کی ہے اور حضرت تھانویؒ کے مسلک کی تشریح کی ہے۔ البتہ اخیر میں اس کی صراحت کردی ہے کہ امیر المومنین اختلاف رائے کی صورت میں اپنی صوابدید کے مطابق کسی ایک صورت کو اختیار کر سکتا ہے۔ خواہ وہ اکثریت کے مطابق ہو یا اقلیت کے البتہ امیر اپنا اطمینان حاصل کرنے کے لیے جس طرح دوسرے دلائل پر نظر کرے گا۔ اسی طرح اکثریت کا ایک چیز پر متفق ہونا بھی بعض اوقات اس کے لیے سبب اطمینان بن سکتا ہے [2]

حضرت تھانوی حنفی المذہب اور صوفی المشرب تھے۔ اس لیے احکام کے استنباط و استخراج میں حنفی مذہب کی پیروی کرتے ہیں۔ انھوں نے خود اجتہاد کیا نہیں ہے، بلکہ اپنی

[1] ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۳۱۷، مطبوعہ جید برقی پریس دہلی

[2] مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: تفسیر معارف القرآن ج ۲ / ۲۱۶ تا ۲۲۷، مطبوعہ مصطفائیہ دیوبند

تقلید حنفیت کا اظہار کیا ہے۔ اس لیے ہمیں ان کی تفسیر "بیان القرآن" میں صرف وہی استخراج کرملتے ہیں۔ جن کی احناف نے تخریج کی ہے۔ اس لیے وہ احکام و مسائل کے اصول کے بیان کے وقت تفسیر "روح المعانی" جو حنفی مذہب کی تفسیر ہے اور احکام و مسائل میں حنفیت کو راجح قرار دیتی ہے اس کے اصول و اشارے اور تصریحات اپنی تفسیر کے اندر حاشیہ کی عربی عبارت میں درج کرتے ہیں۔ حضرت تھانویؒ چونکہ حنفی مقلد تھے اور تقلید عامۃ الناس کے لیے واجب قرار دیتے تھے اس لیے اپنی تفسیر میں کئی جگہ ان لوگوں کی تردید کرتے ہیں جو آیات کی غلط تفسیر کے ذریعہ تقلید کا عدم جواز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ آیت:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ [1]

کے ذیل میں فائدہ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"مطلب یہ کہ وہ خود باپ دادا ہی متمسک بامر اللہ نہ تھے اور تمسک کی دو صورتیں ہوتی ہیں، صریح لفظ کتاب سے جس کو ہدایت سے تعبیر فرمایا اور علت حکم کتاب سے بواسطہ قیاس کے جس کو عقل سے تعبیر فرمایا سو وہ دونوں سے عاری تھے۔ پس ایسے شخص کی تقلید سے کیا گنجائش ہے اور پھر تقلید بھی محل سکوت عنہ میں نہیں بلکہ مورد دلیل میں اور خلاف دلیل کے اور اس سے یہ بھی مفہوم ہو گیا کہ اگر کسی بزرگ کی نسبت دلیل صحیح معتبر سے یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا قول مستند الی الدلیل الشرعی ہوتا ہے خواہ وہ دلیل شرعی نص ہو یا قیاس۔ وہ شخص شرعاً اتباع اور تقلید کے قابل ہوتا ہے، جب تک کہ اس کے قول کو کسی دلیل صریح سے معارض ہونا ثابت نہ ہو جائے۔ پس تقلید ائمہ مجتہدین کی مذمت میں اس آیت کو پڑھ دینا محض بے محل ہے بلکہ اس سے تو

[1] بیان القرآن ج اوّل ص ۹۵، سورہ بقرہ

اور اس تقلید مجتہدین فی الدین کی تائید و تقویت ہوتی ہے۔

اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ہر حالت میں تقلید کے قائل نہیں ہیں بلکہ اگر کسی کا قول کسی دلیل صریح سے معارض ہوتا ہو تو اس قول کی تقلید نہیں کرتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ احکام کی تشریح میں روح المعانی کے علاوہ تفسیر احمدی سے بھی مدد لیتے ہیں، چنانچہ ان کتابوں کا نام ان کی تفسیر بیان القرآن میں آتا ہے۔ اس طرح جزئیات کے بیان میں علامہ ابن عابدین شامی کی کتاب ردّ المختار علی الدر المختار کے حوالے ملتے ہیں۔ علامہ شامی کی یہ کتاب فقہ حنفی کی مستند ترین کتاب ہے۔ اس لیے حضرت تھانوی جو مسلک بھی ائمہ احناف کا لکھتے ہیں وہ صحیح ترین قول پر مبنی ہوتا ہے۔

حضرت تھانویؒ نے اپنی تفسیر میں احکام و مسائل کے استخراج و استنباط کا جو طریقہ اور معیار قائم کیا ہے۔ اس سے "بیان القرآن" کے مطالعہ کرنے والوں کے ذہن کے سامنے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ فقہار مجتہدین نے مسائل کا استنباط صرف اپنی عقلی قوتوں سے نہیں کیا ہے بلکہ ان کی بنیاد قرآنی آیات ہیں جن سے وہ احکام و مسایل کی تخریج کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مختلف مقامات پر استنباط کے اصولوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور سنت رسول و اجماع و قیاس کی تشریح کی ہے۔ احکام و مسایل لکھتے وقت احادیث رسول کو مستند کتابوں سے لیتے ہیں، جس سے بآسانی کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس کا علم ہوتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہوا کہ حضرت تھانویؒ قیاس کے قایل تھے اور منکرینِ قیاس کی انھوں نے تردید کی، جس وقت یہ تفسیر وہ لکھ رہے تھے، ہندوستانی مسلمانوں کا ایک طبقہ جو اپنے کو اہلِ حدیث کہتا تھا، شدت سے قیاس کا منکر تھا اور مطلق تقلید کی تردید کر رہا تھا، درآں کہ قیاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے اور جس طرح خالص منقولات نبویہ کی اتباع بطریق تعبد کیا جاتا ہے، مستدلات فقہار کی اتباع عبادت کے طور پر مشروع ہے۔ اس پر بھی عتاب و ثواب ایسا ہی ہے جیسا کہ منقولات نبویہ پر ہوتا ہے کیونکہ یہ شریعت اللہ کے علاوہ کوئی چیز نہیں، بلکہ اللہ ہی کے نازل کردہ اصول و کلیات کے تحت ان کا استخراج ہوتا ہے،

اس لیے امور تعبدیہ میں اصول و کلیات کے اوپر انحصار کرنا اور ان سے مستخرج جزئیات کا انکار کرنا عقل و نقل دونوں اعتبار سے بلاشبہ غلط و باطل ہے۔

حضرت تھانویؒ نے ان تمام آیات کی صحیح تفسیر کی ہے جن سے تقلید و قیاس کے منکرین ابطال قیاس و ابطال تقلید کے لیے استدلال کرتے ہیں جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت قل یاھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمۃٍ سواءٍ بیننا و بینکم کی تفسیر میں تقلید باطل و تقلید صحیح مشروع کا فرق بتاتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ:

"جو تقلید جمہور اہلِ اسلام میں اب شائع ہے وہ مشروع ہے اور جس تقلید کا ابطال کیا گیا ہے وہ اہلِ کتاب کی باطل تقلید تھی اور تقلید مشروع اس آیت کے ذیل میں داخل نہیں جس کا محل مسائل ظنیہ محتمل الطرفین ہیں جب تک کہ نص قطعی محکم مجمع علیہ یا اجماع کے خلاف ہونا ثابت نہ ہو ورنہ نص و اجماع کو مقدم رکھا جاتا ہے۔"

منکرینِ قیاس کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا وہ قیاس کا قایل تھا اور تقلید شخصی کی مخالفت کرتا تھا۔ اس گروہ میں سر سید احمد خاں تھے۔ وہ قیاس کے قایل تھے بلکہ ہر عصر کے مجتہد ہونے کے قایل تھے۔ چنانچہ وہ تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں:

"مذہب شیعہ امامیہ کا نہایت صحیح اور سچا مسئلہ ہے کہ ہر زمانہ میں مجتہد کا ہونا ضروری ہے۔ کوئی زمانہ مجتہد العصر سے خالی نہیں ہوتا۔"

اس سلسلے میں انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ رح کی کتاب "انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ و اسانید وارثی رسول اللہ" کی جلد دوم سے علمار مالکیہ و حنفیہ سے بھی اسی طرح کا قول نقل کیا ہے۔" [1]

لیکن صرف مجتہد العصر کا اعتقاد غلط نہ تھا بلکہ انھوں نے تقلید شخصی کے خلاف جو کچھ لکھا تھا اور علمار احناف کی جانب یہ منسوب کیا تھا کہ وہ اپنے مذہب کے خلاف بخاری کے اندر وارد شدہ احادیث پر عمل کو بدعت و ضلالت کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

[1] تہذیب الاخلاق، ج ۲، ص ۱۸۲

"دیکھو مثلاً جو حدیثیں حنفی مذہب کے خلاف بخاری میں ہیں حنفی اس پر عمل کرنے کو بدعت یا ضلالت سمجھتے ہیں اور زبان سے بخاری کو اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کہتے ہیں۔"[1]

سید احمد خاں کا یہ قول مذہب حنفی کے مستند ہونے کو اشھار ہا تھا۔ دراں حالیکہ انھوں نے اس احادیث کی نشان دہی نہیں کی ہے جن پر حنفی عمل نہیں کرتے ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے اسی قسم کے شکوک و شبہات کے ابطال کے لیے یہ لکھا ہے:

"اور جو تقلید جمہور اہلِ اسلام میں اب شائع ہے وہ مشروع ہے اور اس آیت کے مضمون میں داخل نہیں جس کا محل مسائل ظنیہ محتملۃ الطرفین میں جب تک کہ نص قطعی محکم مجمع علیہ یا اجماع کے خلاف ہونا ثابت نہ ہو، ورنہ نص و اجماع کو مقدم رکھا جاتا ہے۔"[2]

اس عبارت سے انھوں نے اس غلطی کی نشاندہی کردی ہے جو شائع ہوگئی تھی کہ حنفی یا مقلدین کو چھوڑ کر اپنے ائمہ کے اقوال پر عمل کرتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ یا دوسرے علمارِ دیوبند اجتہاد کے دروازے کو بند تصور نہیں کرتے ہیں۔ البتہ اجتہاد کے جو شرائط ہیں ان کو وہ ضروری قرار دیتے ہیں، اور چونکہ عصرِ حاضر یا ماقبل کے عصور میں ان شرائط کی جامع شخصیات نہیں پائی جاتی تھیں، اس لیے عہدِ اجتہاد کو بند تصور کرتے تھے۔ اس کے برخلاف جن لوگوں نے اجتہاد کی تائید میں اپنی قوت صرف کی تھی۔ وہ تقلید کی مذمت میں حدود سے تجاوز کر گئے تھے اور اجتہاد کی تائید میں اپنے آپ کو قابلِ اجتہاد قرار دے کر مسائل کا استنباط شروع کر دیا تھا، جیسا کہ حضرت تھانویؒ سے قبل کے مفسرین میں سر سید احمد خاں نے چند مسائل عصریہ میں اپنی قوت اجتہادی سے کام لے کر استنباط کرنا شروع کیا تھا جو یقیناً غلط تھا۔ چنانچہ انھوں نے آیت حرمت علیکم المیتۃ والدم

---

[1] تہذیب الاخلاق، ج ۲، ص ۳۱

[2] تفسیر القرآن القرآن ج ۲ ص ۲۸

ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللہ بہ والمنخنقۃ والمتردیۃ والنطیحۃ" کی تفسیر میں یہ لکھا ہے:

"اس سے مراد جانور ہیں، لہٰذا پرند و طیور اس میں داخل نہیں ہوں گے۔ طیور گردن مروڑی اقسام کا کھانا مسلمانوں کے لیے جائز ہے۔"[1]

اس کے برخلاف حضرت تھانویؒ نے مذکورہ آیت کی تفسیر میں طیور منخنقہ کو بھی حرام قطعی میں داخل کیا ہے اور سر سید کے اجتہاد کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پس طیور منخنقہ بھی حرام قطعی ہیں۔ لاکما ذاعم بعض المحرفین"[2]

حضرت تھانویؒ نے اس طرح عصرِ جدید کے مجتہدین کی غلطیوں کی نشان دہی "بیان القرآن" میں کی ہے۔ جن کا اجتہاد تاویل و تحریف معنوی درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے حضرت تھانویؒ قرآن مجید کو تحریف معنوی سے محفوظ کرنے کے لیے سلف صالح کا اتباع کرتے ہیں اور متجددین کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

---

[1] "تہذیب الاخلاق" کے اندر اپنے قیاسی استدلال پر پورا ایک مضمون لکھا ہے۔ دیکھیے "تہذیب الاخلاق" ج ۲، ص ۲۱۲

[2] تفسیر بیان القرآن، ج ۳ ص ۴

tobaa-elibrary.blogspot.com

تفسیر بیان القرآن کی خصوصیات تحقیق و تنقید کی روشنی میں

قرآن کریم کی آیات کی مثالوں کے ساتھ

مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کے بارے میں یہ بات طے ہے کہ یہ مسلک اہل سنت والجماعت کے عین مطابق ہے کیونکہ صاحب تفسیر کا تعلق اسی مسلک سے تھا۔ بہ نظر غائر اگر اس تفسیر کا مطالعہ کیا جائے تو نسبتاً عوام کے علماء کے لیے زیادہ مفید ہے کیوں کہ عالمانہ تحقیق اور حوالے مولانا تھانویؒ نے اس طرح حاشیوں میں تحریر کیے ہیں کہ اس تفسیر میں عالمانہ رنگ ملتا ہے۔ عربی فارسی کے الفاظ اور مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات کثرت سے استعمال کی گئی ہیں۔ خصوصاً دقیق عبارتوں کو جو عربی میں لائی گئی ہیں جب تک عربی سے کافی مناسبت نہ ہو سمجھنا مشکل ہے۔

اُردو ترجمہ البتہ شگفتہ اور اُردو کے محاورات کا لحاظ رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔ جہاں ترجمہ میں وہ بین القوسین کوئی عبارت بڑھا دیتے اس سے بہت سے مسائل حل ہو جاتے لیکن پورے طور مطلب وہی اخذ کر سکتا ہے جو مسئلہ متعلقہ پر گہری نظر رکھتا ہو۔ اس عبارت سے اعتراضات اور شبہات رفع ہو جاتے ہیں لہٰذا بیان القرآن کا ترجمہ عوام کے لیے زیادہ نافع ہے بمقابلہ تفسیر کے۔ کیونکہ بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن کی حقیقی تفسیر حدیث نبویؐ ہے۔ اس کے لیے کسی بھی تفسیر کو بالخصوص ایسی محققانہ تفسیر کو اسی وقت بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے جب کہ حدیث پر گہری نظر ہو اور سنت نبویؐ سامنے ہو۔ حدیث

کے بعد جو دین کی سب سے بڑی بنیاد ہے وہ صحابہؓ کا تعامل ہے۔ صحابہؓ کے عمل اور ان کے اقوال میں محدود رہ کر جو آدمی تفسیر کو دیکھے گا اُسے پوری طرح سمجھ بھی سکے گا اور اسی معیار پر تنقید بھی کر سکے گا اس لیے اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک صحابہؓ کا عمل ایک مستقل حجت ہے، جس کے ذریعہ شریعت اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ مثلاً اگر دو حدیثوں میں تعارض ہو تو امام مالکؒ کے نزدیک جس حدیث کو صحابہؓ کا تعامل بالخصوص اہلِ مدینہ کا عمل شامل ہو تو وہ اس حدیث کو راجح اور حجت قرار دیتے ہیں۔ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک اگر دو حدیثوں میں تعارض ہو جائے تو جس حدیث کے ساتھ فتاویٰ صحابہؓ کثرت سے ہوں گے وہ اس حدیث کو ترجیح دیتے ہیں، جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک تو صحابہؓ کا جماعتی عمل حجت ہے اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ان کے جماعتی اقوال اور فتاویٰ حجت ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جب حدیثِ نبویؐ قرآنِ کریم کی حقیقی تفسیر ہے اور حدیثوں کا تعارض کے وقت سمجھنا صحابہؓ کے اقوال اور افعال پر موقوف ہے تو کسی بھی تفسیر کا سمجھنا یا ان پر تنقید کرنا حضراتِ صحابہؓ کے عمل اور قول کو سامنے لائے بغیر تفسیر بصیرت پیدا نہ کر سکے گا اور نہ تحقیق و تنقید کا حق ادا ہو گا۔ چوں کہ بیان القرآن میں حدیث نبویؐ اور آثارِ صحابہؓ کی پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ اس لیے اس تفسیر کو ایک محققانہ تفسیر کہنا بے جا نہ ہو گا یہ خصوصیت دوسری تفاسیر کے مقابلہ کے طور پر نہیں ہے بلکہ تفسیر بیان القرآن کی اس خصوصیت کو مثبت انداز میں پیش کیا ہے۔ عموماً تفاسیر میں اکثر مسائل میں مختلف اقوال سامنے لائے جاتے ہیں جن سے آدمی کا ذہن تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ کس تفسیری قول کو راجح قرار دے اور کس کو مرجوح، لیکن تفسیر بیان القرآن میں بجائے مختلف اقوال کے ایک ہی متفقہ راجح قول بیان کر دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے قاری کا ذہن بجائے منتشر ہونے کے مطمئن ہو جاتا ہے۔

منجملہ ان خصوصیات کے بیان القرآن میں علم کے ساتھ معرفت کا رنگ بھی موجود ہے کیوں کہ مولانا تھانویؒ عالم ہونے کے ساتھ عارف باللہ بھی تھے جو ان کے ذکر اور

مجاہدات کا نتیجہ تھا اس لیے یہ تفسیر عالمانہ بھی ہے اور عارفانہ بھی جو کمالِ تحقیق اور جامعیت کی شان ہے۔

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ علماء کی تین قسمیں ہیں:

عالم باللہ، دوسرا عالم بامر اللہ اور تیسرا عالم باللہ و بامر اللہ۔

یعنی ایک عالم وہ ہے جو اللہ کے قانون امر و نواہی کو جانتا ہے اور دوسرا عالم وہ ہے جو قانونِ شریعت کو تو نہیں جانتا لیکن اللہ کی ذات و صفات کی معرفت رکھتا ہے تیسرا وہ جو ان دونوں چیزوں کو جانتا ہے۔

حضرت تھانویؒ اسی تیسرے طبقے کے عالم تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے علمِ شریعت اور طریقِ معرفت دونوں سے سرفراز کیا تھا اس لیے ان کی اس تفسیر میں یہ دونوں شانیں موجود ہیں۔ اس لیے اس تفسیر کو سمجھ کر پڑھنے والے کو علم احکام اور معرفت ذات و صفات دونوں کے انوار سے کامل شرحِ صدر میسّر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ نے خود بھی فرمایا ہے کہ بعض آیتوں کی تفسیر میں مجھے ایک ایک ہفتہ لگ جاتا اور جب تک مجھے اس میں منجانب اللہ شرحِ صدر نہیں ہو جاتا تھا اس وقت تک میں ان کی تفسیر میں قلم نہیں اٹھاتا تھا۔

ان اہتمامات کے علاوہ جہاں مولانا تھانویؒ نے احکام کی آیات کی احادیث سے تفسیر و تشریح کی ہے وہاں ان سے متعلق فقہی احکامات کی تفصیل بھی بیان کر دی ہے جس سے یہ تفسیر جامع حدیث و فقہ نظر آتی ہے۔ اپنی اس تفسیر میں مولانا تھانویؒ نے آیاتِ قرآنی سے مسائل و تصوف کا بھی جگہ جگہ استنباط کیا ہے اور سلوک کے ہر مسئلے کا ماٰخذ بیان کر دیا ہے۔ اس لیے یہ تفسیر جہاں حدیث و فقہ سے بھرپور ہے وہاں احسان و تصوف سے بھی معمور ہے اور اس لیے اس تفسیر کو جس طرح محدثانہ اور فقیہانہ طرز کی کہا جا سکتا ہے اسی طرح صوفیانہ اور عارفانہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

ایسی تفاسیر کمیاب ہیں کہ جن میں بیک وقت حدیث و فقہ اور تصوف جمع کر کے آیات کی تفسیر کی گئی ہو۔ بعض تفسیریں خالص محدثانہ رنگ کی لکھی گئی ہیں جیسے تفسیر ابن کثیر

یا تفسیر درِ منثور وغیرہ بعض تفاسیر خالص تصوف اور طریقت کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں، جیسے شیخ محی الدین ابنِ عربی کی تفسیر۔ اور بعض تفسیریں فقط علم کلام اور عقائد کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ لیکن مولانا تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن ان علوم کی جامع ہے جس کی نظیر اردو زبان میں مشکل سے ملے گی۔ اس لیے اگر اس تفسیر کو عدیم النظیر نہ کہا جائے تو کم از کم قلیل النظیر ضرور کہا جا سکتا ہے کیوں کہ بلاشبہ اردو کی دیگر تفاسیر میں یہ خصوصیات یکجا نظر نہیں آتی ہیں۔

تفسیر بیان القرآن کی خصوصیات کے جو اشارے مندرجہ بالا سطور میں کیے گئے ہیں ان کا ایک مختصر جائزہ کچھ حوالوں کے ساتھ پیش ہے:

(۱) مولانا تھانویؒ کو الفاظ قرآن کے معانی تفاسیر میں اس طرح جب نہیں ملتے کہ وہ مطمئن ہو کر تشریح کر سکیں تو وہ ان معانی کو کتبِ لغات سے نقل کرتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم کی آیت

"اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ"[۱]

اس انداز سے معانی لغت کے ذریعہ مولانا نے اپنی تفسیر میں واضح کیے ہیں کہ اس طرح کی تشریح بعض عربی تفاسیر جیسے تفسیر کبیر[۲]، تفسیر بیضاوی[۳] اور جلالین شریف[۴] میں بھی نہیں کی گئی ہے۔

---

[۱] ترجمہ: "شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعہ سے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کر دے۔" مولانا اشرف علی تھانویؒ، مکمل تفسیر بیان القرآن ص۵۵، جلد۳، سورہ مائدہ پارہ ۷۔ ترجمہ تفسیر درس قرآن "سوائے اس کے نہیں کہ ارادہ کرتا ہے شیطان یہ کہ ڈالے درمیان تمہارے عداوت اور بغض بیچ شراب اور جوئے کے، صفحہ ۱۴، قسط ۱۱

[۲] تفسیر کبیر، مفسر امام رازیؒ۔

[۳] تفسیر بیضاوی، قاضی بیضاویؒ

[۴] تفسیر جلالین " "

تفسیر جلالین، جلال الدین المحلی کی عربی تفسیر ہے جس کا حوالہ تفصیل سے الاعلام، خیر الدین زرکلی کے اڈیشن دوم میں جلد ۶، صفحہ ۲۰۲ میں موجود ہے۔

اس کے علاوہ تفسیر بیان القرآن میں یہ خصوصیت بھی ملتی ہے کہ جو مضمون مولانا تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں وہ استیعاب ماله وما علیہ کے ساتھ وضاحت فرما دیتے ہیں جیسے قرآن کریم کی آیت ہے۔

"وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ[1]"

ترجمہ: لوگ آپؐ سے دریافت کرتے ہیں کتنا خرچ کریں آپؐ فرما دیجیے جتنا آسان ہو، اللہ تعالیٰ اس طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم دنیا اور آخرت کے معاملے میں سوچ لیا کرو[2]

اس آیت کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں ایک عنوان مضمون ڈال کر۔

حکم شانزدہم مقدار انفاق

"لوگ آپؐ سے دریافت کرتے ہیں (خیر خیرات میں) کتنا خرچ کیا کریں؟ آپؐ فرما دیجیے جتنا آسان ہو (کہ اس کے خرچ کرنے سے خود پریشان ہو کر دنیاوی تکلیف میں یا کسی کا حق ضائع کر کے اخروی تکلیف میں پڑ جائے)، اللہ تعالیٰ اس طرح کے احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم کو احکام کا علم حاصل ہو جائے اور اس علم کی وجہ سے ہر عمل کے کرنے سے

---

[1] سورہ بقرہ۔ پ ۲

[2] مکمل بیان القرآن جلد اول، صفحہ ۱۲۵۔ بریداڈیشن، مولانا اشرف علی تھانوی رح۔

سے) پہلے دنیا اور آخرت کے معاملہ میں (ان احکام[1] کو) سوچ لیا کرو اور سوچ کر ہر معاملہ میں ان احکام کے موافق عمل کیا کرو، مثلاً خرچ ہی کرنے کے باب میں، جس کو دنیا اور آخرت دونوں کے ساتھ تعلق ہے۔ دنیا کے ساتھ بوجہ آلہ حوائج ہونے کے اور آخرت کے ساتھ بوجہ آلہ ثواب ہونے کے"، پہلے سوچ لیا کرو کہ یہ خرچ کرنا موافق حکم الٰہی کے ہے یا نہیں اگر ہوا خرچ کیا ورنہ نہ کیا اور اس حکم کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کسی معصیت میں خرچ کرتا ہے تو مطلقاً ناجائز ہے اور اگر اطاعت میں خرچ کرتا ہے تو وہ اطاعت حدِ وجوب فرضیت تک پہنچتی ہے مثلاً زکوٰۃ وغیرہ تو خرچ کرنا فرض و واجب ہے اور اگر حد نفل تک ہے جیسے معمولی خیر خیرات، تو اگر کسی عیال وغیرہ کا اس میں حق ضائع ہوتا ہے تو خرچ کرنا ناجائز ہے اور اگر کسی کا حق ضائع نہیں ہوتا لیکن خود پریشان ہو کر صبر نہیں کر سکے گا تو بھی ناجائز ہے اور اگر وہ محل طاعت ہے نہ معصیت بلکہ مباح ہے جیسے کہ فواکہ و لذائذ میں، تو اگر نیت تقویت علی الطاعۃ کی ہے تو ثواب ہے اور اگر نیت تقویت علی المعصیت کی ہے تو گناہ ہے اور اگر محض دل ہی خوش کرنا ہے تو مباح ہے۔ اس آیت میں نفل صدقات کا حکم مذکور ہے۔ اس کی جو شرطیں ہیں احقر نے اثنائے ترجمہ میں اس طرف اجمالاً اشارہ کر دیا ہے اور اس تقریر میں تفصیلاً لکھ دیا ہے[2]"

---

[1] حاشیہ متعلقات الترجمہ ان احکام کو سوچ لیا کرو۔ الخ حاملہ تتفکرون فی الآیات فی امور الدنیا والاٰخرۃ۔ فالجار تقدیر المضاف تتفکرون بعد تقیید بالاول کذا فی روح المعانی فافہم، بیان القرآن، جلد اول ص ۱۲۵

[2] مکمل بیان القرآن، مولانا اشرف علی تھانوی، جلد اول، اڈیشن، جدید، ص ۱۲۵

toobaa-elibrary.blogspot.com

(۳) تیسری خصوصیت بیان القرآن میں یہ ملتی ہے کہ مولانا تھانویؒ بعض آیات کی تفسیر اس دلائل سے پیش کرتے ہیں کہ بعض مشہور کتب میں بھی نہیں ملتیں اور ایسے دلائل علماء حضرات تک کے لیے باعثِ حیرت اور طمانیت قلب کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مولاناؒ نے دلیل رضاعت کی دیگر تفاصیل کے حوالوں کے ساتھ نہایت وضاحت اور فصاحت کے پیرائے میں اس طرح پیش کی ہے جو عام طور سے کتب تفسیر میں نہیں ملتی۔ مثلاً رضاعت کی مدت سے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ:

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا[1] میں یہاں حمل کے معنی گود میں لینا مراد ہے جس کی تفصیل مولانا کے الفاظ میں مندرجہ ذیل ہے:

"اور حمل و فصال کی مدت چونتیس[۳۴] مہینہ یعنی اڑھائی برس فرمائی۔ جمہور کے نزدیک اس حساب پر مبنی ہے کہ اقل مدت حمل چھ ماہ ہے اور اکثر مدت رضاع دو سال، مجموعہ اڑھائی سال ہو گیا۔ اب یہ بات کہ ایک چیز کی اقل مدت فرمائی اور دوسری کی اکثر مدت سو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ منضبط یہی مدتیں ہیں بخلاف اکثر مدت حمل کے کہ کسی دلیل قطعی سے منضبط نہیں اسی طرح اقل مدت رضاع کی کہ وہ بھی منضبط ہیں اور اقل مدت حمل چھ مہینے ہونے کے متعلق روح المعانی میں جالینوس اور ابن سینا کا مشاہدہ لکھا ہے صرف جالینوس کے مشاہدہ کی ہوئی حکایت ہیں چھ ماہ سے چار دن زیادہ کے تھے اور مسئلہ یہ ہے کہ مجموعہ کو عادت غالبہ پر محمول کیا جاوے کہ حمل نو ماہ اور مدت رضاعت پونے دو سال کہ اکثر عورتیں دو سال کے قبل دودھ چھڑا دیتی ہیں اور مدارک میں امام ابو حنیفہؒ سے اس کی تفسیر میں نقل کیا گیا ہے کہ حملہ بالاکف یعنی گود میں اور ہاتھوں میں لیے لیے پھرنا ہے

---

[1] اس کو پیٹ میں رکھنا اور دودھ چھڑانا تیں مہینہ ہے۔

پارہ حم سورۃ احقاف صفحہ ۶۵-۸۷ جلد بیان القرآن ۱۱۔ مولانا تھانوی، مکمل بیان القرآن جلد ۱۱ مولانا تھانویؒ صفحہ ۵

جو کہ ایام شیر خوارگی میں غالب الوقوع ہے پس اس تفسیر میں یہ آیت دال ہو گئی کہ مدت رضاع کے اڑھائی سال ہونے پر جیسا کہ امام صاحبؒ کا مذہب ہے اور امور مذکورہ فی المقام میں اس کی ترتیب ہو گی۔ اوّل حمل فی البطون، پھر وضع، پھر حمل بالکف اور فصال اور حولین کاملین کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مدت مطلق رضاع کی نہیں بلکہ رضاع بالاُجرت کی ہے۔ یعنی کب تک باپ سے دودھ پلانے کی اُجرت لی جائے گی احقر کہتا ہے کہ گو فتویٰ جمہور کے قول پر ہی ہے مگر احتیاط یہ ہے کہ دودھ پلاتے میں تو دو سال سے زائد نہ پلائیں۔ اگر کسی نے دو سال کے بعد پیا ہو تو نکاح میں احتیاط کریں[1]"

لہٰذا مندرجہ بالا تحریر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حمل عرفی مراد نہیں اس لیے مدتِ رضاعت امام اعظمؒ کے نزدیک ڈھائی سال ہے "مدارک التنزیل (تفسیر امام حافظ الدین نسفی[2]) میں اس معنی کو نقل کیا گیا ہے۔ دو برس کی مدت اس وقت کے لیے ہے جب عورت اور مرد کے درمیان اختلاف کے سبب جدائی ہو رہی ہو تو اس کی عدت صرف دو برس ہے اور حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ اسی وقت کے لیے فرمایا گیا ہے

(۴) تفسیر کی چوتھی خوبی یہ ہے کہ وہ مسائل جو حنفی فقہ سے متعلق ہیں گہری فکر و نظر کے ساتھ پوری تفصیل سے بیان کیے ہیں کسی مسئلے کو تشنہ و ناقص نہیں چھوڑا خواہ مسائل طلاق ہوں یا مسائل لعان وغیرہ ہوں۔

(۵) پانچویں بات یہ ہے کہ تفسیر بیان القرآن میں مولاناؒ نے زیادہ تر فقہی مسائل ایسی

---

[1] مکمل بیان القرآن، مولانا اشرف علی تھانویؒ، جلد ۱۱، ص ۸

[2] تین جلدوں میں ان کی تفسیر ہے۔ علامہ بن احمد بن محمود النسفی ابو البرکات حافظ الدین فقہ حنفی کے مفسر تھے۔ بحوالہ الاعلام، جلد ۴، ص ۱۹۲

کتابوں کے حوالوں سے نقل کیے ہیں جو اس وقت موجود علمار میں معتبر و مستند سمجھی جاتی ہیں۔ جیسے درمختار، اس کا حاشیہ رد المحتار اور ہدایہ وغیرہ۔

(۶) چھٹی خصوصیت تفسیر میں یہ بھی ہے کہ جو مضمون علمار منقول اور علمار معقول کے درمیان مختلف فیہ ہے، اس میں مفسّر نے نقل کو عقل پر ترجیح دی ہے۔ اگر نقل صحیح ہے تو اس کو لیا ہے ورنہ ایسی توجیہ کی ہے جو نقل کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً جیسے ہاروت و ماروت کا قصّہ ہے کہ یہ دو فرشتے اس لیے بھیجے گئے تاکہ جادو اور نبوت میں فرق بتلائیں اور کھلم کھلا امتیاز ظاہر کردیں کہ اگر جادو پر عمل کیا جائے گا تو یہ کفر ہوگا خواہ اس کو کوئی کرے اور جادو یہودیوں میں رائج تھا وہ اس کے ذریعہ دنیا کی دولت حاصل کرتے تھے۔ مولانا تھانویؒ نے اس واقعہ کی تفصیل قرآنِ کریم کی آیت وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ [1] الخ کی تفسیر میں بہت تفصیل سے تحریر کی ہے جس کا مختصر خلاصہ ان کی چند توجیہات کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے:

"جب دنیا میں جادو سحر کا چرچا تھا خصوصاً بابل میں تو پیغمبروں کے معجزات جو خدائے تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتے ہیں ان میں اور جاہلوں کے جادو سحر میں لوگوں نے مقابلہ شروع کردیا۔ اس بگاڑ اور اختلاط کو روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بابل کے مقام پر دو فرشتے ہاروت و ماروت نامی بھیجے تاکہ سحر کی حقیقت سامنے آجائے اور لوگ جاہلوں کی پیروی اور غلط عقائد سے محفوظ ہوجائیں۔ فرشتوں کی بجائے انبیاءؑ سے یہ کام اس لیے نہیں لیا کہ خود ساحرین اور انبیاءؑ میں فرق بتانا مقصود تھا۔ انبیار علیہم السلام سے تمام شرعی امور کی

---

[1] ترجمہ: انھوں نے ایسی چیز کا اتباع کیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے، شیطان، حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت میں اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا مگر شیطان کفر کیا کرتے تھے اور حالت یہ تھی کہ آدمیوں کو بھی سحر کی تعلیم کرتے تھے اور اس کی بھی جو دونوں فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا بابل میں جن کا نام ہاروت و ماروت تھا۔ تفسیر بیان القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۵۴

ذمہ داری والا کام لینا مقصود ہوتا ہے اور یہ تمام کام خیر ہی خیر پر مشتمل ہوتے ہیں۔ فرشتے اس لیے مقرر کیے گئے کہ ان سے وہ تمام کام لیے جاسکتے ہیں جو مجموعی اعتبار سے دنیا میں خیر و شر کے لحاظ سے جاری رہتے ہیں۔ لہٰذا ہاروت و ماروت فرشتوں کے ذریعہ بابل میں لوگوں کو سحر کے اصول و فروع ظاہر کروا کے ایسے ناجائز اعمال سے بچنے کی تاکید کی کہ لوگوں کو ساحرین کے عمل سے نفرت اور دوری ہو اور ان کو عالم الغیب کی حد تک نہ سمجھنے لگیں جو صریحاً غلط اور ناجائز ہے۔

ان آیتوں سے متعلق ایک قصّہ زہرہ کا بہت طویل مشہور ہوا۔ جو کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں۔ اگرچہ کچھ علمار نے اس قصّہ کو کسی تاویل کے خلاف نہ سمجھتے ہوئے رد نہیں کیا لیکن مولانا تھانویؒ کی رائے کے مطابق ان آیات کی تفسیر کا اس سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر بھی قرآنِ کریم میں متعدد جگہ حضرت سلیمانؑ کے قصّہ کے ساتھ ملتا ہے۔ مثلاً: وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ مِنَّا فَضْلًا تا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔

ترجمہ: ہم نے داؤدؑ کو اپنی طرف سے بڑی نعمت دی تھی، اے پہاڑوں، داؤد کے ساتھ بار بار تسبیح کرو اور پرندوں کو بھی حکم دیا۔ ہم نے اُن کے واسطے لوہے کو نرم کردیا کہ تم پوری زرہیں بناؤ اور جوڑنے میں انداز رکھو اور تم سب نیک کام کیا کرو، میں تمھارے سب اعمال دیکھ رہا ہوں۔"

آگے تفسیر میں مولاناؒ لکھتے ہیں:

"کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ انعامات عطا فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان معجزات اور نعمتوں پر تم میرا شکر ادا کرو اور نیک کام کیا کرو میں تمھارے سب کے اعمال سے باخبر ہوں۔ اس لیے رعایت و حدود کا پورا اہتمام کرو، یعنی حضرت داؤدؑ کے خاندان مع حضرت سلیمان علیہ السلام سب کو اللہ نے نعمتیں عطا فرماکر منصب پیغمبری کے باوجود شکر کا حکم دیا اور

اعمال کے جائزہ پر باخبر ہونے کی اطلاع دی۔

مولانا تھانویؒ کے یہاں اس حد تک ان آیات کی تفسیر کی گئی ہے اور ان مفسرین کے علاوہ جنہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ کی تفسیر مختلف انداز سے کی ہے مولاناؒ نے تفسیر میں ایسے واقعات اور تفصیل سے گریز کیا ہے۔

اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ شجرِ ممنوعہ سے متعلق قرآن میں ذکر ہوا ہے اور اللہ رب العزت نے ان کی بھول کا ذکر خود اس طرح کیا ہے۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا

ترجمہ :۔ ہم آدمؑ کو ایک حکم دے چکے تھے سو اُن سے غفلت ہو گئی اور ہم نے اُن میں پختگی نہ پائی۔[1]

یعنی مولانا تھانویؒ اس کی تفسیر میں یہ وضاحت فرما دیتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کی بھول معصیت میں شمار نہیں ہوتی بلکہ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی روزہ کی حالت میں کھا پی لے پھر اس کو یاد آجائے کہ میں روزہ دار ہوں، پھر کھانا پینا چھوڑ دے اس صورت میں اس کا روزہ باقی رہے گا اور وہ گنہ گار نہ ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ترجمہ (میرا عہدہ نبوت ظالموں کو نہیں پہنچتا) اور حضرت آدم علیہ السلام کیونکہ نبی بنائے گئے اور ان کی یہ نافرمانی بھول میں ہوئی ہوئی اس لیے اس کو نافرمانی نہیں کہنا چاہیے اس کی تفسیر مولاناؒ نے وضاحت سے ان الفاظ میں تحریر کی ہے۔

"اور جس وقت امتحان کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ان کے پروردگار نے چند باتوں میں (اپنے احکام میں سے) اور وہ ان کو پورے طور پر بجالائے اُس وقت حق تعالیٰ نے (اُن سے) فرمایا کہ میں تم کو (اس کے صلہ میں نبوت دے کر یا امت بڑھا کر) لوگوں کا مقتدیٰ بناؤں گا، انھوں نے عرض

---

[1] سورہ طٰہٰ، پارہ ۱۶، جلد ۷، تفسیر بیان القرآن، مولانا تھانویؒ۔

کیا میری اولاد میں سے بھی کسی کو (نبوت دیجیے) ارشاد ہوا، آپ کی یہ درخواست منظور ہے۔ مگر اس کا ضابطہ سن لیجیے کہ میرا (یہ) عہدہ (نبوت) خلاف ورزی (قانون) کرنے والوں کو نہ ملے گا (سو ایسے لوگوں کو صاف جواب ہے۔ البتہ اطاعت کرنے والوں میں سے بعض کو نبوت دی جائے گی)۔

اس تفسیر کے بعد آگے مولانا ف بنا کر اس کی تشریح بہت اچھے انداز میں مثال کے ساتھ پیش کرتے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہے :

"امتحان دو غرض سے ہوتا ہے کبھی تو اس واسطے کہ امتحان کرنے والا خود اس شخص کی حالت و لیاقت دریافت کرنا چاہتا ہے، سو یہ امتحان لینا تو ذاتِ حق میں محال ہے کیونکہ ان کو سب کچھ پہلے ہی معلوم ہے اور کبھی امتحان لینے والا خود تو جانا کرتا ہے لیکن اور دیکھنے والوں کی نظر میں اس حالت کا پیش کرنا منظور ہوتا ہے تاکہ امتحان دینے والے کی عظمت ثابت ہو جائے اور دوسروں کو شکایت محرومی یا ترجیح کا موقع نہ رہے یا اگر امتحان کسی مجرم کا ہے تو خود وہ بھی اپنے دل میں انصاف کرے اور دوسرے بھی شبہ جور و تعدی کا نہ کر سکیں تو ایسا امتحان لینا حق تعالیٰ کی شان کے خلاف نہیں جہاں کہیں حق تعالیٰ کا بندوں کو امتحان کرنا مذکور ہے وہاں یہی دوسری قسم مراد ہے اور وہ باتیں کتابوں میں کئی طرح لکھی ہیں۔ بہرحال کچھ احکام تھے اور یہ امتحان اگر ایسے وقت تھا کہ ہنوز خلقت کو احکام پہنچانے کا آپ کو حکم نہ ہوا تھا تو امامت الناس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو احکام پہنچانے کا کام دیا جائے گا جو حاصل ہے نبوت کا۔ پس اس قول پر اس وقت وحی تو نازل ہو گئی تھی لیکن اس وحی کی تبلیغ کا امر نہ ہوا تھا۔ اور اگر یہ امتحان ایسے وقت تھا کہ تبلیغ وحی کا کام بھی کرنے لگے تھے تو امامت الناس کے معنی یہ ہوں گے کہ اب جتنی

> امت ہے! اس سے اور ترقی دوں گا۔ مثلاً آپ کے زمانے ہی میں اور لوگ بھی ایمان بکثرت لادیں گے یا یہ کہ آپ کی شریعت آپ کے بعد بھی مدتوں تک رہے گی، چونکہ سبب ہے تضاعف اجر و ثواب کا کیوں کر نیک راہ کے چلنے کے ثواب میں اس راہ کا بتلانے والا بھی شریک ہوتا ہے جیسا احادیث میں بھی ہے تو یہ امر بھی اس نبوت کے آثار سے ہے۔ بہرحال ہر صورت میں حاصل اس کا نبوت کی تکمیل ہے اور اس میں یہ قید لگانا کہ جس کو نبوت ملے گی وہ ظالم نہ ہو دلیل ہے حضرات انبیاء علیہم السلام کے معصوم اور بے گناہ ہونے کی کیونکہ ہر گناہ خلاف ورزی ہے احکام کی اور یہی حقیقت ہے ظلم کی اور دونوں کا جمع نہ ہونا صراحتہً ارشاد ہوا ہے پس جو حضرات نبوت سے مشرف ہو چکے ہیں یقیناً وہ گنہ گار نہ تھے نہ قبل نبوت نہ بعد نبوت، اور جن قصوں میں ایسے امور مذکور ہیں وہ واقع میں گناہ نہیں[1]

مندرجہ بالا تقریر ایک آیت کی پوری شانوں اور معنی و لائل کے ساتھ مولانا کی علمی بصیرت، ذہانت کوشش کا بین ثبوت پیش کرتی ہے کہ لفظ بہ لفظ تشریح حاشیوں میں اس کے حوالے اور معنی ظاہری لغوی ہر طرح سے خود مطمئن ہونے اور دوسروں کو مطمئن کرنے کا مدلل انداز بیان جو مختصر ہونے کے ساتھ جامع بھی نظر آتا ہے اور اس کی تفسیر کی خصوصیات کو ماننے اور سمجھنے کے لیے اس عقل و فراست ذوق اور علمیت کی ضرورت ہے اس کے بغیر مولانا کے طرز کو سمجھنا بھی آسان نہیں۔

ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ کلام مجید کے بعض ان مقامات پر جہاں علماء مفسرین کی رائے مختلف ہو گئی ہے کہ آیا یہ دلیل صرف نقلی ہے یا عقلی بھی ہے۔ مثال کے طور پر آیت قرآن کریم "لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا"[2] اور اس قسم کی دوسری آیتیں

---

[1] تفسیر مکمل بیان القرآن، مولانا تھانویؒ، جلد اول، صفحہ ۶۸، سورہ بقرہ، پارہ الٓمٓ ۲

[2] سورہ انبیاء، پارہ ۱۷

مفسرین نے جہاں دلائل عقلی پیش کیے بعض نے نقلی، لیکن مولانا موصوف نے نقلی اور عقلی دونوں طرح سے ثابت فرمایا ہے۔ تفسیر کے بین بین یہ مضمون موجود ہے اور کچھ حواشی میں نقلی کو اور عقلی برہانی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ مولاناؒ نے جس طرح آیت مندرجہ بالا کی روشنی میں اس کی تفسیر عقلی اور نقلی دلائل سے فرمائی ہے وہ تحریر ہے۔

> زمین و آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود (واجب الوجود) ہوتا تو دونوں کبھی کے درہم برہم ہو جاتے (کیوں کہ عادۃً دونوں کے ارادوں اور افعال میں تزاحم ہوتا اور اس کے لیے فساد لازم ہے لیکن فساد واقع نہیں ہے اس لیے تعدادِ الٰہ ہی منفی ہے۔ سو ان تقریرات سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ جو کہ مالک ہے عرش کا ان امور سے پاک ہے جو کچھ یہ لوگ بیان کر رہے ہیں (کہ نعوذ باللہ اس کے اور شرکاء بھی ہیں حالانکہ اس کی ایسی عظمت ہے کہ) وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا اور اوروں سے باز پرس کی جا سکتی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ باز پرس کر سکتا ہے۔ پس کوئی عظمت میں اس کا شریک نہ ہوا۔ پھر معبودیت میں کوئی کیسے شریک ہو سکتا ہے۔ یہاں تک تو بطور ابطال اور نقض و استلزام محال کے کلام تھا آگے بطور سوال اور منع کے کلام ہے کہ) کیا خدا کو چھوڑ کر انھوں نے اور معبود بنا رکھے ہیں (آپ ان سے) کہیے کہ تم اپنی دلیل (اس دعویٰ) پر پیش کرو۔ یہاں تک تو سوال اور دلیل عقلی سے شرک کا ابطال تھا (آگے دلیل نقلی سے استدلال ہے کہ) یہ میرے ساتھ والوں کی کتاب (یعنی قرآن) اور مجھ سے پہلے لوگوں کی کتابیں (یعنی توراۃ و انجیل و زبور) موجود ہیں (جن کا صدق اور منزل من اللہ ہونا دلیل عقلی سے ثابت ہے اوروں میں گو تحریف ہوئی ہے۔ مگر قرآن میں تحریف ہی منفی ہے۔ پس جو مضمون ان کتب

کا قرآن کے مطابق ہوگا وہ یقیناً صحیح ہے"۔[1]

آٹھویں خصوصیت مولاناؒ کی تفسیر میں یہ ملتی ہے کہ تفسیر میں ایک جملہ یا لفظ زائد تحریر کر کے بڑے بڑے اعتراضات رفع کر دیتے ہیں مثلاً آیت "تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ" سے آگے کی کچھ آیتوں تک مصیبتوں کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ عام ذہن یہ ہے کہ اکثر مصیبت گناہوں کی وجہ سے آتی ہے۔ مولاناؒ نے چھ وجہ مصیبت کی بیان فرمائی ہیں اور پھر ان کو لفظ جیسا یا مثلاً سے واضح فرما دیا ہے۔ اب وہ وجوہات اور حکمتیں مندرجہ ذیل ہیں۔ مسلمانوں کی تسلی کے لیے جنگِ بدر اور جنگِ احد کے دنوں کی تبدیلی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"اگر تم کو زخم پہنچ چکا ہے (جیسا احد میں ہوا) تو (کوئی) گھبرانے کی بات نہیں کیوں کہ اس میں چند حکمتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس قوم کو بھی (جو کہ تمھارے مقابل تھی کفار) ایسا ہی زخم (صدمہ) پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ گذشتہ سال بدر میں وہ صدمہ اٹھا چکے ہیں اور (ہمارا معمول ہے کہ) کہ ہم ان ایام کو (یعنی غالب و مغلوب ہونے کے زمانے کو) ان لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہا کرتے ہیں (یعنی کبھی ایک قوم کو غالب دوسری کو مغلوب کر دیا، کبھی اس کے برعکس کر دیا۔ سو اس معمول کے موافق پار سال وہ مغلوب ہوئے تھے اب کے تم ہو گئے (ایک حکمت تو یہ ہوئی) اور (دوسری حکمت یہ ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو (ظاہری طور پر بھی) جان لیں (کیونکہ مصیبت کے وقت مخلص اور منافق کا امتحان ہو جاتا ہے) اور (تیسری حکمت یہ کہ) تم میں سے بعضوں کو شہید بنانا تھا۔ (چوتھی حکمت یہ ہے) تاکہ (گناہوں کے) میل کچیل سے صاف کر دے ایمان والوں کو (کیونکہ مصیبت سے اخلاق و اعمال کا تصفیہ ہو جاتا ہے) اور (پانچویں حکمت یہ ہے کہ) مٹا دیوے کافروں کو

---

[1] تفسیر بیان القرآن، جلد ۲، صفحہ ۳۴، پارہ ۷، سورۃ انبیاء

(یہ دو طور پر ہے ایک یہ کہ غالب آجانے سے جرأت بڑھے گی، پھر مقابلے میں آویں گے اور ہلاک ہوں گے، دوسرے یہ کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے قہرِ خداوندی میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوں گے)[1]

اسی طرح دوسری آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کی تفسیر میں مثال ملتی ہے۔

تفسیر و ترجمہ:

"اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ اس توقع پر کہ تم روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ متقی بن جاؤ، کیوں کہ روزہ رکھنے سے عادت پڑے گی نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی اور اس عادت کی پختگی بنیاد ہے تقویٰ کی"۔[2]

مولانا تھانویؒ کی مندرجہ بالا تفسیر سے روزے کے لیے آسانی سے یہ بات ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ روزہ کی حکمت میں علاوہ فریضہ کی ادائیگی تقویٰ حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہے کیونکہ دیگر عبادات کے علاوہ نفس پر زیادہ قابو روزہ کی حالت میں پایا جاتا ہے۔ یہ مشق متقی ہونے کے لیے ایک بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ اپنے نفس کے مقابلہ میں اللہ کی رضا کو غالب رکھنے سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔

نویں خصوصیت یہ ہے کہ مولاناؒ نے تفسیر میں بقدرِ ضرورت نقلیات اور بقدرِ ضرورت عقلیات کا تذکرہ کیا ہے۔ باقی حوالے ان کتب سے لیے جو معتبر ہوں یا جس فن سے وہ بات متعلق ہو اس کا حوالہ دے دیا ایسی تفاصیل نہیں پیش کیں جس سے ذہن میں انتشار پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اہلِ نقل اور علمائے اہلِ عقل دونوں کے درمیان حتی الامکان

---

[1] سورہ آلِ عمران صفحہ ۵۹، جلد ۲، تفسیر بیان القرآن

[2] تفسیر بیان القرآن، جلد اول، صفحہ ۱۰۲، سورہ بقرہ، پارہ دوسرا

toobaa-elibrary.blogspot.com

تطبیق دینے کی کوشش فرمائی ہے۔ مثال کے طور پر آیت "فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ" کی تفسیر کے بعد لفظ ف بناکر تحریر کرتے ہیں کہ:

"یہاں چند امور ضروریہ قابل سمجھنے کے ہیں۔ اوّل بعض تفاسیر میں ایک جگہ ایک قصہ آدم و حوا علیہم السلام کے ایک اولاد ہونے کا اور اس کا ایک خاص نام رکھنے کا آیا ہے: اور بعض نے بعض اشکالات کی وجہ سے اس کا انکار کیا ہے اور نفس واحدہ اور زوجہا کی تفسیر بدلی ہے۔ لیکن ترمذی کی تحقیق اور حاکم کی تصحیح کے بعد قصہ کا انکار اور نفس واحدہ کو غیر آدم پر محمول کرنا دشوار ہے۔ لیکن اس قصہ کا اس آیت کے لیے مفسر ہونا اس حدیث سے ثابت نہیں اور بعض سلف سے جو منقول ہے تو ممکن ہے کہ ظاہر الفاظ آیت سے اُن کی رائے ہو جو حجت نہیں رہا، ظاہر الفاظ سے اس کا معلوم ہونا، سو یہ اس وقت ہوتا جب تَغَشّٰهَا کی ضمیریں نفس واحدہ اور زوجہا کی طرف بعینہٖ عائد ہوتیں اور اگر یہ ضمائر مطلق زوج اور زوجہ کی طرف بطور صنعت استخدام کے راجع ہوں جیسا اس آیت میں کہا گیا ہے "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ (اے آدم) مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ" (اے الانسان الذی من نسلہ) تو نہ تو تفسیر مجدہوا، نہ بعد کی آیت میں اشکال ہوا۔"[۲]

بعض مفسرین نے اس آیت کریمہ کو ایک حدیث شریف کے سبب نقل کے ماتحت کر دیا ہے اور عقل و حجت کی پرواہ نہیں کی۔ بعض مفسرین نے جو معقول ہیں عقل و صحت کے مطابق اس آیت کریمہ کی تفسیر کی ہے اور حدیث شریف کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مگر مولانا نے دونوں کی مخالفت نہ کرتے ہوئے آیت کریمہ کی ایسی توجیہہ کی ہے کہ جس میں تطبیق اور جمع کی شکل

---

[۱] ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو صحیح سالم اولاد دیدی تو اللہ کی دی ہوئی چیزوں میں الخ۔ سورہ اعراف، صفحہ ۵۸، جلد ۴، تفسیر بیان القرآن۔

[۲] تفسیر بیان القرآن، جلد ۴، صفحہ ۶۰، پارہ ۹، سورہ اعراف۔

ہو جاتی ہے اور پوری تفسیر میں ان کا یہی طرز ہے جہاں منقولات اور معقولات کے مابین کے درمیان اختلاف ظاہر ہوتا ہے۔ مولاناؒ نے پوری کوشش یہ کی ہے کہ تفسیر و تشریح میں کوئی تشنگی باقی نہ رہ جائے۔ مختلف حوالوں کے ساتھ اپنی رائے میں ہر قصہ اور احکام کو ناظرین کی سہولت کے لیے مثالوں کے ساتھ کھل کر بیان کر دیا ہے۔ اگر کسی جگہ ایسی نوبت آگئی ہے کہ پورے اطمینان اور قلبی شرح کے ساتھ تفسیر نہ کر سکے ہیں وہاں اس ذہنی اور قلبی تمکل کو ظاہر کر دیا ہے جیسا کہ سورہ توبہ کے ابتدائی دو رکوع کی کئی صفحات پر تفسیر کرتے ہوئے اختتام میں لکھتے ہیں:

"ان دو رکوع کی تفسیر میں کئی سال گذرے، مجھ کو پریشانی اور خلجان رہتا تھا، اور جس قدر میں نے لکھا ہے یہ میری کوشش کا منتہا ہے اگر کسی کی نظر یا ذہن میں اس سے احسن اور اسہل تفسیر گذرے تو وہ اسی کو اختیار کر کے مجھ کو معذور سمجھے اور میری لغزش کی عفو کی دعا کرے۔"[۱]

تطبیق کی دوسری مثال مولاناؒ کے یہاں حروف مقطعات کے معنی میں ملتی ہے جہاں اخفار یا اظہار سے کام لیا گیا ہے دوسرے مفسرین کے یہاں مولانا تھانویؒ نے ان لوگوں کی توجیہہ بھی کی ہے جنھوں نے اس کے معنی بتائے ہیں اور ان لوگوں کی بھی توجیہہ کی ہے جنھوں نے ان کے معنی بتانے سے انکار کیا ہے پہلی جلد میں ہی انھوں نے اس طرح بیان کر دیا ہے۔ الٓمٓ کے بعد "(ف) ان حروف کے معانی سے عام لوگوں کو اطلاع نہیں دی گئی۔ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلا دیا گیا ہو کیوں کہ اللہ و رسولؐ نے اہتمام کے ساتھ وہی باتیں تبلائی ہیں جن کے جاننے سے دین میں حرج واقع ہوتا ہو اور ان کے نہ جاننے سے کوئی حرج نہ تھا اس لیے ہم کو ایسے امور کی تفتیش

---

[۱] تفسیر بیان القرآن مکمل، جلد ۴، صفحہ ۱۰۰، سورہ توبہ

نوٹ: یہ مضمون اس تفسیر سے متعلق ہے جو مختلف قوموں اور مختلف قسم کے صلح کنندگان کے درمیان ماہ و سن میں ہوا تھا۔

نہ چاہیے"۔[1]

پھر لفظ شاید کے لیے حاشیہ میں مولانا نے تشریح فرمادی کہ:

"شاید کا لفظ اس لیے بڑھا دیا ہے کہ علما اس باب میں مختلف الاقوال ہیں۔ ایک قول پر یہ شبہ ہے کہ جب حضورؐ کو کبھی نہیں تبلایا تو پھر انزال کلام اللہ سے کیا نفع ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ خاص نفع کے انتفار سے مطلق نفع کا انتفار لازم نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ علاوہ تعلیم نبویؐ کے اس میں کوئی اور نفع ہو اگر وہ نفع ہم کو معلوم نہ ہو تو ہمارے نہ جان سکنے سے عدم وجود لازم نہیں آتا۔ مقصود اس سے بیان عذر ہے مقطعات کے کچھ معنی نہ لکھنے کا کیوں کہ اس باب میں علمار کا اختلاف ہے کہ مقطعات، متشابہات میں داخل ہیں یا نہیں اور فرمایا کہ متشابہات میں جو علمار کا اختلاف ہے وہ اختلاف واقع میں لفظی ہے، حقیقی نہیں کیونکہ جو لوگ علم کی نفی کرتے ہیں وہ تفسیر یعنی تعیین مراد کے درجہ میں، اور جو لوگ اثبات علم کرتے ہیں وہ تاویل یعنی احتمال مراد کے درجہ میں ثابت کرتے ہیں پس جس درجہ کے یہ لوگ نافی ہیں اس کے وہ مثبت نہیں اور جس درجہ کو وہ ثابت کرتے ہیں اس کی یہ نفی نہیں کرتے"۔[2]

اس طرح مولاناؒ کی مندرجہ بالا عبارت حاشیہ سے حروف مقطعات کے سلسلہ میں ان کی اس رائے کا پتہ چلتا ہے جس میں انھوں نے اختلاف رائے کی وجوہات کو بھی واضح فرمایا ہے۔

تفسیر بیان القرآن میں مولانا تھانویؒ نے ایک کوشش یہ کی ہے کہ ان قصوں کو چھانٹ چھانٹ کر تفسیر سے علیحدہ کر دیا ہے اور تمام مقامات کی تفسیر کا ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے اہل عقل و نقل علمار کو اختلاف اور انکار کی ضرورت نہ پیش آئے۔ بروقت ضرورت ہر جگہ جیسا موقع ہوا پیغمبروں کے واقعات مختصر یا مفصل بیان کیے ہیں۔ مثال کے طور پر سورہ حج میں ان تمام قصوں کی نشان دہی کی ہے جن کا تعلق اس سے پہلی سورت سورہ انبیار میں ملتا ہے

---

[1] تفسیر بیان القرآن جلد اول ص۲
[2] تبیان ۲۰

اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت نوحؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت ادریسؑ، حضرت یونسؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت عیسٰی (علیہم السلام) کے قصے مختصر طریقے پر مختلف آیات کے حوالوں کے ساتھ موجود ہیں اور آیات کی تشریح و تفسیر میں مولاناؒ نے معتبر روایات کے حوالے سے حاشیے میں عربی میں دیدیے ہیں جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام کے قصے میں "فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ"[1]

اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ" میں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ہم ہرگز اس پر قدرت نہیں رکھتے کہ یہ معنی متاخرین کے یہاں اس انداز سے ملتے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام نے اللہ برتر کے متعلق یہ خیال کرلیا جب کہ یہ معنی شانِ نبوت کے بالکل خلاف ہیں مولانا تھانویؒ نے اس کے معنی معتبر روایت سے نقل کیے ہیں۔

"الروایات۔ اخرج ابن جریر والبیہقی فی الاسماء والصفات عن ابن عباس فی قولہ وذا النون اذ ذھب مغاضبا یقول علی قومہ فظن ان لن نقدر علیہ۔ یقول ان لن نقضی علیہ"[2]

یعنی ہم ان کے خلاف ہرگز حکم نہ دیں گے۔

اور یہ معنی ان آیات کے بہت صحیح اور قابل ترجیح ہیں، کیونکہ مذہب اصل میں منقول ہے صرف معقول ہی نہیں خاص طور سے جب منقول کے موافق معقول نہیں ہو تو اس کو ترجیح ہوگی۔

اس کے بعد اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کے لیے حاشیہ میں مولاناؒ نے تحریر کیا ہے:

حضرت یونس علیہ السلام نے باوجود عصمت اور برارت کے عن الذنب کے اپنی

---

[1] تفسیر بیان القرآن، جلد، صفحہ ۵۵، سورہ انبیار،
ترجمہ: انھوں نے یہ سمجھا کہ ہم ان پر کوئی دارو گیر نہ کریں گے۔ بس انھوں نے اندھیروں میں پکارا کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، آپ پاک ہیں، بیشک میں قصوروار ہوں۔
[2] حاشیہ، جلد، صفحہ ۵۵، سورہ انبیار، تفسیر بیان القرآن مکمل، مولانا تھانویؒ۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

طرف ذنب کو منسوب کیا جس میں مجاز کی تاویل کی جائے گی اس میں اس کی اصل ہے جو بعض اہلِ طریق سے منقول ہے کہ وہ کفر کی نسبت اپنی طرف کر لیتے ہیں۔"[1]

مندرجہ بالا تمام آیات قرآن کریم کے ترجمہ اور تفاسیر جواب تک مع مثالوں کے ساتھ پیغمبروں کے قصوں کے حوالوں کے ساتھ پیش کیے ہیں اُن سے کافی حد تک مولانا کے سلجھے ہوئے طرزِ تفسیر کا احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ حاشیے میں عربی تفاسیر کے حوالے، احادیث کے حوالے اس بات کے شاہد ہیں کہ اس تفسیر کا جائزہ بہت سی باریکیوں اور مشکلات کا حامل ہے جس کو گہری بصارت و بصیرت کے علماء سمجھ کر صحیح معنوں میں مولانا تھانویؒ کی اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو کر عوام الناس کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ اور اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ تفصیل سے مولانا تھانوی کی خصوصیات اس طرح سامنے آسکتی ہیں جس طرح غوطہ خور سمندر سے قیمتی سے قیمتی موتی چن کر لا سکتا ہے جن کے لیے یہ مختصر اشارے گہرائی تک پہنچنے میں مدد دے سکتے ہیں تاکہ ہمیشہ بزرگوں کی خدمات سے عوام الناس کو فائدہ پہنچتا رہے۔

---

[1] حاشیہ بیان القرآن، جلد ۷، ص۵۵، سورہ انبیاء

تفسیر بیان القرآن کے تفسیری اصول

ہر علم اور فن کی بنیاد کچھ اصولوں پر قائم کی جاتی ہے تاکہ اس کے مقاصد اور مفاد کا صحیح طور پر اندازہ لگایا جا سکے۔

اس باب میں علمِ تفسیر جو علوم اسلامیہ کا بنیادی اور اہم موضوع ہے اس کے اصول پیش کیے جائیں گے۔ چند تفاسیر کی روشنی میں تفسیر بیان القرآن میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جو تفسیری اصول پیش کیے ہیں ان کا خصوصیت سے ذکر کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ دہلوی کی الفوز الکبیر کے تفسیری اصول، سر سید کی تفسیر القرآن، مولانا عبدالحق صاحب کی تفسیر حقانی (تفسیر فتح المنان) کے تفسیری اصول کا حوالہ دیا جائے گا تاکہ ان سب کے مختصر اور جامع ذکر کے ساتھ بیان القرآن کی تفسیری اصول کی اہمیت اور افادیت کا تعین بھی کیا جا سکے اور ہر مفسر کے الگ الگ اصول سامنے آنے سے یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ کن کن مفسرین کے اصول میں مطابقت ہے اور کتنے اصول مختلف انداز سے پیش کیے گئے ہیں۔

تفسیری اصول تفسیر حقانی (تفسیر فتح المنان)

مولوی عبدالحق صاحبؒ نے تفسیری اصول پیش کرنے سے قبل اس تفسیر کا مقدمہ بہت تفصیل سے اور اہتمام سے تحریر کیا ہے۔ خود تفسیر حقانی میں جس کے بارے میں تحریر ہے:

"بہ مصلحتِ رفت مقدمہ تفسیر حقانی کو جس کی وجہ سے ہزاروں گمراہوں کو

ہدایت ہوئی ایک ایسے نئے اسلوب میں بدلنا پڑا جو اوّل ہی سے عمدہ ہے اور جس میں صدہا ضروری مضامین کا اضافہ ہوا۔ اس لیے اس کا نام ہی البیان فی علوم القرآن رکھا گیا۔[1]

دراصل قرآنِ کریم کی تشریح و تفسیر کا سلسلہ نزول قرآن کے بعد سے ہی جاری رہا۔ خود احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآنِ کریم کی اکثر تشریحات اور وضاحت کا ذریعہ ہیں جو تفسیر قرآنِ کریم کا پہلا ذریعہ ہیں اور یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ نے جاری اور قائم رکھنے کے لیے بہت سے اپنے بندوں کو قرآنِ کریم کو سمجھنے اس کے معانی پر غور و تدبّر کی صلاحیتیں عطا کیں۔ پھر اُن کے ذریعہ دوسروں کی اصلاح و تربیت کا اِک راستہ کھلا۔ مفسرین نے قرآن کی وضاحت سے قبل جو اصول بنائے حدیث و قرآن کے احکامات میں وہ تفسیری اصول کی صورت میں مندرجہ ذیل ہیں جو مولوی عبدالحق صاحب نے تحریر کیے ہیں:۔

اس تفسیر میں روایت کو کتب حدیث سے اور درایت کو اس فن کے علمائے محققین کی کتب سے نہایت احتیاط سے جمع کیا ہے اور چونکہ اصل مقصد کلام الٰہی کا لوگوں کے سامنے واضح کرنا تھا اس لیے اس کو سہل بنانے کے لیے چند امور کا خیال رکھا ہے۔

(۱) قرآن کے اصلی معانی کو اُردو میں تحریر کیا ہے۔

(۲) قرآن کی آیتوں اور سورتوں کا شانِ نزول صحیح روایات کے حوالہ سے لکھا ہے۔

(۳) احکام کی آیات میں پہلے مسائل منصوصہ کا ذکر کیا ہے۔ پھر مجتہدین کے اختلاف اور ان کے دلائل کو بیان کیا ہے۔

(۴) ایک ہی قرارت کے موافق وجہ اعراب کو بیان کیا ہے زیادہ طوالت اور حوالوں کو غیر ضروری خیال کرتے ہوئے ان سے اجتناب کیا ہے۔

(۵) قرآنِ کریم میں جو واقعات صحیح روایات یا قدیم کتب سے ثابت ہے یا خود کسی جگہ قرآن میں اس کا ذکر ہے اس کو بیان کیا ہے۔

(۶) مختلف وجوہات میں سے کسی ایک کو قوی سمجھ کر ذکر کیا گیا ہے۔

---

[1] محمد عبدالحق الحقانی دہلوی، مقدمہ تفسیر حقانی، جلد اول، مطبع دلی پرنٹنگ پریس

(۷) بلاغت و معانی سے متعلق نکاتِ قرآن کو ظاہر کیا گیا ہے۔

(۸) کوئی حدیث بغیر مستند کتب صحاح ستہ وغیرہ کے نہیں لائے۔

(۹) آیات میں ربط کا اہتمام کیا ہے۔

(۱۰) مخالفین کے ان شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لیے جو تاریخی واقعات یا قیاست سے متعلق تھے ان کا جواب تحقیقی طریقہ سے دیا گیا ہے۔

غیر ضروری تشریحات سے بچنے کے خیال سے اور کسی خاص مذہب کی بیجا تائید کرنے سے اجتناب کیا ہے۔

مولانا عبدالحق صاحبؒ نے مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں اپنی تفسیر کو اپنے خیال کے مطابق اسلاف کی عمدہ تفاسیر کا نچوڑ بنا کر پیش کرنے کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔ مولانا تھانویؒ نے اپنی تفسیر بیان القرآن کے آغاز میں ان تفاسیر اور کتب کا تذکرہ کیا ہے جن سے اپنی تفسیر میں مدد لی ہے۔ اس فہرست میں تفسیر حقانی کا بھی حوالہ دیا ہے۔[1] بیان القرآن مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تفسیری اصول کے ضمن میں جن تفاسیر اور مفسرین کے اصول ذکر کیے جائیں مناسب ہوگا کہ سب سے پہلے شاہ ولی اللہؒ کی خدمات کا مختصر خاکہ اس سلسلہ میں سامنے لایا جائے، کیونکہ قرآنِ کریم کے ترجمے کے بانی کی حیثیت سے ہندوستان کے مفسرین میں شاہ صاحبؒ کا نام سر فہرست ہے۔ ان کے دیگر علمی کاموں کے علاوہ "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" ان کی مشہور تصنیف ہے جو خاص طور سے تفسیری اصول کو سامنے رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے اسی لیے اس کا نام الفوز الکبیر فی اصول التفسیر رکھا گیا۔ اس باب میں ان تفسیری اصولوں کو زیر بحث لاؤں گی جو انھوں نے اپنے اس رسالہ[1] میں تحریر کیے ہیں اور پانچ ابواب کو علوم القرآن کے

---

[1] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔

شاہ صاحب نے یہ رسالہ زبان فارسی میں تصنیف کیا۔ اس کا اُردو عربی ترجمہ بعد میں کیا گیا۔ یہ رسالہ ہم صفحات پر مشتمل ہے جس میں مختلف انداز سے فنونِ تفسیر پر بحث کی ہے۔ اہم مباحث کی وجہ سے ہی دیگر زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا تاکہ عام طریقہ سے اہلِ علم استفادہ کر سکیں۔

سلسلے میں لکھا ہے۔

پہلا باب: ان علوم پنجگانہ[1] کے بیان میں ہے جس کی طرف قرآنِ کریم نے صداقت کے ساتھ رہنمائی کی ہے۔

دوسرا باب: قرآن کے بیان میں اور ان وجوہ کا علاج نہایت وضاحت کے ساتھ۔

تیسرا باب: نظمِ قرآن کے لطائف اور اس کے اسلوب بدیع کی تشریح بقدر طاقتِ بشری۔

چوتھا باب: فنونِ تفسیر کے بیان میں

پانچواں باب: درذکر جملہ صالحہ شرحِ غریب قرآن واسباب نزول آں کہ مفسر حفظ آں قدر ضرور است وخوضے در تفسیر بدوں حفظ آں ممنوع ومحظور درایں باب نخلہ علاحدہ شروع کردہ شد تا رسالہ باشد مستقل اگر کسے خواہد

اس وقت صرف تفصیل سے چوتھے باب پر روشنی ڈالتے ہوئے سمجھنا ہے کہ شاہ صاحبؒ

---

[1] علوم پنجگانہ:

(۱) علم احکام از قسم واجب، مستحب، مکروہ، حرام اور یہ احکام خواہ عبادت سے ہوں یا معاملات میں تدبیر منزل سے متعلق ہوں یا سیاست مدن سے۔ اس علم کی تفصیل فقہار کے ذمہ ہے۔

(۲) علم مناظرہ چاروں گمراہ فرقوں کے ساتھ مثلاً یہود و نصاریٰ، مشرکین اور منافقین۔ اس علم کی تشریح متکلمین کا کام ہے۔

(۳) علم تذکیر بآلاءاللہ، مثلاً زمین وآسمان کو پیدا کرنے اور بندوں کو ان کی ضروریات کا الہام کرنے اور نیز خداوندِ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کا بیان۔

(۴) تذکیر بایام اللہ یعنی ان واقعات کا بیان جن کو خداوند تعالیٰ نے ایجاد فرمایا ہے مثلاً اطاعت کرنے والوں کو انعام وجزار، اور مجرموں کے لیے تعذیب وسزار۔

(۵) علم تذکیر بموت اور اس کے بعد کے واقعات کا بیان مثلاً حشر ونشر، حساب، میدان، دوزخ، جنت، ان علوم کی تفاصیل کو محفوظ رکھنا اور ان کے مناسب احادیث اور آثار ملحق کرنا (باقی اگلے صفحہ پر)

فنونِ تفسیر کے لیے کن اصولوں کو بہتر سمجھتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے اس اہم باب میں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تفسیر قرآنِ کریم کے سلسلہ میں صحابہ کرامؓ کے زمانے سے تابعین تک مفسرین کی مختلف جماعتیں رہی ہیں۔ ایک جماعت صرف ان آثار کی روایت کو مانتی ہے جو آیات سے مناسبت رکھتی ہوں خواہ وہ احادیث مرفوع ہوں یا موقوف، تابعی کا قول ہو یا اسرائیلی روایت، یہ طریقہ محدثین کا رہا ہے۔

ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اسمار اور صفات کی آیات میں تاویل کرتا ہے یہ طبقہ متکلمین کا ہے۔

ایک جماعت مفسرین کی ایسی ہے جو مسائل فقہیہ کا استنباط کرتی ہے۔ یہ طریقہ فقہار اور اہلِ اصول استعمال کرتے ہیں۔

مفسرین ہی میں ایک جماعت ایسی ملتی ہے جو الفاظ قرآن مجید کی لغوی، نحوی اور صرفی اعتبار سے خصوصیت سے تشریح کرتی ہے۔ یہ اہلِ لغت کا انداز ہے۔

ایک گروہ ایسا ہے جس نے علم بیان کے نکات کو اہمیت دی ہے اور یہ ادیبوں کا انداز ہے۔

بعض لوگ تفسیر فن قرارت کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں جو قرار کی روش ہے اور کچھ مفسرین طریقت وسلوک کے نکات کو ادنیٰ مناسبت سے بیان کردیتے ہیں جو صوفیوں کا انداز ہے۔

غرض اختلافِ ذوق اور رجحان کو تفسیر کے میدان کی توسیع میں بڑا دخل رہا ہے۔ تفسیر کے سلسلہ میں شاہ صاحبؒ نے اپنے نظریات اصولِ تفسیر میں اس طرح قائم کیے ہیں جن میں وہ اعتدال کی راہ کو اپنا کر وضع کرتے ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ سے) واعظوں اور مذکروں کا کام ہے۔ بحوالہ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔ مترجم اردو رشید احمد انصاری مرحوم صفحہ ۴ تا ۵، مطبع الجمعیۃ پریس دہلی۔ سن طباعت ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ مطابق مئی ۱۹۶۳ء۔

(۱) قرآنِ کریم کے واقعات کو نقل کرتے وقت عقلی تصرف بلا ضرورت نہ کیا جائے۔ مثلاً بنی اسرائیل کی گائے نر تھی یا مادہ۔ اصحابِ کہف کے کتے کا رنگ کیسا تھا، یہ سب بے نفع تفصیلات ہوتی ہیں۔ صحابہؓ ایسی بحثوں کو تضیع اوقات خیال کرتے تھے۔

(۲) دوسرے شاہ صاحبؒ کے نزدیک اسرائیلی روایات کا نقل کرنا عام طور سے ایک مستقل ذہن بن گیا ہے جیسا کہ الفوز الکبیر میں وہ تحریر کرتے ہیں:

"اسرائیلیات کا نقل کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے ذہن میں داخل ہو گئی ہے حالانکہ قاعدہ یہ ہے کہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب[۱]۔ اس قاعدہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اوّل یہ کہ جب تک تعریض کلام اللہ کا بیان حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دستیاب ہو سکے بنی اسرائیل سے نہ نقل کرنا چاہیے[۲]۔"

لیکن اسی عبارت کے ساتھ دوسری جگہ شاہ صاحبؒ احتیاط اور ضرورت کے تقاضے کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

"اگر کوئی قصہ ایسا ہو جس کی طرف آیت کے ظاہر الفاظ میں ایسا اشارہ ہے کہ زبان کا جاننے والا اس پر اگر رک جاتا ہے تو ایسے واقعات کا بیان کرنا مفسرین کا فرض ہے[۲]۔"

شاہ صاحبؒ کی ان دونوں عبارتوں کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے تفسیر میں غیر ضروری زوائد سے بچنے کی کوشش کی ہے لیکن ضرورت پڑنے پر اس قدر اجتناب بھی نہ کیا جائے کہ واقعات کی تفصیل سے گریز کیا جائے بلکہ ایسے موقع پر مفسّر کا فرض ہے کہ وہ وضاحت اور تشریح کے ساتھ تفصیل اختیار کرے۔ شاہ صاحبؒ کا یہی طریقہ راہِ اعتدال اختیار

---

[۱] لا تصدیقوا ولا تکذبوا (الحدیث)

[۲-۳] الفوز الکبیر فی علوم التفسیر شاہ ولی اللہ دہلوی، جلد اُردو ترجمہ، مترجم رشید احمد انصاری مرحوم ص۸۔

کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

(۳) تیسرا نکتہ شاہ صاحب یہ بیان کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے آیات شرح غریب میں مفسر کو تشریح کرتے وقت دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

اوّل عربوں کی زبان کے بارے میں کہ وہ کن محاورات عرب اور جملوں کو کن مواقع پر استعمال کرتے ہیں کیونکہ قرآنِ کریم کا نزول عربی زبان میں ہوا اور اہلِ عرب کو زبان پر قدرت ہونے کی وجہ سے قرآنِ کریم کی فصاحت وبلاغت اور اعجاز کو سمجھنا دشوار نہ تھا۔ بلکہ وہ اپنی زبان دانی پر نازاں رہے ہیں۔ لہٰذا اگر قرآن کی تفسیر کے لیے مفسرین کو اس پہلو سے سمجھنا نہایت ضروری ہے ورنہ تشریح وتفسیر کا مکمل حق ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ عربی زبان کی یہ خوبی ہے کہ ایک کلمہ کے کئی معنی نکلتے ہیں اور ایک ہی لفظ میں زبان کے اعتبار سے اتنی وسعت کسی دوسری زبان میں بمشکل ملے گی۔ شاہ صاحبؒ کی تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ زبان میں تو وسعت ہے لیکن قرآنِ کریم کے مطلب کو سمجھنے اور صحیح ہونے میں کون سے معنی زیادہ قریب اور قوی ہو سکتے ہیں مفسرین کے لیے یہ سمجھنا ضروری اور اہمیت کا حامل ہے۔

دوسری بات ان کے خیال میں ان کی تحریر کے مطابق یہ خیال رکھنے کی ہے "لاحق و سابق پر کہ کونسی حیثیت راجح ہے"، یعنی سیاق وسباق کی قریبی مناسبت کا لحاظ مفسر کو آیات کی تشریح کرتے وقت رکھنا چاہیے۔

شاہ صاحبؒ کا لغتِ قرآن کے معانی کو عربوں کے محاورات کے لحاظ سے استعمال کرنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ صحابہؓ وتابعینؒ کے آثار پر پورا اعتماد کرتے ہوئے قرآن کی تفسیر کے قائل ہیں۔ کیونکہ عرب اپنے خطبات میں بکثرت ایسے محاورات استعمال کرتے تھے جو کہ مشہور قواعد کے مخالف ہوتے تھے۔ قرآن عرب زبان میں نازل ہوا اس لیے اگر کسی جگہ "و" کی بجائے "ی" اور تثنیہ کی جگہ مفرد اور مذکر کی جگہ مونث آجائے تو عربوں کے لیے کوئی حیرت کی بات نہیں۔ لہٰذا تحقیقی بات یہ ہے کہ والمقیمین الصلوۃ کا ترجمہ حالتِ رفعی کے اعتبار سے کیا جائے۔

اصولِ تفسیر کے ذیل میں شاہ صاحب نے غرائب القرآن کے سلسلہ میں کچھ بحث کرتے ہوئے چند قسمیں تحریر کی ہیں:

(۱) مثلاً "تذکیر بآلاء اللہ" کے فن میں غریب وہ آیت ہے جس میں حق تعالیٰ شانہ کی صفات کا بڑا مجموعہ ہے جیسے آیت الکرسی، سورۂ اخلاص اور سورۂ حشر جیسی آیات۔

(۲) "تذکیر بایام اللہ" میں غریب وہ آیت ہے جس میں کسی قصہ کو قرآن کی تفصیل سے بیان کیا جائے یا ایسے واقعات ہوں جس میں عبرت کے کئی پہلو نظر آتے ہوں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا قصہ جس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری خواہش تھی کہ:

"موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے ہمراہ اور زیادہ صبر کرتے تاکہ خدائے تعالیٰ ہم سے اس قصہ کو اور زیادہ ذکر فرماتا۔"[1]

(۳) "تذکیر بالموت اور مابعد الموت": اس فن میں شاہ صاحبؒ نے غریب وہ آیات تحریر کی ہیں جن میں قیامت کے حالات جمع ہوں۔ مثال کے طور پر سورۂ اذا الشمس کورت۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص قیامت کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کا آرزومند ہو اس سے کہدو کہ وہ سورۂ اذا الشمس کورت کو پڑھے — یہ حدیث شاہ صاحب نے حوالہ دیتے ہوئے اپنے اس تفسیری اصول کے رسالہ میں تحریر کی ہے۔[2]

اس کے بعد شرعی احکام کے سلسلہ میں وہ آیت غریب ہے جو کسی موقعہ پر حدود (سزا) کے لیے مثلاً "زنا" کے جرم میں شریعت میں سو درے یا کوڑوں کی ایک تعداد مقرر کی ہے۔ فن مخاصمہ میں غریب اس آیت کو کہتے ہیں جس میں اس طرح تشریح ہو کہ اس کے اسلوب اور اندازِ بیان سے کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہے جیسا کہ شاہ صاحب کے الفاظ تحریر ہیں:

---

[1] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، شاہ ولی اللہ دہلوی، ص ۸۵

[2] ایضاً 〃 〃 〃 ص ۹۶

"بسا اوقات غرائب کلام کی بلاغت اور اسلوب کی شیرینی سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً سورہ رحمٰن، یہی وجہ ہے کہ اس کا نام حدیث میں عروس القرآن رکھا گیا ہے۔"[1]

آخر میں شاہ صاحب نے ان مباحث کی وضاحت کے ساتھ حدیث شریف پیش کی ہے:

"لِکُلِّ اٰیۃٍ مِّنْھَا ظَھْرٌ وَّ بَطْنٌ وَلِکُلِّ حَدٍّ مُطَّلَعٌ"[2]

ترجمہ: (قرآن شریف کی ہر ایک آیت کے لیے ایک معنی ظاہری اور ایک باطنی ہیں اور ہر ایک حد کے لیے جھانکنے کی جگہ ہے)

یعنی ہمیں شاہ صاحب کی ان تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فنِ تفسیر یا تفسیری اصول میں شاہ صاحب ان مندرجہ بالا تمام اصول کو ضرورت کے لحاظ سے ضروری سمجھتے ہیں۔ اور قرآنِ کریم کے مطالب ظاہری اور باطنی کو احادیث کی روشنی میں سمجھتے ہیں جو مفسّر کے لیے نہایت ضروری ہے لہٰذا قرآنِ کریم کے پہلے مفسّر کی حیثیت سے اور علوم دین کی اہم خدمات کے اعتبار سے شاہ صاحب کا مقام اس قدر بلند ہے کہ ان کے بعد کے مفسرین اُن سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

شاہ صاحب کے بعد کے مفسرین میں مولوی عبدالحق صاحب جو تفسیر حقانی کے یا تفسیر فتح المنان کے مفسر ہیں۔ ان کے تفسیری اصول کے بعد سر سیّد احمد خاںؒ کے ان تفسیری اصول کا خاکہ بھی پیش کیا جا رہا ہے جو انھوں نے اپنے رسالہ[3] میں دیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے یعنی تفسیر کرتے ہوئے ان کا ہونا ضروری ہے:

(۱) **پہلا اصول** یہ ہے کہ خدا سچا ہے اور قرآن مجید اس کا کلام بالکل سچ اور صحیح ہے اور کوئی اس کو جھٹلا نہیں سکتا۔

(۲) **دوسرا اصول** یہ ہے کہ ہم ان دونوں چیزوں کو جو موجود ہیں

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلویؒ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ص ۸۶

[2] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۴۵

[3] سر سیّد احمد خاں، تحریر فی اصول التفسیر ص ۱۶، مطبع مفید عام آگرہ، سنِ طباعت ۱۸۹۲ء

ورک آف گوڈ (Work of God) یعنی خدا کے کام اور دوسرا (Word of God) یعنی خدا کا کلام۔ یہ دونوں اپنی جگہ اس قدر درست اور صداقت پر مبنی ہیں کہ ان کو نہ الگ کیا جاسکتا ہے اور نہ یہ مختلف ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ خدا کے کلام کی شکل میں قرآن کریم موجود ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور جب کلام پر یقین ہے تو پھر احکام یا اس کے بتائے ہوئے کام بھی صداقت پر مبنی ہیں جو ان سے اختلاف کرے اس کا مطلب یہ ہے کہ نعوذ باللہ خدا کے کلام کو جھٹلایا جا رہا ہے۔ اس لیے دونوں پر یقین و اعتماد ضروری ہے۔

(۳) تیسرا اصول سرسید یہ بتلاتے ہیں کہ قانونِ قدرت خدا کا عملی عہد ہے اور وعدہ وعید بہ قولی معاہدہ ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی خلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ سمجھنا کہ اس کو تسلیم کرنے سے خدا کی قدرت پر مطلق اثر پڑے یا نقصان ہو غلط ہے جیسا کہ نواب محسن الملک نے سرسید کی تفسیری لغزشوں کی نشاندہی کی تھی اور شبہات ظاہر کیے تھے۔ اس کے جواب میں سرسیدؒ نے ان کو اطمینان دلاتے اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ اصول تحریر کیے تھے۔

(۴) چوتھے اصول میں سرسید اپنا نظریہ یہ پیش کرتے ہیں کہ انسان کو خدا کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا یا مذہب کو انسان کے لیے بنایا گیا۔ ان دونوں صورتوں میں یہ بات ضروری ہے کہ انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا گیا ہے کیونکہ انسان اور دیگر مخلوقات کے درمیان امتیاز عقل اور زبان کا ہے۔ انسان عقل کی بنیاد پر مذہب کے اصول سمجھ کر قوانینِ قدرت کی صداقت کا ادراک کر سکتا ہے اور مذہب کا کوئی اصول بھی عقلِ انسانی کی دسترس سے باہر نہیں ہوتا اور اگر انسانی عقل کے دائرے سے باہر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اس کا مکلّف نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے سرسیدؒ احمد خاں نے مثال دی کہ مثال کے طور پر بیل یا گدھے کو امر و نہی کا مکلّف قرار دیا جائے یا جونپور کا قاضی بنا دیا جائے[1]

---

[1] سرسید احمد خاں، تحریر فی اصول التفسیر ص۱۱

سرسید احمد خاں کے ضبط کردہ مندرجہ بالا اصول کا جائزہ لیتے ہوئے ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ دراصل ان کا مقصد مذہبی اصول اور قدرت کے قوانین کو قرآنِ کریم کے ذریعہ انسانی عقل کے ذریعہ سمجھنا ضروری ہے جس کا علم انسان کی تفسیر سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن عقلِ انسانی پر حد سے زیادہ اعتماد اس شبہ اور منزل پر پہنچا دیتا ہے جہاں کبھی کبھی اصل مفہوم اور مقصود تک میں رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم میں عقلِ انسانی کو مناسب وزن دیتے ہوئے اس کے محدود ہونے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ نقل کے ساتھ ساتھ عقل کو بعض مفسرین غیر محدود وزن نہیں دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ سرسیدؒ نے یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ میری تفسیر علماء کے لیے نہیں بلکہ ان لوگوں کے لیے زیادہ مفید ہو سکتی ہے جو اسلام کے بعض حقائق کا انکار کرتے ہیں۔ اسی لیے غالباً سرسیدؒ نے اپنی تفسیر میں اس قسم کے لوگوں کے لیے عقل کو ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم کی تفسیر میں کمزوریوں کے باوجود ان کی نیت پر کسی قسم کا شبہ مناسب نہ ہوگا کیونکہ نیت کا معاملہ خدا اور بندہ کا ہوتا ہے۔ البتہ ایسے مفسر کے علم یا عمل سے اگر اسلامی اصول یا عقیدے کو ٹھیس پہنچتی ہے تو اس پر تنقید کا پورا حق ہے مگر اس طرح کہ تنقید کے ساتھ اپنے نظریہ کو پورے دلائل اور حقائق کی روشنی میں واضح کر سکے۔

سرسید احمد خاں، شاہ ولی اللہؒ اور تفسیر حقانی کے تفسیری اصول پیش کرنے کے بعد اصل مقصد پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تفسیری اصول پیش کرتے ہیں کہ ان حضرات کی کاوشوں کے بعد مولانا تھانویؒ نے کن کن اصولوں کو تفسیر کے لیے ضروری سمجھ کر تحریر فرمایا ہے

تفسیر مواہب الرحمٰن[1] (جامع البیان) سید امیر علی کی اُردو تفسیر ہے اور جو مکمل ہے۔ سید امیر علیؒ نے قرآن کی تفسیر کے لیے جو اصول اور علوم اپنی تفسیر میں تحریر کیے

---

[1] سید امیر علی مفسر، تفسیر مواہب الرحمٰن (جامع البیان) مطبع نول کشور لکھنؤ، سنِ طباعت ۱۳۴۴ھ، ص۶۵

ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) لغاتِ عرب سے واقفیت ہو تاکہ مفردات کی شرح جانے۔ مجاہدؒ نے فرمایا کہ:

"کسی مومن کو حلال نہیں کہ تفسیر کلام اللہ میں کلام کرے جب تک وہ لغاتِ عرب سے واقف نہ ہو اور اسی کے مانند امام مالکؒ سے مروی ہے"۔[1]

سید امیر علی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں متقدمین اہلِ تفسیر پر اکتفا کرنا بہتر ہے لہٰذا خود انھوں نے متقدمین اہلِ سنت پر اکتفا کیا باوجودیکہ حضرت ابن عباسؓ سے کلمات کی تفسیر خود مروی ہے۔

(۲) دوسرے علم نحو کا جاننا مفسرین کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ تحریر کرتے ہیں کہ اعراب کے اختلاف سے معانی بدل جاتے ہیں۔ حسن بصری سے کسی شخص نے پوچھا کہ وہ زبانِ عربی یعنی نحو اس واسطے طلب کرتا ہے کہ زبان درست اور قرارت ٹھیک ہو تو فرمایا کہ نیک کام ہے۔

(۳) تیسرے علم صرف کیونکہ جو شخص اس سے غافل ہے وہ جہالت کرتا ہے۔ چنانچہ زمخشری نے لکھا ہے کہ قولہ تعالیٰ۔

"يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ"[2]

بعض جاہلوں نے امام جمع اُم سے لے لیا حالانکہ یہ تفسیر اس مقام پر بالکل غلط ہے کیونکہ اُم کی جمع امام نہیں آتی۔

(۴) علمِ اشتقاق، کیونکہ مختلف مادہ سے مشتق ہونے میں معانی بدل جاتے ہیں۔

(۵) علمِ معانی

(۶) علمِ بیان

[1] سید امیر علی مفسر، تفسیر مواہب الرحمٰن، (جامع البیان)، مطبع نول کشور لکھنؤ، سنِ طباعت ۱۳۱۳ھ، ص ۶۵

[2] سورہ کہف۔ پارہ پندرہ

(۷) علمِ بدیع

زمخشری نے کہا کہ اعجازِ کلام اللہ کی تفسیر کرنے والا بخوبی لحاظ رکھے کہ نظم خوب و بلاغت کامل سے اس کی تفسیر مخالف نہ ہو۔

(۸) آٹھواں علمِ قرارت ہے اس کی ضرورت ظاہر ہے۔

(۹) نویں علمِ اصولِ دین تاکہ ظاہر آیات بلیغہ سے جاہل کو بداعتقادی کا وہم نہ ہو

(۱۰) علم اصول فقہ۔ تاکہ آیاتِ احکام سے طریقِ شرع و اصول کے موافق حکم نکالے۔

(۱۱) علم اسباب نزول

(۱۲) علم ناسخ و منسوخ، تاکہ جو حکم محکم باقی ہے وہ معلوم ہو۔

(۱۳) علمِ فقہ۔ تاکہ سنت سے مخالفت نہ ہو۔

(۱۴) علم احادیث، تاکہ مجمل و مبہم کی تفسیر معلوم ہو۔

(۱۵) علم وہبی ہے

سید امیر علیؒ کے مندرجہ بالا تحریر کردہ اصول تفسیر کے بعد الاتقان فی علوم القرآن، جلال الدین سیوطیؒ نے جو اصول مفسر کے لیے ضروری لکھے ہیں اُردو ترجمہ سے نقل ہیں الاتقان میں ان اصول کے لیے مندرجہ ذیل عبارت ہے:

"جو شخص ان علوم کا جامع و ماہر ہو جن کی حاجت مفسر کو ہوتی ہے اُسے تفسیرِ قرآن کی اجازت ہے وہ مندرجہ ذیل پندرہ علوم ہیں[1]

(۱) علم لغت۔ کیونکہ مفردات الفاظ کی شرح اور ان کے مدلولات باعتبار وضع اسی علم کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں۔ مجاہدؒ نے کہا ہے جب تک لغاتِ عربی کا عالم نہ ہو اس وقت تک کتاب اللہ کے بارے میں کلام کرے جائز نہیں۔ امام مالکؒ نے کہا تھوڑی سی لغت کا جاننا بھی ہرگز کافی نہیں جب تک پوری واقفیت نہ ہو، کیونکہ بعض اوقات کوئی لفظ مشترک ہوتا ہے حالانکہ اس سے مراد وہاں دوسرے

[1] الاتقان فی علوم القرآن اُردو ترجمہ جلد دوم صفحہ ۲، ۵ تا صفحہ ۵، ۵، جلال الدین سیوطیؒ

معنی ہوتے ہیں۔

(٢) علم نحو

(٣) علم صرف

(٤) علم اشتقاق

کیونکہ اگر اسم کا اشتقاق دو مختلف مادوں سے ہوگا تو وہ اپنے دونوں مادوں کے مختلف ہونے کے لحاظ سے الگ الگ ہوگا جیسے مسیح کہ معلوم نہیں کہ وہ سیاحت سے نکلا ہے یا مسح سے۔

(٥) علم معانی

(٦) علم بیان

(٧) علم بدیع

(٨) علم قرارت

(٩) علم اصولِ دین

(١٠) علم اصولِ فقہ

(١١) اسباب نزول اور قصص کا علم

(١٢) علم ناسخ و منسوخ

(١٣) علم فقہ

(١٤) ان احادیث کا علم جو کہ تفسیر مجمل و مبہم کی

(١٥) علم وہبی یا علم لدنی

مولانا تھانوی رہ نے جو اصول اپنی تفسیر تحریر کرتے وقت ملحوظ رکھے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(١) اول قرآن مجید کا آسان ترجمہ کیا ہے جس میں قابلِ فہم ہونے کے ساتھ ساتھ تحت لفظی[١]

---

[١] قولہ تحت لفظی کی بھی رعایت ہے لیکن التزاماً للترادف ج اص ٣ مکمل بیان القرآن، مولانا اشرف علی تھانوی سنِ طباعت ١٣٥٢ھ مطبع تاج پبلشرز (دہلی)

کی خاص رعایت ہے۔

(٢) دوم ترجمہ میں خالص محاورات استعمال نہیں کیے گئے۔ دو وجہ ہے۔ اوّل تو میں قصباتی ہوں، محاورات پر عبور نہیں۔ دوسرے یہ کہ محاورات ہر مقام پر جدا جدا ہوتے ہیں۔ اگر دہلی کے محاورات لیے جاتے تو اہلِ لکھنؤ نہ سمجھتے، یہاں کے محاورات وہاں نہ سمجھتے، ان دونوں کے محاورات حیدر آباد اور مدراس والے نہ سمجھتے۔ غرض ایسے محاورات عام فہم نہیں ہوتے اور اُردو ترجمہ کم از کم ایسا تو ہو کہ قریب قریب ہندوستان کے سب حصے تو اس کو سمجھ جاویں۔ اس لیے کتابی زبان لی ہے کہ فصاحت کے ساتھ اس میں سلاست بھی ہے۔

(٣) سوم۔ نفیس ترجمہ کے علاوہ جس مضمون کو بہت ضروری دیکھا اس پر توضیح ترجمہ کی موقوف ہے۔ یا خود کوئی شبہ قرآن کے مضمون سے ظاہراً پیدا ہوتا تھا اس کا جواب یا مضمون قرآنی کسی مشہور تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتا تھا اس کی تحقیق یا اسی قسم کی کوئی ضروری بات ہوئی اس کو "ف" بنا کر بڑھا دیا۔ باقی لطائف[١] و نکات یا طویل و عریض حکایات یا فضائل یا بہت سے مسائل وغیرہا سے تفسیر کو طویل نہیں کیا گیا۔ غرض یہ کہ مضامین کا جمع کرنا مقصود نہیں بلکہ محض حل قرآن و رفع ضرورت۔ لیکن باوجود اتنی رعایت کے بھی غیر علماء و طلباء کے لیے بہت سے مقامات میں علماء سے استغناء نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مناسب بلکہ واجب یہ ہے کہ ایسے حضرات صرف اپنے مطالعہ و فہم پر اعتماد نہ فرمائیں بلکہ حسبِ ضرورت علماء یا منتہی طلباء سے اس کو سبقاً سبقاً سمجھ کر پڑھ لیں، ورنہ اقل درجہ اتنا تو ضرور ہے کہ مطالعہ کے وقت جہاں ذرہ برابر بھی اشتباہ ہو وہاں غور کر کے خود نہ نکال لیں بلکہ پنسل سے نشان کر کے علماء سے وہ عبارت دکھلا کر حل کر لیں اور بدوں اس کے احتمال بلکہ یقین غلط فہمی کا ہے۔

---

[١] مولاناؒ نے تفسیر کے حاشیہ میں عربی عبارت تحریر کی ہے جس کا اُردو ترجمہ ذیل میں ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

(۴) چہارم۔ جس آیت کی تفسیر میں بہت سے اقوال مفسرین کے ہیں ان میں جس کو ترجیح معلوم ہوئی اس کو لے لیا بقیہ سے تعرض نہیں کیا۔

(۵) پنجم۔ مطلب قرآن کی تفسیر کہیں تو اس طرح کی ہے کہ مضمون کا ارتباط[1] خود ظاہر ہو جائے اور کہیں ایک سرخی ربط کی لکھ کر اس کی تقریر کر دی گئی ہے۔

(۶) ششتم۔ اختلافات کی تفسیر میں صرف مذہب حنفی لیا گیا ہے اور دوسرے مذاہب بشرط ضرورت حاشیے میں لکھ دیے گئے ہیں۔

(۷) ہفتم۔ چونکہ نفع عام کے ساتھ افادہ خواص کا بھی خیال آگیا اس لیے ان کے فائدے کے واسطے ایک حاشیہ بڑھایا ہے جس میں مکیت ومدنیت سور وآیات وغیر مشہور لغات وضروری وجوہ بلاغت ومتعلق ترکیب وخفی الاستنباط فقہیات وکلامیات واسباب نزول وروایات واختلاف قرات مغیرہ وترکیب یا حکم وتوجیہہ وترجمہ وتفسیر ایجاز کے ساتھ مذکور ہیں۔ جس کو متوسط درجہ کا طالب علم بے تکلف سمجھ سکتا ہے۔ یہ حاشیہ درس وتدریس کے وقت بہت کام آسکتا ہے۔ اس حاشیہ کی عربی عبارت اس لیے تجویز کی ہے کہ عوام اس کو دیکھنے کی ہوس ہی نہ کریں ورنہ جب زبان سمجھتے اور مضامین نہ سمجھتے بہت پریشان ہوتے۔ اب اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ یہ تفسیر مختصر یا ترجمہ مطول کہہ لیجیے عوام وخواص سب کے کام کا ہوگا اور اگر اہل علم اول صرف قرآن کا مطالعہ کر کے بطور خود غور کریں اور اس میں جو امور ذہن میں مجمل رہیں یا جو اشکالات واقع ہوں ان کو مستحضر کر کے پھر اس تفسیر کو ملاحظہ فرمائیں تو انشاء اللہ تعالیٰ دوبالا لطف اور حظ حاصل ہو۔ امید ناظرین سے یہ ہے کہ اس کو مطالعہ فرما کر میرے واسطے مغفرت ورحمت کی دعا مانگیں بڑا لالچ اس مشقت سے یہی ہے ؎

اے کہ برما میری دامن کشاں ۔۔۔ از سر اخلاص الحمدے بخواں

---

[1] بیان القرآن جلد اول ص۴۲ پر مولاناؒ نے اس کا عربی حاشیہ دیا ہے۔

اصطلاحات اس تفسیر کی یہ ہیں کہ جو عبارت خطوط ہلالیہ سے خارج ہے وہ ترجمہ ہے۔ اور جو خطوط ہلالیہ کے اندر محصور ہے وہ ترجمہ سے زائد ہے اور باوجود کافی ہونے اس فارق کی زیادت احتیاط وتوضیح کے لیے ترجمہ پر خط بھی کھینچ دیا ہے جو علامت متن کی ہے اور ترجمہ میں اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ادھر جہاں قرآن لکھا ہے اس کے نیچے بھی ترجمہ لکھدیا ہے اور ایک التزام یہ بھی کیا گیا ہے کہ حاشیہ عربیہ میں جہاں کسی کتاب کی بعینہ عبارت لی گئی وہاں اس کتاب کا نام لکھدیا ہے اور جہاں کچھ مناسب تصرف ہوا وہاں نام کتاب کے قبل لفظ من بڑھا دیا ہے۔ جہاں استاذی لکھا ہے اس سے مراد حضرت مولانا یعقوب رحمۃ اللہ ہیں اور جہاں مرشدی لکھا ہے اس سے مقصود حضرت مولانا الحاج امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ ہیں۔ جہاں کوئی مأخذ نہیں لکھا وہاں احقر نے اپنی رائے سے یا دداشت سے لکھ دیا ہے۔ سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون وسلام علی المرسلین

فقط: الراقم محمد اشرف علی تھانوی عفی عنہ

ذکر بعضے امور عجیبہ ملتزمہ در تحریر تفسیر ھذا

یہ امور اس عنوانات کے تحت ہیں جو مولاناؒ نے نظر ثانی کے بعد مکمل بیان القرآن کے تفسیری خطبے کے بعد اضافہ کیے۔ اس لیے اس میں کچھ قواعد وہ بھی ہیں ہیں جو خطبہ میں آچکے ہیں۔

مآخذ تفسیر بیان القرآن جو مولاناؒ نے تحریر کیے ہیں:

(۱) اس تفسیر کے لکھنے کے وقت جو کتابیں میرے پاس رہتی تھیں۔ (۱) بیضاوی شریف (۲) جلالین (۳) تفسیر رحمانی (۳) معالم التنزیل (۴) روح المعانی (۵) مدارک (۶) خازن (۷) تفسیر فتح المنان (۹) تفسیر ابن کثیر (۱۰) لباب (۱۱) درمنثور (۱۲) کشاف (۱۳) قاموس[1]

---

[1] مولانا اشرف علی تھانوی، مکمل بیان القرآن، جلد اول، ص۵

toobaa-elibrary.blogspot.com

بعض تراجم قرآن۔ ان میں سے بعض کتابیں اوّل سے پاس رہیں اور بعض کچھ لکھنے کے بعد آئیں اور بعض بالکل اخیر میں آئیں۔ چنانچہ اس کی تفصیل و تعیین معلوم ہوسکتی ہے اور ضرورت کے وقت کتب حدیث و فقہ، سیر کی مراجعت بھی کی جاتی تھی۔

(۲) قرآن مجید کے اوّل سے آخر تک ہر سورت کا اور ہر آیت کا ربط ماقبل کے ساتھ نہایت سہل اور قریب تقریر میں بالالتزام بیان کیا گیا۔ اکثر سورتوں کے شروع میں ان سورتوں کا خلاصہ بھی بیان کردیا گیا۔

(۳) جتنی آیتوں کی تفسیر بوجہ اتحاد یا تقارب یا تناسب مضامین کے ایک جگہ مجتمع کر کے لکھی گئی ہے، ان کے اول میں ان مضامین کا ایک جامع عنوان بطور سرخی کے لکھ دیا گیا ہے جس سے اجمالاً ان تمام آیات کا خلاصہ ذہن میں مستحضر ہونے کے بعد مفصل تفسیر سے جو کچھ نفع اور حظ حاصل ہوگا اس کو ناظرین خود دیکھیں گے۔ پھر ان آیات کی تفسیر ایسے طور پر کی گئی ہے کہ سب ایک مسلسل تقریر معلوم ہوتی ہے۔

(۴) جن روایات پر تفسیر کو مبنی کیا گیا ہے ان میں التزام کیا گیا ہے کہ وہ صحیح روایتیں ہوں البتہ جہاں تفسیر کسی روایت پر مبنی نہ تھی اور لفظ قرآن فی نفسہ بھی اس وجہ کو متحمل تھا تقویت احتمال کے لیے اشتراط صحت میں تسامح کیا گیا۔

(۵) شبہات کے جواب دینے میں صرف ان شبہات کو خاص کیا ہے جن کا منشا کوئی دلیل صحیح تھی۔ جیسے کوئی آیات یا کوئی حدیث یا کوئی امر ثابت بالعقل یا بالحس اور جن کا منشا کوئی امر صحیح نہیں ہے بلکہ وہ شبہہ خود دعویٰ بلا دلیل ہے، اس کے جواب میں چونکہ طلب دلیل کافی ہے اس لیے اس سے تعارض نہیں کیا گیا اور بہت سے شبہات نفس تقریر ترجمہ سے مندفع ہوگئے ہیں۔

(۶) کوئی مضمون ضرورت سے زائد نہیں لکھا مگر شاذ و نادر کسی خاص فائدے کے لیے۔

(۷) ترجمے میں ترکیب کی رعایت زیادہ کی گئی ہے بہ نسبت اتباع محاورہ کے۔

(۸) چونکہ احقر کو مباحث متعلقہ کتب سماویہ سابقہ پر بالکل نظر نہیں ہے اس لیے

ایسے مضامین کو تفسیر حقّانی سے نقل کردیا گیا ہے۔

(۹) غالباً تمام تفاسیر میں دو یا تین مقام ایسے ہیں وہاں جیسا جی چاہتا تھا ویسا شرح صدر نہیں ہوا۔ اس موقع پر احقر نے اس کی تصریح کردی ہے تاکہ اگر کسی کو اس سے اچھی تقریر و تفسیر میسر ہوجائے اسی کو راجح سمجھے۔

(۱۰) مسائل فقہیہ و کلامیہ کی ہر آیت کے متعلق اسی قدر تحقیق پر اکتفا کیا گیا ہے جس پر تفسیر قرآن کی موقوف تھی۔

(۱۱) جو مضامین قابل زیادہ تفصیل و تحقیق کے کئی جگہ آئے ہیں ان کو الگ الگ لکھ کر دوسری جگہ اس پہلی جگہ کا حوالہ دے دیا گیا ہے یا پہلی جگہ اس دوسری جگہ کا وعدہ کیا گیا ہے۔

(۱۲) ہر جگہ تفسیر میں اتباع سلف صالح کا کیا ہے۔ متاخرین کے اقوال کو جو سلف کے خلاف تھے نہیں لیا۔

(۱۳) جہاں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں ان میں سے جس کو روایت یا ذوقِ عربیت سے راجح سمجھا صرف اسی کو اختیار کرلیا گیا سب کو نقل نہیں کیا۔ البتہ اگر کہیں کہیں دونوں وجہیں متساوی معلوم ہوئیں دونوں کو نقل کردیا ہے۔

(۱۴) تقریر مدلول آیات میں قواعد میزانیہ منطقیہ کی پوری طور سے رعایت کی گئی ہے جس کا لطف اذکیا اور علماء کے جی سے پوچھنا چاہیے[1]

(۱۵) مجھ کو معلوم ہے کہ کہیں کہیں تقریر زیادہ تنگ ہے لیکن اس کی کفایت میں کوئی خلل نہیں۔ البتہ کم استعداد لوگوں کو اہل علم سے اس کے حل اور توضیح کی حاجت ہوگی۔ اس طرح بعض جگہ ایسے مضامین بھی آگئے ہیں کہ ان کا سمجھنا مخصوص اہل علم کے ساتھ ہے اس لیے میرے نزدیک مطلقاً ضروری ہے کہ اس تفسیر کو اوّل سے آخر تک کسی عالم سے سبق کے طور پر پڑھ لیا جائے اور جو مضمون اس پر بھی

---

[1] مولانا اشرف علی تھانوی، جلد اول، صفحہ ۶، تفسیر بیان القرآن، اڈیشن جدید مکمل بیان القرآن

سمجھ میں نہ آئے اس کو علوم درسیہ پر موقوف سمجھا جاتے اور یہ امر یقینی ہے کہ اس سے پورا لطف حاصل ہونے کی شرط علوم متعارفہ میں مہارت اور اس میں بھی کسی مقام پر تحریر و مراجعت تفاسیر کے بعد اس تفسیر کو ملاحظہ کرنا ہے۔

(۱۶) اور بہت سے امور ضروریہ و لطیفہ ترجمہ و تفسیر میں ایسے ملیں گے جو بیان سے خیال میں نہیں آسکتے۔ مطالعہ پر ان کو حوالہ کیا جاتا ہے۔

(۱۷) لطائف اور نکات جن کو تفسیر میں دخل نہ تھا وہ مقصود بالقرآن نہ تھے بالکل مہجور کر دیے گئے۔ مقصود اصلی حل قرآن کو رکھا گیا ہے۔

(۱۸) جن آیات کی تفسیر میں حدیث مرفوع آئی ہے اس کے مقابلے میں کسی کا قول نہیں لیا گیا۔

(۱۹) چونکہ التزامات مذکورہ کی ضرورت خیال میں تدریجاً آتی رہی اس لیے ممکن ہے کہ اول کے اجزاء میں بعض التزامات کی رعایت متروک ہو گئی ہو۔ نیز چونکہ اس کی بارہ جلدوں میں سے جن میں ہر جلد اڑھائی پارہ کی ہے لیکن تحقیقاً کہیں بوجہ قرب سوات کے کسی قدر کم یا کسی قدر زیادہ۔ اول جلد متصلاً نہیں لکھی گئی بلکہ درمیان میں فترات وقفات اتفاقیہ واقع ہوتے رہے۔ اس لیے خود اس کے اجزاء میں اور پھر اس میں اور بقیہ جلدوں میں طرز وضع کے اعتبار سے کسی قدر تفاوت بھی ہے جو نظر غائر سے معلوم ہو سکتا ہے۔

(۲۰) باقی جو مضامین حواشی عربیہ میں لکھے ہیں وہ مخصوص ہیں اہل علم کے ساتھ۔ ان کے التزامات پر تنبیہ کرنے کی اس مقام پر حاجت نہیں باقی ان سب معروضات کے بعد جو ناظرین کی مصلحت سے ظاہر کیے گئے ہیں۔ اپنی خاص حالت کے اعتبار سے یہ معروض ہے ؎

نہ بنفشہ بستہ شوشتم نہ عرق ساختہ سر خوشم
نفسے بیاد تو میکشم چہ عبارت و چہ معانیم

مندرجہ بالا ترتیب وار بیس[۲۰] امور مولانا تھانویؒ نے تحریر زمانے میں اس سے قبل مقدمہ میں ۱۱ اصول اور تحریر کیے جا چکے ہیں یعنی ۳۱ اصول جو مولاناؒ نے بیان القرآن تحریر کرتے وقت ملحوظ رکھے ہیں ملتے ہیں جس سے مولاناؒ کی تفسیری خدمت میں محنت اور غور و فکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولاناؒ نے یہ خدمت عوام و خواص دونوں کی افادیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہت جانفشانی اور لگن کے ساتھ انجام دی ہے۔ اگرچہ اب تک جن مفسرین کے اصول تحریر کیے گئے ہیں ان کی تفاسیر بھی قرآن کریم کے سمجھنے کے اہم تقاضوں کو پورا کرنے کی عظیم کوشش کی شکل میں نظر آتی ہیں لیکن ہر تفسیر میں مفسر کا ایک اپنا خاص مزاج اور طریقۂ کار کی گہری چھاپ موجود ہے جو کہیں تفسیر میں تاریخی واقعات کی تفصیل اور طوالت قرآن کریم کے اصلی معانی و مفہوم پر غالب آجاتی ہے جیسا کہ مولانا عبدالحقؒ صاحب کی تفسیر حقانی کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض تفسیریں زمانے اور وقت کی ضرورت، علوم سائنس اور مادیت کے شواہد اور دلائل پیش کرنے کی بے پناہ کوشش کی وجہ سے قرآن کریم کے مضامین اور عقائد پر اثر انداز اس حد تک ہوئیں کہ اہل علم حضرات نے بھی اس گرانی کو محسوس کیا جیسا کہ سرسیدؒ کی تفسیر جو باوجود نامکمل ہونے کے لحاظ سے اس قدر اہم بھی ہے کہ جو تحقیقات اور معلومات سرسیدؒ نے دوسرے مذاہب کی پیش کی ہیں ان کو عربی داں مفسرین پیش نہیں کر سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو تفاسیر میں سرسیدؒ کی تفسیر کو غیر اقوام اور تعلیم یافتہ طبقے میں جو دور حاضر کے علوم کی روشنی میں قرآن کریم کو سمجھنا چاہتے ہیں ایک خاص مقام حاصل ہے اس کے مقابلے میں مولانا تھانویؒ کی تفسیر مکمل بیان القرآن جو سرسیدؒ کی تفسیر کے کافی عرصہ کے بعد لکھی گئی اس دور کے اُن لوگوں کی فہم سے بالاتر ہے جو مشکل عربی یا اردو سے ناواقف ہیں کیونکہ مولانا تھانویؒ کی تحریر کے مطابق انھوں نے ترجمہ و تفسیر میں کتابی زبان لی ہے جو عام اردو داں طبقہ کے لیے بہت دقیق اور مشکل ہو جاتی ہے۔ علاوہ حاشیہ کے جو عربی میں ہے اور علماء کے لیے ہے اردو کا مطلب بھی اچھی طرح ہر کس و ناکس بغیر کسی سے سمجھے نہیں سمجھ سکتا۔ مثلاً مولاناؒ نے ہر آیت کے ترجمہ و تفسیر کے لیے

ایک عنوان مقرر کر دیا ہے جیسے آیت ہے یاایھا الذین اٰمنوا لا تبطلوا صدقتکم بالمن والاذی[1] ۔ اس کی سرخی قائم کی ہے ۔ بطلان ثواب بمن واذی ۔ ترجمہ :

(اے ایمان والو تم احسان جتلا کر یا ایذا پہنچا کر اپنی خیرات کو برباد مت کرو[2])

اس آیت سے قبل گذشتہ آیت قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَآ اَذًی ؕ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ (ترجمہ مولانا تھانوی ؒ مناسب بات کہہ دینا درگذر کرنا بہتر ہے ایسی خیرات سے جس کے بعد آزار پہنچایا جائے اور اللہ تعالیٰ غنی ہیں حلیم ہیں)

ترجمہ کے بعد مولانا ؒ نے ان آیات کی مختصر تفسیر کی وضاحت سے آگے اس طرح کی :

" ناداری کے وقت جواب میں معقول و مناسب بات کہہ دینا ۔ اگر سائل بد تمیزی سے غصہ دلائے یا اصرار سے تنگ کرے تو اس سے درگذر کرنا ہزار درجہ بہتر ہے ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد آزار پہنچایا جائے ۔ اللہ تعالیٰ خود غنی ہیں ، کسی کے مال کی ان کو حاجت نہیں جو کوئی خرچ کرتا ہے اپنے واسطے پھر آزار کس بنا پر پہنچایا جائے اور آزار دینے پر جو فوراً سزا نہیں دیتے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حلیم ہیں ۔

ف : نادار کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ استطاعت کے وقت حاجتمند کی اعانت نہ کرنا خود برا ہے ۔ البتہ ناداری کے وقت نرمی سے جواب دیدینا اور سائل کی سختی کو ٹال دینا چونکہ موجب ثواب ہے اس لیے اس کو خیر فرمایا گیا اور آزار پہنچانا حرام ہے اور موجب عذاب ہے"[3]

---

[1] سورہ بقرہ پارہ تلک الرسل

[2] مولانا اشرف علی تھانوی ، تفسیر بیان القرآن ، ج اول ، ص ۱۵۰

[3] ایضاً " " ص ۱۵۷ و ص ۱۵۸

مندرجہ بالا آیات کا ترجمہ و تفسیر و عنوان آج کے دور کے عام اردو سمجھنے والے کے لیے زبان و معانی کے اعتبار سے ضرور مشکل ہوگا اگر کوئی ذوق اور تھوڑی بہت استعداد سے سمجھ بھی لے تو حاشیہ[1] میں جو تشریح مولانا ؒ نے فرمائی ہے ۔ اس کو تو کم از کم بغیر کسی عالم کے نہیں سمجھا جا سکتا ہے ۔

مولانا اشرف علی تھانوی ؒ نے بیان القرآن میں ترتیب وار تمام احوال ضرورت وقت کے لحاظ سے اس طرح قائم کیے ہیں کہ تفسیر کا حق بھی ادا ہو جائے اور عوام و خواص کو ان کے ترجمے یا تفسیر کے سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے ۔ انھوں نے اپنے اسلاف کی تفاسیر کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کریم کے ان اصول اور قوانین کو ہی اپنایا ہے جن کے بغیر تفسیر یا ترجمہ کرنا تقریباً ناممکن ہے ۔ مثلاً عربی زبان پر قدرت اس کی گرامر سے واقفیت یعنی علم صرف اور علم نحو وغیرہ ۔ اس کے ساتھ علم فقہ ، علم قرات احادیث پر گہری نظر ہو ، لہٰذا قرآن کریم کے ہر مفسر کے لیے ان باتوں کا جاننا ضروری ہے اس لیے قدیم تفاسیر کے اور مولانا تھانوی ؒ کے وضع کردہ اصول میں یکسانیت پائی جاتی ہے ۔ البتہ کہیں کہیں مولانا ؒ نے دیگر مفسرین کے اصول کے علاوہ کچھ اضافہ اور تبدیلی کی ہے ۔ اس کی وجہ بھی انھوں نے تحریر کر دی ہے ۔ مثال کے طور پر آیات کا اردو ترجمہ کرتے وقت خالص محاورات استعمال نہیں کیے کیونکہ ہر جگہ کے زبان و محاورات پر خود مولانا کو عبور نہ تھا ۔ دوسرے ہر علاقے کی زبان و محاورات میں کچھ فرق ضرور ہوتا ہے اس لیے ترجمہ و تفسیر کے سمجھنے کا دائرہ محدود ہو جاتا ، لہٰذا مولانا ؒ نے کتابی زبان استعمال کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ہندوستان کے ہر حصہ کا ہر طبقہ بآسانی سمجھ لے ۔

---

[1] حاشیہ بیان القرآن ، جلد اول ، ص ۱۵۹ ۔

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ کی تقریر اصل تفسیر میں مشعر ہے ابطال و صف تضاعف مراد ہونے کو اور فائدے میں مشعر ہے ابطال نفس عمل مراد ہونے کو سو تحریر فائدے کے وقت اصل تفسیر پر نظر نہ رہی تھی ۔ اس اتفاقی ذہول سے خدا ساز ایک نفع ہو گیا کہ مجموعہ تقریرین سے ایک تحقیق حاصل ہو گئی وہ یہ کہ اس ابطال کی تفسیر کہیں منصوص نہیں اس لیے دونوں ذوع فی نفسہٖ محتمل ہیں بدون دلیل کے حکم قطعی کسی کا بالیقین نہیں ہو سکتا ۔

دوسرے مولانا تھانویؒ نے یہ جانتے ہوئے کہ ان سے قبل علماء اس خدمت کو بہت تفصیل و وضاحت کے ساتھ انجام دے چکے ہیں اس لیے جس مضمون کو بہت ضروری خیال کیا یا اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش محسوس کی اس کی وضاحت اور تفصیل پیش کی ہے ورنہ مختصراً ترجمہ و تفسیر کرنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ خود ان کی تفسیر کے کئی مقامات سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ جہاں تفسیر میں تاریخی واقعات کا ذکر ہے اُن کے لیے مولانا نے تحریر کر دیا کہ جو حضرات تفصیلی مطالعہ کا ذوق و شوق رکھتے ہوں وہ مولانا عبدالحقؒ کی تفسیر حقانی کا مطالعہ کرلیں کیونکہ خود مولاناؒ نے ان کے حوالے دیتے ہوئے تاریخی واقعات کو نقل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مولانا تھانویؒ کی زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف میں گذرا علاوہ اس تفسیری خدمت کے ان کا مقصد اکثر تصانیف کا یہ رہا کہ وقت کا تقاضا اور مصلحت، ضرورت کیا ہے۔ ان کی دوررس نگاہ امتِ محمدیہ کے مزاج اور بگڑے ماحول پر بھی تھی۔ اسی لیے انھوں نے زمانے کی رفتار کو دیکھتے ہوئے اپنی علمی صلاحیت اور ذہانت کے ظاہری ذریعہ سے مسلمانوں کی نباضی اتنے صحیح طریقہ سے کی کہ آپ کو حکیم الامتؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جہاں اسلامی زندگی کے ہر شعبہ میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی وہاں انھوں نے خاص طور سے علم تفسیر جیسے اہم موضوع پر بھی اپنی صلاحیت اور علمیت کا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے قبل علماء کی وقیع تفاسیر موجود ہونے کے باوجود ان کے بعد کے علماء نے جب بھی ہندوستان کی اُردو تفاسیر و ترجمہ قرآن کی تاریخ کا ذکر کیا مولانا اشرف علیؒ کی اس تفسیری خدمت کو نظرانداز نہ کرسکے اور فراخدلی کے ساتھ ان کے اس کارنامہ کا ذکر کیا جیسا کہ اُردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بھی مولانا تھانویؒ کے ترجمہ و تفسیر قرآن کا ذکر موجود ہے۔

> "اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ (۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) یہ ترجمہ و مختصر تفسیر بھی اپنے مواد و بیان کے لحاظ سے بہت پسند کی جاتی ہے[1]۔"

Urdu in Syclopeadia of Islam Under the Auspices of the University of the Punjab Lahore

---

[1] جلد ۴، بار اول اکتوبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۵۳۴، اُردو تفاسیر دائرۃ المعارف الاسلامیہ

اس کے علاوہ اکثر مترجمین اور مفسرین نے مولانا کی بیان القرآن کی مدد سے اپنے ترجمے و تفسیر کی تکمیل میں مدد لی ہے جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے جو ان کے خلیفہ بھی تھے انھوں نے "معارف القرآن" کے نام سے ترجمہ قرآن و تفسیر کا کام کیا جس میں مولانا تھانویؒ کے اندازِ بیان اور طریقۂ کار کا عکس کافی حد تک نمایاں ہے۔ اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر ماجدی کے ترجمہ میں بھی مولانا تھانویؒ سے استفادہ کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد صاحب بھی ان کے خلفاء میں سے تھے۔

ہندوستان کے بہت سے مستند تراجم و تفاسیر مثلاً ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ و ترجمہ موضح القرآن شاہ عبدالقادر صاحبؒ، تفسیر حقانی یا تفسیر فتح المنان مولوی عبدالحق صاحبؒ وغیرہ کے تراجم و تفاسیر کے ساتھ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اس اُردو ترجمہ کا ذکر ضرور آتا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے تفسیر بیان القرآن اُردو تفاسیر و تراجم میں ایک مختصر اور جامع مدلل تفسیر ہے۔ اس میں مختلف زاویۂ نگاہ سے خواہ وہ لغوی ہوں یا نحوی فقہی ہو یا کلامی ہو، مناسب انداز سے بحث کرکے مطمئن کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی دیگر تصانیف کے علاوہ تفسیر بیان القرآن ان کے کارناموں کا شاہکار ہے جس کا صحیح اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس نے تفسیر کے حاشیوں اور حوالوں کا گہری غور و فکر کے ساتھ تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہو۔ ان کا یہ علمی کارنامہ دراصل پورے اعتماد اور اطمینان کا حامل ہے۔ انھوں نے قرآن کے مشکل مقامات کی تصریح اور تشریح میں اپنی علمی کوششوں کے علاوہ شرحِ صدر و قلب اطمینان کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ اسی لیے انھوں نے تفسیر مکمل لکھنے کے بعد مقدمہ میں پہلی جلد کے یہ ظاہر کردیا ہے کہ پورے قرآن کے ترجمے و تفسیر میں دو تین مقامات ایسے آئے ہیں جن کی تفسیر میں ان کو پورے طور پر شرحِ صدر نہ ہو سکا ہے لہٰذا اس کی وضاحت و تشریح اگر کوئی دوسرا کرسکے تو ضرور کرے تاکہ دوسروں کو خواص ہوں یا عوام زیادہ نفع حاصل ہو سکے۔

مولانا تھانویؒ کی یہ خوبی ان کے ایک عظیم مصنف اور بہترین مفسر ہونے کی

دلیل ہے کہ وہ اپنی وسیع علمی تحقیقات کے باوجود وسعتِ نظر سے کام لیتے ہوئے دوسروں کے لیے موقع اور گنجائش کو بہتر سمجھتے ہیں اور اپنے کیے ہوئے علمی کام کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

(ترجمہ) ایسے لوگ جو خرچ کرتے ہیں فراغت پر اور تنگی میں اور غصہ کو ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے درگذر کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے

تفسیر بیان القرآن مولانا تھانویؒ
سورہ آل عمران، جلد ۲، صفحہ ۵۸

تفسیر بیان القرآن کا مقام اردو تفسیروں کے درمیان

علوم قرآن مختلف فنون، لغت، بلاغت، اعراب، فقہ، کلام، حدیث، تصوف پر مشتمل ہے۔ قرآن کے بارے میں مکمل واقفیت کے لیے ان علوم کی واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ اگر کوئی مفسّر لغت یا بلاغت سے واقف نہیں ہے تو اس کی تفسیر قرآن کی صحیح ترجمانی کے مقام سے الگ سمجھی جائے گی۔ قرآنی علوم کو سمجھنے کے لیے عقل و نقل دونوں پر مکمل عبور ہونا چاہیے۔ جس مفسر کی صلاحیت عقل و نقل کے باب میں جس قدر وسیع و عمیق ہوگی، اُس کی تفسیر اُسی قدر وسیع اور عمیق ہوگی۔

اگر اسلامی علوم و فنون کی روشنی میں حضرت تھانویؒ کی تفسیر "بیان القرآن" کو دیکھا جائے تو ان کی تفسیر فن لغت، بلاغت، اعراب، فقہ، کلام، حدیث اور تصوف کے مسائل کی جامع نظر آتی ہے۔ وہ ہر جگہ التزام کے ساتھ حاشیہ کی عربی و اُردو لغت میں علم لغت قران، بلاغت قران، حدیث قرآن، تصوف قران، فقہ کلام اور ہر جلد کے اخیر میں علم اعراب قران سے بحث کرتے ہیں، اور قران کی فقہی خصوصیات، کلامی آیات اور بلاغتی خصوصیات کی وضاحت کرتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ جس طرز پر ہر باب کے لیے عنوان لگا کر لغت قران، الملحقات الترجمہ، مسائل السلوک، البلاغۃ، الروایات، الفقہ، الکلام، وجوہ المثانی کے ذیل میں لکھتے ہیں۔ اگر متوسط طبقہ کو سامنے رکھ کر لکھنے کے بجائے منتہی کے لیے لکھتے تو وہ عالم اسلام کی بے مثال تفسیر ہوتی۔ مگر ان کے پیش نظر چونکہ درمیانی درجہ کے علماء اور پڑھے لکھے لوگ تھے اس لیے اس ذہن کے مطابق ان تمام علوم و فنون پر قرانی آیات کی تفسیر میں بحث کرتے ہیں۔ مگر

اس کے باوجود انھوں نے متوسط طبقہ کے لیے لکھا ہے۔ علما بھی اس کے اشارات وعلمی مباحث سے یکساں مستفید ہوتے ہیں۔ اور شاید بیان القرآن کی یہی وہ خصوصیات تھیں جنھیں دیکھ کر علامہ عصر انور شاہ کشمیریؒ نے کہا تھا:

"میں سمجھتا تھا کہ یہ تفسیر عوام کے لیے لکھی گئی ہے، لیکن اس سے تو علما بھی استفادہ کرسکتے ہیں[1]"

تصوف

حضرت تھانویؒ کے بیان القرآن کی ابتدا ہی میں نگاہ حاشیہ کی عربی عبارت کے عنوان "مسائل السلوک" پر جاتی ہے۔ انھوں نے بیان القرآن میں مسائل السلوک کے بیان کا جس طرح التزام کیا ہے اور جس طرح کاوش کی ہے، اس سے ان کی عظمت وجلالت اور تبحر فی الکلام کا اندازہ ہوتا ہے۔ عصرِ حاضر میں یا ان سے قبل جو تفسیریں اُردو میں لکھی گئی تھیں ان میں مسائل السلوک کے استدلال واستخراج اور التزام نہیں تھا۔ بلکہ اس دور میں بعض لوگوں کی طرف سے تصوف کی شدید ترین مخالفت ہو رہی تھی اور اس کو بالکل غیر اسلامی قرار دیا جا رہا تھا۔ ایسے وقت میں انھوں نے اپنی تفسیر میں مسائل تصوف کے استخراج کا التزام کیا، اور اپنی تفسیر کے حاشیہ کی عربی اور اُردو عبارت میں ان کو بیان کیا۔ ایسا التزام اُردو تفاسیر میں نہ ان سے قبل تھا اور نہ ان کے عصر میں تھا۔ البتہ اُن سے قبل کی عربی تفسیروں میں مسائل تصوف کے استخراج و بیان کا التزام ملتا ہے، بلکہ بعض تفسیروں میں تو صرف مسائلِ تصوف کے استخراج پر زور دیا گیا ہے، جیسا کہ شیخ اکبر کی تفسیر میں ملتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے تفسیر میں تمام تر تاویلی انداز اختیار کیا ہے اور ہر لفظ کی تفسیر ظاہر وباطن کے نظریہ سے کی ہے۔ لیکن شیخ اکبر تصوف میں جس مسلک ومشرب کے قائل تھے، حضرت تھانویؒ اس کے قائل نہ تھے اور نہ ان کا وہ مشرب تھا۔ اس لیے ان کی

[1] گذارشِ احوالِ واقعی از قلم ناشر ملحقہ تفسیر بیان القرآن

تفسیر کے سلوکی مسائل تمام تر ان کے لیے مقبول نہ تھے، البتہ روح المعانی میں علامہ خیر الدین آلوسی نے تصوف کے مسائل کے بیان کا بھی التزام کیا تھا اور اپنی تفسیر میں مسائل سلوک کو باب الاشارہ والتاویل کے عنوان سے جگہ جگہ بیان کیا تھا، اس لیے ان کی یہ تفسیر جس طرح حضرت تھانوی رح کے لیے دوسرے مسائل کے بیان میں مددگار تھی، تصوف کے مسائل میں بھی معین تھی۔ چنانچہ وہ تصوف کے مسایل کے استنباط میں روح المعانی سے مدد لیتے ہیں اور مسائل السلوک کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"وقد جعلت تفسير روح المعاني في هذا المقصد اصلاً اصيلاً[1]"

مسائل سلوک کو حضرت تھانویؒ نے اپنی تفسیر میں جگہ دے کر اپنے عصر کی اس عظیم فکری بے راہ روی کی پیش بندی کی ہے جس کا غلغلہ ان کے دور میں عرب وعجم میں تمام تر پھیلا ہوا تھا اور علمائے عصر تصوف کو غیر اسلامی طریقہ خیال کرنے لگے تھے، جو ان کی اپنی کم علمی کی بنیاد پر مبنی تھا۔ اس لیے اس کی شدید ترین ضرورت تھی کہ اسلامی تصوف کے مآخذ کی نشان دہی کی جائے اور لوگوں کو اس طریقہ سے غفلت سے بچا کر ان کی اخلاقی وروحانی تربیت کی جائے۔

تصوف میں ظاہرا بہت سے غلط امور داخل ہو گئے تھے، بلکہ بعض غیر اسلامی طریقے بطور عبادت رائج ہو گئے تھے، اس لیے تصوف کے اصلی سرچشمہ سے استنباط کے وقت اس کا بھی لحاظ ضروری تھا کہ باہر سے کوئی چیز درآمد نہ ہو، اور خواہ مخواہ تاویل کے ذریعہ ان کو قرآن کے موافق بنا کر اسلامی نہ قرار دیا جائے۔ اس لیے حضرت تھانویؒ نے تصوف کے مسائل بیان کرتے وقت ان غیر اسلامی نظریات کی تردید کی ہے جو تصوف میں داخل ہو گئے تھے، مثلاً حلول کا نظریہ، یا وحدۃ الوجود کا نظریہ، یا اسی طرح کے دوسرے طریق ہائے تعبد جو تصوف کے طریقوں میں رائج ہو گئے تھے۔ چنانچہ سورہ مائدہ کی آیت "یاایھا الذین آمنوا

[1] بیان القرآن جلد ۳ صفحہ ۵۵

لا تحرموا طیبٰت ما احل اللہ لکم" کے ذیل میں حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"قولہ تعالیٰ: یا ایھا الذین امنوا الخ اس میں رسم ترک حیوانات کا ابطال ہے، جو بعض مدعیانِ طریقت کا طریق ہے۔"[1]

اسی طرح آیت لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیحُ ابن مریم" کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"اس میں بطلان حلول واتحاد پر جس کے قائل جاہل صوفی ہیں، دلالت ہے۔"[2]

اسی طرح توسل بالصالحین پر جن لوگوں نے آیت "وابتغوا الیہ الوسیلۃ" سے استدلال کیا ہے اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"وسل بمعنی تقرب ہے جس کا ذریعہ طاعات کا کرنا اور معاصی کا چھوڑنا ہے اور توسل بالصالحین کے مسئلہ کو اس آیت سے کوئی مس نہیں۔"[3]

اس طرح حضرت تھانویؒ نے قرآن مجید کے خالص روحانی واخلاقی پہلو کو اجاگر کیا ہے جس کے ذریعہ بندہ قرب خداوندی کے مدارج طے کرتا ہے اور اپنے کو اعلیٰ اخلاق واوصاف کا نمونہ بناکر خدائی منشار ومقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ حضرت تھانویؒ نے تقریباً سولہ سترہ سو مسایل قرآن سے اخذ کیے ہیں۔ جسے حاشیہ پر "مسائل السلوک فی کلام ملک الملوک" کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنے ایک رسالہ "التکشف" میں ۲۳۰ حدیثوں سے نوسو اصول سلوک ظاہر کیا ہے۔ اسی طرح اپنے ایک اور رسالہ "التعریف فی معرفۃ احادیث" میں بھی کچھ کمزور حدیثوں سے چند سودینی باتوں کو ظاہر کیا ہے۔

اللغات والبلاغۃ

مسائل السلوک کے بعد تفسیر "بیان القرآن" کی عظمت کو اُردو تفاسیر کے درمیان جو چیز

---

[1] بیان القرآن، ج ۳، صفحہ ۵۵

[2] ایضاً ، ج ۳ صفحہ ۴۹

[3] ایضاً ، ج ۳ صفحہ ۲۷

ممتاز کرتی ہے۔ وہ بیان القرآن کے اندر، لغت وبلاغت کی تحقیقات کا التزام ہے۔ قرآن مجید عربی زبان میں بلاغت کا اعجاز ہے۔ نہ ایسا کلام کسی کے بس میں ہے کہ بول سکے، اور لکھ سکے۔ اس لیے اس کی کسی دوسری زبان کے اندر ترجمانی کرنے کے لیے بھی اس کے اعجاز بلاغت کا علم ضروری ہے۔ جس کے لیے عربی زبان کے قرآنی لغات کا صحیح علم ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ نے اپنی تفسیر کے اندر ترجمانی کرتے ہوئے جن نکتوں کا لحاظ رکھا ہے اس کی توضیح قرآنی لغات کی تشریح سے کی ہے۔ جس سے بیان القرآن کے ترجمہ کا پڑھنے والا بصیرت کے ساتھ خدائی کلام کا اُردو ترجمہ صحیح ترین بنیادوں پر سمجھتا ہے۔ اور اس التزام سے حضرت تھانویؒ نے قرآن کے معنوی تحریف کی پیش بندی کی ہے۔ ان سے پہلے جن لوگوں نے اُردو ترجمے کیے تھے اُن میں سے بعض مثلاً سرسید، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کے قرآن کے ترجمہ میں غلطیاں ملتی ہیں، جن پر ان کے ہم عصروں اور بعد کے لوگوں نے تنقید کی ہے۔ جیساکہ خود حضرت تھانویؒ نے ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ کے غلطیوں کی نشاندہی ایک رسالہ لکھ کر کی ہے جو "اصلاح ترجمۂ دہلویہ" کے نام سے مطبع نظامی کانپور سے ۱۹۱۱ء میں چھپا تھا۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ نے ان غلطیوں سے اپنی تفسیر "بیان القرآن" کو بچانے اور تحریف قرآنی سے اپنے آپ کو الگ رکھتے ہوئے، اپنا ترجمہ کیا ہے، اور اپنے ترجمہ کے دلائل حاشیہ کی عربی عبارت میں اللغات البلاغۃ اور ملحقات الترجمہ کے ذریعہ تشریح کرکے درج کی ہے اور جہاں کہیں مشکل لغت آئی ہے، اپنے ترجمہ کی بنیاد سلف سے پیش کردی ہے، اس طرح صاف طور پر بصیرت رکھنے والا محسوس کرتا ہے کہ ان کے پیشروؤں نے جو غلطیاں کی ہیں ان سے ان کا دامن پاک ہے اور ان کے ترجمہ کے پیچھے سلف صالحین کی لغاتی اور بلاغتی اور تفسیری تحقیقات کی دلائل ہیں۔ پچھلے باب میں ہم نے تفسیر "بیان القرآن" کے اُردو ترجمہ کی خصوصیات (چند دیگر تراجم کے پس منظر میں) کے عنوان سے تفسیر بیان القرآن کے ترجمہ کی خصوصیات سے بحث کرچکے ہیں۔ اس سے ان کے ترجمہ کی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے۔

ہندوستانی مفسرین قرآن کے بلاغتی امور سے بحث نہیں کرتے ہیں جس کی وجہ ایک تو یہ ہوتی ہے کہ وہ خود قرآن کے بلاغتی اعجاز پر عبور نہیں رکھتے۔ دوسرا اپنے قارئین کو سامنے رکھ کر

toobaa-elibrary.blogspot.com

رکھ کر تفسیر لکھتے ہیں۔ اور یہ لوگ عموماً ایسے ہوتے ہیں جو عربی زبان کے قواعد سے واقف نہیں ہوتے جس سے عام طور پر غلط فہمی یہ ہوگئی تھی کہ اعتقاد کی حد تک تو قرآن کو اپنے معانی و بیان کے اعتبار سے معجزہ سمجھا جاتا تھا لیکن فکر و عقل سے علمی طور پر اس کا ایقان نہ ہوتا تھا چنانچہ ایسا ہی کچھ ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے، سر سید احمد خاں کی تفسیر و ترجمہ، مولانا احمد رضا خاں کے ترجمے، بلکہ قرآن کے دوسرے ترجموں مثلاً مولانا شاہ رفیع الدینؒ صاحب کے ترجمے، مولانا شیخ الہندؒ کے ترجمے، مولانا شاہ مراد اللہ انصاری، سید امیر علی، مولانا فتح محمد جالندھری، مولانا ابو الکلام آزاد وغیرہ کے ترجمے سے محسوس ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ترجمہ کی فنی غلطیاں شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمے تک میں ملتی ہیں جیسا کہ خود حضرت تھانویؒ نے تفسیر کے مقدمہ میں اپنے ترجمہ کو قابلِ فہم، آسان اور تحت اللفظ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے حاشیے میں لکھا ہے کہ:

"تحت لفظی کی بھی رعایت ہے۔ لکن التزاماً للترادف مرۃ واخذاً بالحاصل اخری، ولقد جرأنی علیہ صنیع شیخ مشائخنا المسلم عند احقافنا الشاہ عبد القادر الدھلوی رحمہ اللہ واخولہ امثلہ من ترجمۃ قولہ تعالیٰ ما انزل الیک ترجمتہ "جو کچھ اترا" فعبر عن المجھول المتعدی بالمعروف الازم۔ قولہ تعالیٰ "اولٰئک علیٰ ھدًی من ربھم" ترجمتہ "انھوں نے پائی راہ اپنے رب کی" فعبر عن الخبر الاسمی بالفعلی ثم مادۃ الوجدان غیر مذکورۃ فی القرآن ثم لم یقع ھدًی مضافاً الی الرب فی القرآن۔ فی القرآن۔ قولہ تعالیٰ "ھُمُ المفلحون" ترجمتہ "مراد کو پہنچے" فعبر عن اسم الفاعل بالماضی، قولہ تعالیٰ "انما نحنُ مصلحون"۔ ترجمتہ "ہمارا کام تو سنوارنا ہے" فعبر بما تعریبہ انما شاننا الاصلاح وکم من بون بینھما وامثلہ ذٰلک کثیر فی ترجمتہ رحمہ اللہ لمن فتحھا۔"

(تفسیر بیان القرآن اول ص ب)

ان سے پیشرو مترجمین کے ان ترجموں سے قرآن کا اعجاز بالکل سامنے نہیں آتا ہے۔ اگر اس کی وجہ تلاش کی جائے تو مختلف وجوہ سامنے آئیں گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ جب کیا جاتا ہے تو عربی زبان کی تمام تر گہرائیاں اور بلاغتیں اردو کے قالب میں نہیں سما سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ حقیقت یہ تھی کہ قرآن کو خود خدا نے اعجاز و بلاغت کا نمونہ بنا کر بنایا تھا۔ اس لیے اگر کسی اور زبان میں اس کا ترجمہ بھی اسی شان و بلاغت کا نمونہ ہوتا تو ایک دوسری انسانی تخلیق اس کے مماثل ہو جاتی۔ جو انسان کی قدرت سے باہر تھا۔ اس لیے اس کی ضروری تھی کہ ترجمہ کے اندر اگر قرآن کا اعجاز نہیں سما رہا ہے تو الگ سے اپنی عقل و فکر کی بدولت اس اعجاز کی طرف قاری قرآن کو متوجہ کیا جائے اور قرآن کے اعجازی خصوصیات و کمالات کو ظاہر کیا جائے گا۔ اگر اس نگاہ اور اس پہلو سے ہم تفسیر بیان القرآن کو دیکھتے ہیں تو اردو تفاسیر کے اندر اس کی حیثیت ایک مثالی اور انقلابی تفسیر کی ہو جاتی ہے۔ اگرچہ مولانا ابو الکلام آزاد نے نے اپنے مقدمہ ترجمان القرآن میں قرآن کے اعجازی امور کی طرف توجہ دلائی تھی مگر وہ بھی قرآن کے اعجاز کو اپنی تفسیر کے اندر ظاہر نہ کر سکے تھے اور یہ حضرت تھانویؒ کا کمال ہے کہ وہ اختصار کو مدِنظر رکھتے ہوئے حاشیہ کی عربی عبارت میں "البلاغۃ" کا عنوان لگا کر ہر جگہ قرآن کے بلاغتی اوصاف و کمالات کی نشان دہی کرتے ہیں، لیکن یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ انھوں نے قرآنی بلاغت کو خالص فنی طریقہ پر پیش کیا ہے اور یہ انہی لوگوں کے لیے مفید ہے جو عربی زبان کے بلاغتی فن اور اس کے رموز و اشارات اور اصطلاحات کو سمجھتے ہوں۔

مولانا تھانویؒ عظیم عربی ادیب علامہ زمخشری کی تفسیر "کشاف" اور علامہ خیر الدین آلوسی کی تفسیر "روح المعانی" کے ذریعہ قرآن کے ادبی عظمت سے واقف تھے، اس لیے وہ حاشیہ کے اندر "البلاغۃ" کے عنوان کے تحت انہی دونوں تفسیروں کی عبارتیں نقل کرتے ہیں۔ جس سے وہ اردو داں طبقہ جو عربی زبان کو سمجھتا ہے، قرآن کی ادبی عظمت سے کسی قدر آگاہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی کہ حضرت تھانویؒ نے اس موضوع

پر لکھا ہے۔ اگر کسی قدر اور تفصیل سے کام لیتے اور اسی طرح عنوان لگاکر قران کی بلاغت کی مزید توضیح کر دیتے تو ہندوستانی علمار کے لیے قرآنی اعجاز کی واقفیت آسان ہو جاتی، وہ اردو ترجمہ بھی پڑھتے، تفسیر بھی پڑھتے اور مزید تفکر وتدبر سے کام لے کران کے بلاغتی امور کو بھی سمجھتے۔

اعراب القرآن

ابتدائی اسلام میں قرآن کی تلاوت مختلف لہجوں اور عرب کے مقامی لوگوں کی زبانوں میں ہوتی تھی۔ پھر قریش کے زبان ولہجہ میں اس کو محصور کر دیا گیا اور دوسرے لہجوں کو منسوخ کر دیا گیا مگر اس میں بھی تلفظ اور بعض الفاظ کی ادائیگی اور اعراب میں کچھ اختلاف رہا جو بعد میں چل کر سات قرار قرآن کی زبانوں میں محصور ہو گیا اور ان ہی کی قرارتیں موجودہ قرآن کے تلفظ واعراب کی بنیاد ہیں۔ قرار سبعہ (۱) نافع مدنی (۲) ابن کثیر مکی (۳) ابوعمر البصری (۴) ابن عامر الشامی (۵) عاصم الکوفی (۶) حمزہ الکوفی (۷) اور کسائی الکوفی۔ ان تمام لوگوں کی قرارتوں کا احاطہ حضرت تھانویؒ نے کیا ہے۔ وہ اولاً لفظ قرآن کو نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد قرار سبعہ میں سے جس کا قول اس کے تلفظ ولہجہ وغیرہ کے باب میں ہوتا ہے اس کو نقل کرتے ہیں اور عام طور پر انھوں نے اس باب میں بھی علامہ آلوسی کی "روح المعانی" کے نقول پر اعتماد کیا ہے۔ اس کے علاوہ قرارت سبعہ کے سلسلے میں لکھی گئی کتابوں سے نقل کرتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے اس طرح جو کارنامہ قرأتوں کے بیان میں انجام دیا ہے اس سے علم القرار والاعراب اور علم التفسیر کے مابین مزعومہ دوری ختم ہو جاتی ہے۔ اُن کے اس طرز کے بالمقابل اُردو تفسیروں میں اگر علم القرارۃ والاعراب کو تلاش کیا جائے تو نگاہ تھک کر مایوس واپس آجاتی ہے حالانکہ علم التفسیر کا ایک اہم باب علم الاعراب والقراۃ ہے۔ اس کے علم سے قرآن کے اندر مابین القرأت دقیق نکتوں کا علم ہوتا ہے اور بہت سے حقائق سے پردے اُٹھتے ہیں۔

مولانا تھانویؒ کے چند شاگرد

مدرسہ فیض عام کانپور کے چودہ سالہ قیام کے زمانہ میں صدہا شاگردوں نے جو دور اور قریب کے مختلف علاقوں کے رہنے والے تھے آپ سے علوم حاصل کیے۔ ان میں سے بعض تکمیل تعلیم کے بعد جامع معقولات ومنقولات ہوئے اور کثیر تعداد ان طلبہ کی تھی جنھوں نے سند حدیث حاصل کی۔ یہاں مختصراً دس شاگردوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو بقول خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب "تلک عشرۃ کاملۃ"[1] کے مصداق تھے اور ان چند ہی کے ذکر سے احساس ہوتا ہے جس کے شاگرد ایسے ذی استعداد اور صاحب کمال ہوئے ان کے استاد کی علمیت وقابلیت میں کیا اشکال ہو سکتا ہے۔ مولانا تھانویؒ کے شاگردوں کو اپنے عظیم استاد کی شاگردی کا شرف حاصل تھا جس کی بنا پر ان کو وہ مقام حاصل ہوا کہ یہ حضرات اپنے وقت کے بڑے علمار میں شمار ہوئے۔ مولانا تھانویؒ علم وعمل کا ایسا بحر ذخار تھے جو علم کی عظمت اور اہمیت کو قرآن وسنت کی روشنی میں سمجھتے اور سمجھاتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ آخری عمر تک درس وتدریس میں اس طرح صرف کیا کہ اطلب العلم من المھد الی اللحد[2] حدیث شریف کا عملی نمونہ بن کر ثابت ہوئے۔

ان کی نظر میں علم وعمل کی فضیلت اس قدر واضح تھی کہ حصول علم میں عمر اور وقت کی کوئی قید نہیں۔ بچے کا پہلا مکتب ماں کی گود ہوتی اور پھر مدرسہ ومکتب کا آغاز استاد کی تربیت وشفقت کے زیر سایہ ہوتا ہے، اسی لیے اساتذہ روحانی والدین کا درجہ رکھتے ہیں۔ مولانا وہ روحانی معلّم تھے جن کے فیض تربیت سے کثیر تعداد میں طلبا مستفید ہوئے۔ ان کا طریقۂ تعلیم اس قدر آسان تھا کہ مشکل سے مشکل سبق ذہن نشین ہو جائے اور علمی استعداد حاصل ہو جائے۔ وہ اپنے شاگردوں کو عموماً تین ہدایتیں کرتے تھے۔ اوّل جو مضمون پڑھتا ہو اس کا مطالعہ کیا جائے، پھر دوسرے استاد سے سمجھا جائے، تیسرے پھر اس کا مطلب خود پیش کرے۔ اس کے بعد ان کو یقین تھا کہ شاگرد ذی استعداد ہوں گے۔ اس طرح مولانا کو ایک عظیم مصلح اور معلّم کا مقام حاصل تھا۔

---

[1] اشرف السوانح، حصہ اول، صفحہ ۱۰۲ [2] ترجمہ۔ علم طلب کرو ماں کی گود سے قبر تک

(۱) مولوی محمد اسحاق صاحب

یہ بہت ذہین، خوش فہم با اخلاق عالموں میں سے تھے۔ کلکتہ کے مشہور مدرسہ "عالیہ" میں مدرس رہے۔ آخر میں ریٹائر ہوکر ڈھاکہ چلے گئے۔ طریقِ باطن میں اس درجہ کمال حاصل کرلیا تھا کہ حضرت تھانوی رح کے خلیفہ مجاز بھی ہوئے۔

(۲) مولوی محمد رشید صاحب رح

ان کو علم فقہ اور افتار کے کام میں خاص مناسبت اور مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے مولانا اسحاق کی جگہ مدرسہ عالیہ میں اچھے مشاہرہ پر مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ لیکن زندگی نے زیادہ عرصہ وفا نہیں کی مرض فالج میں مبتلا ہوکر انتقال ہوگیا۔

(۳) مولوی احمد علی صاحب رح فتح پوری

آپ بہت ہی متنوع بزرگانہ خوبیوں کے مالک تھے۔ مولانا گنگوہی رح نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔ بہشتی زیور کے ابتدائی پانچ حصے حکیم الامت نے اپنی نگرانی میں تحریر کروائے لیکن بہشتی زیور کی تکمیل سے قبل ان کا انتقال ہوگیا۔

(۴) مولوی صادق الیقین صاحب کرسوی

یہ بہت متقی پرہیز گار عالم ہوئے۔ مولانا تھانوی رح کے خاص شاگرد ہونے کے ساتھ ہی مولانا گنگوہی رح کے خلیفہ مجاز بھی تھے۔ بدعات و رسومات سے اس درجہ متنفر تھے کہ اپنے والد سے میلاد شریف کے مسئلہ میں مخالفت کی اور مجاہدہ کا یہ عالم تھا کہ نیند اور بھوک بہت ہی کم کردی تھی۔ حضرت تھانوی رح بھی اس شدید مجاہدہ کو منع فرماتے تھے، لیکن شوق غالب رہا اور جوانی ہی میں محبوبِ حقیقی سے جا ملے۔

(۵) مولوی فضل حق صاحب رح

مولانا تھانوی رح کے شاگردوں میں سب سے پہلے فارغ التحصیل[1] ہوئے۔ قنوج میں مدرس ہوئے اور وہیں وفات پائی۔

(۶) مولوی شاہ لطف رسول صاحب

یہ انتہائی ذہین ذی استعداد عالم اور ذاکر و شاغل درویش تھے۔ خط کے ذریعہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رح سے بیعت ہوئے۔

(۷) حکیم محمد مصطفےٰ صاحب بجنوری

آپ کو عربی زبان کی مہارت خاص تھی۔ حکیم الامت کے مواعظ کو قلم برداشتہ عربی میں ضبط کر لیتے بعد میں اردو ترجمہ کر کے مولانا تھانوی رح کو دکھاتے۔ وہ بغیر تعریف کیے نہ رہتے۔ ان کا ذکر خلفار کی فہرست میں خاص طور سے آیا ہے کیوں کہ یہ حضرت کے خلیفہ خاص بنے۔

(۸) مولوی سید اسحاق علی صاحب کانپوری

یہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ بہت نیک سلیم الفطرۃ انسان تھے۔ بعد میں مولانا کے خلیفہ بھی ہوئے۔

(۹) مولوی مظہر الحق صاحب

ان کو فارسی زبان پر خاص قدرت حاصل تھی۔ بنگال کے علاقہ کے لوگ بہت عزت

---

[1] اشرف السوانح صفحہ ۵۵ باب نہم حصہ اوّل

کی نظر سے دیکھتے تھے اور مانتے تھے۔ حضرت کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتا تھا۔

(۱۰) مولوی سید احمد صاحب اٹاوی

مولانا کے یہ ذہین شاگرد گوالیار میں جج کے عہدے پر فائز ہوئے۔ خاندانی رئیس تھے۔ صاحبِ دولت اور بڑے منصب پر فائز ہونے کے باوجود دین کی خدمت کرتے رہے۔

خلفائے خاص

مولانا اشرف علی رحمہ کے خلفاء کی تعداد کثیر ہے۔ لیکن چند مشہور خلفاء کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمہ

آپ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم علی گڑھ میں ایم۔ اے، او کالج میں حاصل کی۔ سات سال ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر کام کیا۔ پھر لکھنؤ میں انسپکٹر آف اسکولز ہو گئے۔ دنیا کی ان ترقیات کی منازل طے کرنے کے ساتھ ہی خواجہ صاحب کی زندگی میں دینی اعتبار سے زبردست تبدیلی ہوئی۔ ۱۳۲۶ھ میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ سے ملاقات کے بعد یہ انقلاب آیا۔ بہت اشتیاق کے ساتھ ڈھائی میل کی مسافت سخت دھوپ میں طے کر کے ملنے کے لیے آئے۔ اور ملاقات پر کس قدر عشقِ صادق کا جذبہ ملتا ہے بہت تفصیل سے خود انھوں نے اشرف سوانح میں اس کا ذکر کیا ہے۔

یہ شاعری کے ذوق کے مالک تھے۔ ان کا ایک چھوٹا سا مجموعۂ کلام بھی مفتی رضا صاحب انصاری

ـــــــــــــــ

لہ بزم اشرف کے چراغ صفحہ ۲۴

(استاد شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے مرتب کر کے شائع کرایا ہے۔ لیکن مولاناؒ کی زندگی میں عزیز الحسن صاحب نے خود کو ایسا بدلا کہ مناسبت شعری تک کو ختم کر دیا اور مرشد کی نظرِ فیض اثر سے سالک بنے ہوئے تھے۔ لہ

ایک مرتبہ مولانا تھانوی رحمہ نے صرف اس اشارہ پر کہ اگر میری تربیت سے فائدہ نہ محسوس ہو تو کسی اور سے رجوع کر لیں۔ یہ سن کر خواجہ صاحب کی چیخیں نکل گئیں اور بے ہوش ہو کر گر گئے۔ ہوش آیا تو روتے رہے۔ یہ تو ان کے مرشد سے ایک قلبی تعلق کی مثال ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک اہم اور علمی کارنامہ حضرت تھانوی رحمہ کے لیے اشرف السوانح کے نام سے چار حصوں میں تصنیف ہے جو مولانا اشرف علی تھانویؒ کی سوانح حیات پر پہلی اور اہم کتاب ہے جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ تمام اہلِ علم مولانا رحمہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے اس کو بنیادی ماخذ خیال کرتے ہیں۔ غرض ان کی زندگی کے آخری لمحات خانقاہ تھانہ بھون میں گزرے۔ مولانا رحمہ کی وفات کا ان پر شدید اثر ہوا کہ ایک سال بعد تھانہ بھون میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

(۲) مولانا سید سلیمان ندوی

ان کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ ہندوستان کے عظیم المرتبت مورخین اسلام میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو پٹنہ ضلع میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم ابوالحسن شیخ کامل عالم تھے۔ ان کے زیرِ سایہ ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر ندوۃ العلماء لکھنؤ میں علامہ شبلیؒ جیسے فاضل اور کامل ہستی کی صحبت میں رہے جس نے ان کی صلاحیتوں کو اور جلا دیا۔ اور ان کی بلند پایہ تصنیف سیرۃ النبی کی تکمیل کی۔ یہ پونا کالج میں لکچرر تھے۔ علاوہ درس و تدریس کے علمی بلند مضامین پر قلم اٹھایا۔ ایک کتاب "عمر خیام" تحریر کی جس کے لیے علامہ اقبال شاعرِ مشرق نے کہا کہ "عمر خیام" پر جو کچھ آپ نے لکھ دیا اس پر کوئی مشرقی یا مغربی عالم

ـــــــــــــــ

لہ حکیم الامت صفحہ ۴

toobaa-elibrary.blogspot.com

اضافہ ذکر سکے گا۔ اس طرح ان کی عظمت کا اور علمیت کا اعتراف کیا ہے کہ مولانا شبلیؒ کے بعد اب استادِ کل ہیں۔ علومِ اسلامیہ کے جوئے شیر کا فرہاد آج کل ہندوستان میں سوائے سلیمان ندوی رہ کے کون ہے۔

مولانا تھانوی رہ سے سید سلیمان ندوی رہ کا تعلق اس طرح قائم ہوا کہ مولانا تھانویؒ نے ایک مسئلہ کی تحقیق کی اور اس دور کے علمار کی تصدیق حاصل کی۔ ایک نسخہ ظفر صاحب عثمانی کے ذریعہ ان تک پہنچا۔ سید سلیمان ندوی سمجھے براہِ راست مولانا کی طرف سے آیا ہے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کر دیا اور یہ سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ سید سلیمان ندوی نے ملاقات کی اور حضرت کی علمیت اور مجموعی صفاتِ عالی سے متاثر ہو کر بیعت کی خواہش ظاہر کر دی۔ اگست ۱۹۳۸ء میں بیعت ہوئے اور ۱۹۴۲ء تک معرفت کی اتنی وادیاں طے کر لیں کہ حکیم الامت کے اعتبار کا مرکز بن گئے۔ مولانا تھانوی رہ نے انھیں ایک خط لکھا۔ استشارہ بعد از استخارہ آپ کو خلافت دینے کو دل چاہتا ہے۔ غرض ۱۹۴۲ء ۲۲ اکتوبر کو خلافت[1] دے کر فرمایا۔ میرا خاب مطمئن ہو گیا کہ میرے بعد آپ جیسے لوگ موجود ہیں اور خلاف عادت اپنے ذی علم خلیفہ کے کے بیے فارسی میں کچھ اشعار لکھے جس سے مولانا رہ کے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ نمونہ کے طور پر تین اشعار درج ہیں:

از سلیماں گیرا خلاصِ عمل — دان تو ندوی را منزہ از دخل
صد مبارکباد این اظہارِ حق — صد مبارکباد این اقرارِ حق
گرچہ ناظم نیستم ابیات را — نشر کردم لیک این جذبات را

اشرف علی[2]

اس کے ساتھ ہی سید سلیمان ندوی رہ کی بے پناہ عقیدت کا اندازہ مولانا رہ کی وفات پر انکے ان اشعار سے ہوتا ہے ؎

۱؎ بزم اشرف کے چراغ صفحہ ۸۰

۲؎ ؍ ؍ صفحہ ۸۱

داغ فراقِ یار مٹایا نہ جائے گا — اب دل کا یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
اے دل خموش صبر و رضا کا مقام ہے — نقش دوامِ فیض مٹایا نہ جائے گا
چاہا خدا نے تو تیری محفل کا ہر چراغ — یوں ہی جلا کرے گا بجھایا نہ جائے گا

رحلت شیخ کے عنوان سے انھوں نے یہ اشعار کہے[1]

شیخ کے بعد یہ خلیفہ خاص بھی اپنے علمی نقوش و تاثرات کو سب کے دلوں میں چھوڑ کر ۱۹۵۵ء میں دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

(۳) مفتی محمد شفیع صاحبؒ

مولانا تھانوی رہ کے یہ خلیفہ پاکستان میں عرصہ تک مقیم رہے۔ ۱۳۱۴ھ[2] میں دیوبند ضلع سہارن پور میں ان کی ولادت ہوئی اور یہیں کے عظیم ادارہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے دور کے مشہور اساتذہ علامہ انور شاہ کشمیری رہ، مولانا عزیز الرحمن صاحبؒ اور شبیر احمد عثمانیؒ جیسے علمائے ہند تھے۔ مفتی صاحب کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ مفتی شفیع صاحب کے والد مولانا تھانوی رہ کے ہم سبق رہے تھے۔ وہ مفتی صاحب کے لیے تعلیمی مشورے مولانا تھانوی رہ سے اکثر لیا کرتے تھے۔ ابتدا میں مفتی صاحب شیخ الہند مولانا محمود حسن سے بیعت ہوئے اور ان کی وفات کے بعد مولانا تھانوی رہ سے بیعت ہوئے۔

۱۳۳۶ھ میں شیخ الہند رہ جب مالٹا میں اسیر تھے اس وقت مفتی صاحبؒ نے مولانا تھانوی رہ سے بیعت ہونا چاہا تھا۔ لیکن انھوں نے کچھ معمولات تجویز کر دیے لیکن شیخ کی وفات کے بعد ان کی اس خواہشِ بیعت کو پورا کر دیا۔

مفتی صاحب کو تصوف سے خاص مناسبت تھی۔ مولانا تھانوی رہ نے ان کی اس مناسبت کی ہمت افزائی کی۔ ۱۳۴۹ھ میں مفتی صاحب کو خلافت بھی دیدی۔ مولانا تھانویؒ

۱؎ بزم اشرف کے چراغ صفحہ ۸۲

۲؎ ؍ ؍ صفحہ ۸

کو ان پر خاص اعتماد تھا۔ ان کی علمی استعداد کو مانتے ہوئے تصنیف و تالیف فتاویٰ وغیرہ کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کردیتے تھے۔

اپنی خاص تصنیف "الحیلۃ الناجزہ" کا کام اپنی نگرانی میں ان سے کروایا۔

مفتی صاحب مدظلہ کی طبیعت میں تواضع کا عنصر پایا جاتا ہے، لیکن کامل صحبتِ شیخ پر خدا کا شکر ادا کرتے۔ خود مفتی شفیع صاحب کی تفسیر معارف القرآن، اسلام کا نظام اراضی، آلات جدیدہ، اوزان شرعیہ، اسلامی معاشیات وغیرہ علم و فن کی دلیل ہیں۔ موصوف بحیثیت مفتی اعظم پاکستان میں افتاء کی خدمات انجام دیتے رہے۔ مفتی صاحب نے باوجود پیرانہ سالی کے زندگی کے آخری لمحات تک علمی خدمات کا دامن نہیں چھوڑا۔

(۴) ظفر احمد تھانویؒ

یہ حضرت تھانوی رح کے عزیز بھی ہوتے تھے، ایک ہی محلہ میں قیام تھا۔ ہمہ وقت کی قربت حاصل تھی۔ ۱۹۰۵ء میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے۔ تھانہ بھون میں ابتدائی تعلیم کے بعد ہردوئی، علی گڑھ، میرٹھ میں تعلیم کا کچھ عرصہ گذارا۔ بعد میں بمبئی میں چار سال کا میکنیکل ڈپلوما کیا۔ اور پورٹ ٹرسٹ کے شعبہ میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جو اس پوسٹ میں متعین ہوئے ورنہ ہمیشہ یورپ کے انجنیر انتخاب میں آتے تھے۔

ان کے کام سے خوش ہو کر ان کو لندن بھیجا گیا۔ ان تمام مصروفیات اور ترقیات کے باوجود تھانہ بھون آمد و رفت جاری رہی۔ ۱۹۴۲ء[1] میں حضرت تھانوی رح نے ان کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔ ۱۹۲۸ء میں ان کا نکاح بھی حضرت تھانوی رح نے خانقاہ تھانہ بھون میں پڑھایا۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد بیعت ہو گئے تھے۔ ان کو حضرت تھانوی رح کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے اسی بنا پر اپنے شیخ کے علم و عمل کا اعتراف ان الفا[ظ]

ل۔ بزمِ اشرف کے چراغ صفحہ ۲۹۰۔

میں کیا:

"اگر ترازو کے ایک پلڑے میں حضرت تھانوی کا علم رکھ دیا جائے اور ایک میں عمل تو انشاءاللہ دونوں برابر نکلیں گے۔"[1]

مولانا تھانوی رح کے عالم باعمل ہونے کی ایسی روشن دلیل ہے جس کو ان کے قریب رہنے والوں نے مشاہدہ کر کے صداقت سے اظہار کیا۔ یہ ان کی آخری لمحات زندگی تک ان ہی کے پاس موجود تھے۔

(۵) قاری محمد طیب صاحب

مولانا تھانوی رح کے خلفاء میں قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی شخصیت اور علمیت کے لیے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونِ ہند میں بھی چرچا ہے۔

ان کے دادا حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ عالمِ اسلام کے مشہور علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں ان کا نام آتا ہے۔ لہٰذا قاری طیب صاحب ذاتی اور خاندانی دونوں صفات کے لحاظ سے عزت و افتخار کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

۱۳۱۵ھ میں بمقام دیوبند پیدا ہوئے۔ نسبی طور سے صدیقی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کے عظیم الشان واحد ادارے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ حافظ اور قاری ہونے کے علاوہ فن ریاضی میں بھی کمال حاصل کیا۔ آپ فن حدیث کے بھی بڑے جید عالم ہیں۔ انور شاہ کشمیری رح اس فن میں آپ کے استاد رہے ہیں۔ قاری طیب صاحب اپنی علمی صلاحیتوں اور بزرگوں کی توجہ خاص کی وجہ سے بہت جلد دارالعلوم کے عظیم اساتذہ کی صف میں آگئے۔ ابتدا میں شیخ الہند مولانا محمود حسن رح سے بیعت ہوئے۔ بیعت ہونے کے پانچ ماہ بعد شیخ الہند رح کی وفات ہوگئی۔ پھر آپ مولانا اشرف تھانوی رح سے بیعت ہوئے۔ ۱۳۵۰ھ[2] میں حکیم الامت نے اپنے اس ہونہار مرید کو خلافت کا منصب عطا کیا۔

ل۔ بزمِ اشرف کے چراغ صفحہ ۲۸۶

۲۔ " " صفحہ ۶۵

۱۳۴۰ھ میں دارالعلوم کے مہتمم مقرر ہو گئے اور اہتمام کے منصب کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ اپنے سابقین سے بھی سبقت لے گئے۔

موصوف کو فنِ خطابت میں اس قدر کمال حاصل ہوا کہ مسلسل کئی گھنٹے علمی اور تحقیقی مضامین پر اس طرح خطاب کرتے کہ اسرارِ شریعت کے پردے اٹھتے چلے جاتے جس کی وجہ سے تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت مقبول ہوئے اور فنِ خطابت کا ان کا یہ کمال و اثر اپنے شیخ کے روحانی ورثہ کا ایک حصّہ ہے۔

منجملہ ان خصوصیات کے آپ ایک عظیم مصنّف بھی ہیں۔ آپ کے فیوض کا روحانی سلسلہ بھی وسیع پیمانہ پر جاری ہے۔ ان تمام خصوصیات کی بنا پر آپ اپنے شیخِ کامل مولانا تھانوی رہ کا جیتا جاگتا نمونہ نظر آتے ہیں۔

(۶) شاہ وصی اللہ صاحب

۱۳۱۴ھ میں فتح پور میں پیدا ہوئے۔ یہ حکیم الامّت کے خلیفہ خاص تھے۔ بہت خاموش طبیعت واقع ہوئے تھے۔ عبادات کا فطری طور پر ایک خاص ذوق تھا۔ طبیعت تنہائی پسند تھی۔ مولانا تھانوی رہ کے خصوصی تعلق اور توجہات کا مرکز تھے۔

ایک مرتبہ مولانا تھانوی رہ نے اپنی مجلس میں مفتی شفیع صاحب کے سامنے جو شاہ ولی اللہ کے ہم سبق تھے شاہ وصی اللہ کا ذکر اس محبت سے کیا کہ مفتی شفیع صاحب کو رشک آیا اور بے ساختہ یہ شعر پڑھنے لگے ؎

ماہ و مجنوں ہم سخن بودیم در دیوانِ عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

اس پر مولانا تھانوی نے بہت لطف سے برجستہ جواب دیا۔ "ہاں یہاں یہی دستور ہے کسی کو صحرا دیا جاتا ہے اور کسی کو شہر۔ ہر ایک کو جو کچھ عطا ہوا ہے اُسی پر راضی رہنا چاہیے۔" [1]

---

[1] بزمِ اشرف کے چراغ صفحہ ۵۸

شاہ صاحبؒ کی ذات اولیائے کرام کی طرح خلق کے لیے روحانیت کا مرکز بن گئی ان کے مریدین کی ایک بہت بڑی تعداد ہے۔

الٰہ آباد اور گورکھپور آپ کے خصوصی مرکز رہے۔ آپ کے اندازِ تربیت میں حکیم الامت کی جھلک ملتی تھی۔ کچھ کتابیں بھی اصلاح کے لیے لکھیں۔ "وصیۃ الاخلاق"، "وصیۃ الاخلاص" "توقیر العلماء" کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ زندگی کے آخری سال میں بغرضِ علاج بمبئی میں قیام رہا۔ مگر آپ کی روحانی قوت سے اس بیماری کے عالم میں بھی بمبئی کے بہت سے روٴسا رو امرار اللہ والے ہو گئے۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۶۶ء میں محمدی جہاز سے حجاز کے لیے سفر کیا۔ ۲۵ر نومبر ۱۹۶۶ء میں جہاز ہی میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ باوجود لوگوں کی خواہش کے تربت ناز مکہ مکرمہ میں نہ بن سکی۔ آپ کے جسدِ خاکی کو سمندر کی لہروں کی آغوش میں دے دیا گیا۔

(۷) مولانا مسیح اللہ خاں صاحب

۱۳۲۹ھ میں علی گڑھ میں پیدا ہوئے اور ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل عالم ہیں۔ ۱۳۵۰ھ میں حضرت تھانوی رہ نے خلافت سے سرفراز فرمایا۔ ان کا شمار ان خصوصی علماء میں ہوتا ہے جن کے طرزِ تعلیم پر مولانا تھانوی رہ کو اعتماد تھا جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری ایام علالت میں گیارہ خلفاء کے نام شائع کرائے ان میں مسیح اللہ صاحب کا نام بھی تھا۔ یہ وہ خلفاء تھے جن کی طرزِ تعلیم پر مولانا رہ کو پورا اعتماد تھا۔ مسیح اللہ صاحب مولانا تھانوی رہ کے اعتماد کی روشن دلیل ہیں۔ ان کی تعلیمی خدمات کا ذریعہ جلال آباد کا وہ دینی ادارہ ہے جہاں سینکڑوں طلباء علمِ دین حاصل کرنے کے لیے ہند اور بیرونِ ہند سے آتے ہیں۔ مرتّب نے خود بھی اس کا بچشمِ دید مشاہدہ کیا ہے۔

---

[1] بزمِ اشرف کے چراغ صفحہ ۳۵

ان کی مولانا تھانوی رہ سے محبت کا یہ عالم ہے کہ کوئی مجلس ایسی نہیں ہوتی تھی جس میں اپنے شیخ رہ کے ملفوظات اور ارشادات بیان نہ کرتے ہوں۔ ان کے وعظ میں بھی ان کے شیخ کا رنگ جھلکتا ہے۔ بہرحال مولانا اشرف علی رہ ایسے آفتاب علم وعمل تھے جن کی کرنوں کی چمک سے ہر ذرّہ بجائے خود ایک آفتاب بن گیا۔

(۸) حکیم محمد مصطفٰے صاحب بجنوری

ان کا مقام علمی استعداد کے اعتبار سے اس قدر بلند تھا کہ مولانا تھانوی رہ خود ان کی عربی زبان کی مہارت، ترجمے کی صلاحیت پر دادِ تحسین دیتے تھے۔

مولانا رہ کے مواعظ کو قلم بند کرنے کا سلسلہ سب سے پہلے حکیم صاحب ہی نے شروع کیا اور مولانا کی کتاب "الانتباہات المفیدہ عن اشتباہات الجدیدہ"[1] کی ایک شرح بھی بہت اچھے انداز سے لکھی۔ بہترین اور ماہر طبیب تھے۔ فنِ طب میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ بہشتی زیور کے نویں حصے میں بعض امراض کے تجویز کردہ نسخے حکیم صاحب کا خاص اضافہ ہے۔ ذہانت کا یہ عالم تھا کہ تحریر سے مزاج واخلاق کی کیفیت محسوس کر لیتے تھے۔ انتہا یہ تھی ایک متقی اور فاسق کے قاروروں میں فرق محسوس کر لیتے تھے۔

تقویٰ اس درجہ زندگی میں شامل تھا کہ ایک مرتبہ نماز کے وقت ڈرائیور نے موٹر روکنے سے انکار کر دیا تو کودنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر خدا کا کرنا اسی وقت گاڑی اچانک خراب ہو گئی۔ خدا نے ان کے نماز کے اس اضطراب کو اس طرح حل فرما دیا۔[2]

حکیم الامّت کو ان سے اس قدر گہرا تعلق تھا کہ فرماتے حکیم مصطفٰے فقیہ النفس ہیں اس قدر مزاج شناس تھے کہ مولانا تھانوی رہ ان پر کبھی خفا نہ ہوئے۔ حکیم مصطفٰے صاحب کو مولانا سے اس درجہ تعلق تھا کہ فرماتے "قلم زبان کا ساتھ نہیں دے سکتا ورنہ ایک لفظ بھی

[1] تالیفات اشرفیہ صفحہ ۲۶

[2] بزمِ اشرف کے چراغ صفحہ ۱۶۴

مولانا تھانوی رہ کے ضائع نہ ہونے دیتا۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ حکیم صاحب اتنے باصلاحیت تھے کہ اگر حکمت کی مصروفیت اور دیگر مشغولیتیں مانع نہ ہوتیں تو ان کا علمی کام بہت وسیع ہوتا۔

مولانا تھانوی رہ کی تصنیف "تربیت السالک" میں بھی مولانا تھانوی رہ کے خطوط حکیم صاحب کے نام تفصیل سے جواب کی صورت میں ملتے ہیں۔ غرض یہ مولانا کے ایسے خلیفہ تھے کہ بحیثیت شاگرد ومرید وخلیفہ ہر طرح مولانا سے منسوب تھے۔

(۹) حافظ قاری محمد عمر صاحب نہٹوری

حضرت کے یہ خلیفہ خاص نہٹور کے تعلیم یافتہ اور دیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیمی سلسلہ اور علی گڑھ میں ایک بڑے عالم گھرانہ میں شادی ہونے کی وجہ سے تادمِ آخر یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

انتہائی سنجیدہ اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ ابتدا ہی میں تقویٰ کے منازل کو اس قدر جلد طے کیا کہ مولانا تھانوی رہ نے بیعت ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد خلافت سے نواز دیا۔ اپنے شیخ مولانا تھانوی رہ کی حیات ہی میں ۷ رمضان المبارک ۱۳۴۴ھ میں مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ حضرت کے خلفاء مجاز میں وفات یافتگان کی فہرست میں ان کا نام اور تاریخِ وفات موجود ہے۔[2]

علی گڑھ میں حافظ محمد عمر رہ اپنے دور کے بہترین حافظ اور قاری شمار کیے جاتے تھے۔ آج بھی اُن کے بہت سے شاگرد موجود ہیں جن کا مشاہدہ ہے کہ ہر ایک وقت کئی حفاظ کا قرآن بلاتکلف سن لیتے تھے اور ہر ایک غلطی پر گرفت کرتے تھے۔ حافظ عمر صاحب کے شاگردوں میں سید احمد خاں شیروانی جو مولانا تھانوی کے مجازِ صحبت ہیں بقیدِ حیات ہیں۔[3]

[1] بزمِ اشرف کے چراغ صفحہ ۱۶۶

[2] اشرف السوانح حصہ سوم صفحہ ۶۵۲

[3] بزمِ اشرف کے چراغ صفحہ ۲۰۴

ان کو قرآن مجید سے اتنا عشق تھا کہ زندگی کا بیشتر حصہ قرآن سننے اور سنانے میں گزارا۔ ان کے چھوٹے حقیقی برادرِ محترم حافظ محمد عثمان علی گڑھی جن کا شمار جنگِ آزادی کے بے لوث اور بزرگ مجاہدین میں ہوتا ہے۔ ۱۹۷۳ء ۱۰ ر دسمبر کی صبح میں بوقت اذانِ فجر حالتِ نماز میں انتقال ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ تلاوت و نماز ان کا اتنا محبوب عمل تھا کہ یہ جذبہ اس وقت بھی برقرار رہا جب کہ اپنا بھی ہوش نہیں رہتا۔ حافظ عمر صاحب نے ناگہانی مرض طاعون میں گرفتار ہوئے۔ ڈاکٹروں کی بے پناہ توجہ اور کوششوں نے بظاہر زندگی کی امید دلادی تھی۔ لیکن اذان کی آواز سے بے قرار ہوکر آنکھیں کھول دیں اور نماز کے لیے اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ حالت غیر ہوگئی، کیوں کہ ڈاکٹروں نے حرکت کو منع کردیا تھا فریضہ رب کی ادائیگی کے ساتھ کے ساتھ رمضان کی مبارک ساعتوں میں واصل بحق ہوئے۔

اگر زندگی ان کا ساتھ دیتی تو یقیناً وہ آج موجود خلفا اسرار الحق صاحب، مسیح اللہ صاحب، مولانا محمد میاں صاحب الٰہ آبادی وغیرہ کی طرح اپنے وقت کے بزرگ ہوتے۔

اگرچہ ان کی بزرگی کا احساس ان کے تقویٰ اور علمی زندگی کی وجہ سے ان کی حیات میں ہی ہونے لگا تھا جس کا ثبوت خلیفۂ خاص عزیز الحسن صاحبؒ کے ذکر کردہ اس واقعہ سے ہوتا ہے:

"ایک بزرگ کا کشف حضرت تھانوی کے افاضہ باطنی کے ذیل میں"[1]

"جناب حافظ محمد عمر صاحب جو بڑے صاحبِ احوال بزرگ تھے اور حضرت والا کے خلیفہ مجاز تھے ایک رات ریل سے تھانہ بھون حاضر ہوئے تو جب ریل اہلِ خانقاہ کے محاذ سے گذری تو انھوں (حافظ عمر) نے حالتِ بیداری میں دیکھا کہ مسجد خانقاہ کے گنبد سے آسمان تک انوار کا ایک تار لگا ہوا ہے"

اس طرح کے واقعات سے خلفاء کے گہرے تعلق اور مولانا تھانوی رح کی عظمت

---

[1] اشرف السوانح حصہ دوم صفحہ ۱۷

کا احساس ہوتا ہے۔

(۱۰) مولانا عبدالباری ندوی رح

یہ تیرہ سو ساٹھ ۱۳۰۶ھ ہجری میں ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مشہور عالم تھے۔ مولانا نعیم فرنگی محلی سے بیعت تھے۔ عبدالباری صاحب مورخِ اسلام مولانا شبلی رحؒ کے دور میں ندوہ میں داخل ہوئے۔ عبدالباری صاحب کو منقولات سے زیادہ معقولات سے مناسبت تھی۔

مولانا کو انگریزی تعلیم سے بھی دلچسپی تھی۔ ندوہ میں مولانا شبلی رح نے ایک شعبہ انگریزی کا بھی قائم کیا تھا۔ عبدالباری صاحب نے انگریزی تعلیم شروع کردی۔ اسی دوران تعلیم میں ان کی ملاقات مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے ہوئی اور ان سے انگریزی سیکھنے کا سلسلہ بھی قائم کیا۔ تعلقات کا یہ سلسلہ قدیم سے قدیم تر ہوگیا۔

عبدالماجد دریا آبادی پر ایک دور عقلیت سے گذر کر الحادیت تک کا آیا۔[1] لیکن ان کے والد نے سرزمینِ حجاز میں ان کی اصلاح کے لیے رو رو کر دعائیں کیں اور وہیں انتقال ہوگیا۔

والد کی دعاؤں کے اثر اور خیالات کے انقلاب نے ان کو اس منزل پر لا کھڑا کیا کہ یہ خانقاہ تھانہ بھون روانہ ہوئے۔ جس کو مولانا عبدالماجد دریا آبادی اپنی تحریر میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"قدیم اسٹیشن تھانہ بھون میں تین مسافروں کا ایک مختصر سا قافلہ سہارن پور کی طرف سے کوئی دس ساڑھے دس بجے اترا۔ سالارِ قافلہ دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد صاحبؒ اور باقی دو میں سے ایک مولانا عبدالباری ندوی (استاد جامع عثمانیہ حیدرآباد دکن) اور

---

[1] بزمِ اشرف کے چراغ صفحہ ۲۶۷ و حکیم الامت صفحہ ۵

دوسرا یہ نارِ سیاہ"۔[1]

تھانہ بھون پہنچ کر شیخ الاسلام سالارِ قافلہ کے ذریعہ مولانا تھانوی رح سے بیعت کا تعلق قائم کیا۔ جب کہ مولانا تھانوی رح نے مولانا حسین احمد صاحب سے ہی بیعت کرنے کو کہا۔ دونوں ایک دوسرے سے اصرار کر رہے تھے۔ چنانچہ حکیم الامت رح نے اپنے حکیمانہ رنگ کا جواب دے کر معاملہ طے کر دیا۔ نہ تو میں جنید و شبلیؒ ہوں اور نہ آپ۔ ان کے لیے دونوں کافی ہیں۔

اس کے بعد ان دونوں کا تھانہ بھون کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔ عبدالباری صاحب کے تعلق کا معاملہ اس قدر بڑھا کہ مستقل تھانہ بھون ہی میں قیام کا ارادہ کر لیا لیکن ملازمت کی وجہ سے یہ خواہش پوری نہ کر سکے۔ لیکن جب بھی یہ تھانہ بھون جاتے مولانا تھانویؒ ان کے لیے اپنی خاص توجہ روحانی کو منعطف کرتے۔ آخر حضرت نے خلافت کے آخری منصب پر بھی فائز کر دیا۔

مکتوب شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ

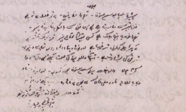

---

[1] حکیم الامت صفحہ ۲۷۶

مولانا اشرف علی تھانوی دورِ حاضر کے علماء کی نظر میں

مولانا سید محمد میاں سابق ناظم جمعیۃ العلماء ہند و شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی کی رائے

مولانا اشرف علی تھانوی رح کی زندگی کا نصب العین اور مشن سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع تھا، ردِ بدعات اصل مشن نہیں تھا بلکہ اتباعِ سنت کے تحت تھا۔ آپ کی حق گوئی اور حمایتِ حق کی جرأت نے ردِ بدعات کے عمل اور جذبہ کو نمایاں کر دیا تھا۔ سیاسیات سے آپ کو دلچسپی نہیں تھی، علماء دیوبند کے عام مذاق کے خلاف آپ کی طبیعت انقلاب پسند نہیں تھی۔ تحریکِ آزادی کے آپ مخالف رہے۔ آپ کے خیال میں تحریک کے جو فوائد بیان کیے جاتے تھے وہ ناممکن الحصول تھے۔ آپ اس سلسلے میں فرمایا کرتے تھے "رہنا جھونپڑی میں اور خواب دیکھیں محل کے"۔

آپ کے مضامین کتابچوں کی شکل میں شائع کیے جاتے رہے۔ ہر کتابچہ کا نام آپ تجویز فرمایا کرتے تھے۔ اس طرح آپ کی تصانیف کی تعداد کئی سو ہو جاتی ہے لیکن مستقل تصانیف جن کو کتابچہ یا رسالہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ کتاب ہی کہا جائے گا وہ بھی پچاس ۵۰ سے کم نہیں ہیں۔ علماء ہند میں ان کا مقام یہ ہے کہ بالغ النظر، محقق اور فقیہ مانے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی تصانیف اہم تصانیف مانی جاتی ہیں۔ اہلِ علم بھی ان کے مطالعہ کو اپنی علمی ترقی

کا ذریعہ سمجھتے تھے [1]

عجیب اتفاق اور انقلاب ہے چند ماہ گذرے میں والد صاحب مدظلہٗ کے ساتھ مولانا محمد میاں صاحب کی رائے مولانا تھانوی رح کے بارے میں معلوم کرنے گئی، بحیثیت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر کے مختلف سوالات اُن سے کیے۔ انھوں نے انتہائی شفقت اور توجہ کے ساتھ نو بجے شب سے لے کر ۱۱ ½ بجے تک کا قیمتی وقت مجھے دے کر اپنے مفید خیالات اور نظریات سے فائدہ پہنچایا اور آخر میں اپنے قلم سے تحریری رائے دی جو میں پیش کر رہی ہوں، لیکن افسوس کے ساتھ یہ بھی مجھے تحریر کرنا پڑ رہا ہے کہ مولانا موصوف بتاریخ ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۵ء اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم اپنی علمی صلاحیتوں، مخلصانہ خدمات اور اہم کتب کے عظیم مصنف ہونے کی وجہ سے جمعیۃ العلماء کا قلم سمجھے جاتے تھے، بہر حال خدا سے دعا ہے کہ ان جیسے بزرگوں کی صفات سے موجودہ نسلوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دے اور ان کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

استاذ حدیث تفسیر دار العلوم دیوبند مولانا فخر الحسن صاحب مدظلہ کی رائے

علماء تفسیر نے علم تفسیر کی تعریف بایں الفاظ فرمائی ہے۔ تبیین مراد اللہ ان اللہ سبحانہ تعالیٰ اراد بہذا اللفظ ہذا المعنی الخ۔ اللہ تعالیٰ کی مراد خدا کے الفاظ سے بنانا کہ خدائے تعالیٰ نے ان الفاظ سے ان معنی ارادہ کیا۔ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو نبوت کے مقام پر فائز ہو یا ولایت اور قربِ خداوندی کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا ہوا ہو۔ حضرت حکیم الامت مولانا الشاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی تصوف، طریقت کے موجودہ دور میں امام تھے۔ ان کی تفسیر بیان القرآن بلاشبہ ایک ایسی جامع تفسیر ہے جس میں فقہی، کلامی، تعلق مع اللہ، اور تعلق مع الناس کے جملہ مسائل کو شرح و بسط کے

[1] مرتب کا مولانا محمد میاں سے دہلی میں خصوصی انٹرویو۔

ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ عبادات ہوں یا معاملات، نماز روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل ہوں یا نکاح و طلاق کے، معاشرت سے متعلق ہوں یا معاش و معاد سے پوری تفصیل سے آپ کو حل قرآن کی اس تفسیر میں ملے گا۔ اس وجہ سے حضرت حکیم الامتؒ کی یہ تفسیر ان کی تمام تصانیف میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ طلبہ ہوں یا علماء، اتقیا ہوں یا صلحاء، مفسرین ہوں یا محدثین، متکلمین ہوں یا فقہاء، اپنی پیاس اس سے بجھاتے ہیں۔ بالخصوص امتِ محمدیہ میں حنفیہ کے لیے ایک بڑی کامل و مکمل تفسیر ہے۔ انھوں نے اپنی تفسیر میں فقہ حنفیہ کے مسائل کو مفصل و مدلل بیان فرمایا۔ اور یہ تفسیر بلاشبہ تمام تفاسیر کا نچوڑ اور خلاصہ ہے جس نے اس کو اپنے ریسرچ اور تحقیق کے لیے منتخب کیا ہے اس کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اپنی بات کو انھی کلمات پر ختم کر رہا ہوں [1]

مولانا ظہور الحسن صاحب مدظلہ خلیفہ مولانا اشرف علی مہتمم مدرسہ امداد العلوم و خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون کی رائے

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کی ممتاز خصوصیات آپ کے مخصوص اور ممتاز کمالات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) سب سے پہلے ممتاز طرۂ امتیاز آپ کا استغنار ہے جو ناقابلِ تعارف ہے۔

(۲) اپنی تحقیقات شرعی و عقلی پر ایسا ثبات تھا کہ مخالفین کی بڑی بڑی جمعیت و قوت تاوقتیکہ شرعی حجت پیش نہ کرے قاتلانہ دھمکیوں سے بھی آپ کو مرعوب نہ کر سکیں۔

(۳) آپ کا نادر الوجود ممتاز روزگار عمل یہ تھا کہ آپ کی تصانیف و فتاووں میں اگر ادنیٰ عالم بھی کوئی کمی ثابت کرتا یا خود ذاتی طور کی کمی محسوس فرماتے تو اس کو محض قبول کرتے بلکہ رجوع فرما لیتے اور ایک مستقل سلسلہ بصورت ترجیح الراجح اخیر عمر تک جاری

[1] مرتب کا مولانا فخر الحسن صاحب سے خصوصی انٹرویو

رکھا جس میں اس رجوع کا اعلان اور صحیح تحقیق شائع فرماتے رہتے۔

(۴) اپنے بلند علمی وعملی کمالات کو ہمیشہ بزرگوں اور اساتذہ کی طرف منسوب فرماتے، کبھی اپنے علم وفضل کا ادعا یا درویشی کا دم نہیں بھرا بلکہ اپنے کو طالب علم ظاہر فرمایا کرتے تھے۔

(۵) کبھی مخالف بلکہ معاند سے مخالفانہ یا معاندانہ خطاب نہیں فرمایا۔ بلکہ نہایت متانت سے تحقیق حق شائع فرما کر خاموشی اختیار فرماتے اور فیصلہ ناظرین پر چھوڑ دیتے۔

(۶) وقتی پیش آنے والے مسائل اور حوادث کو حوادث الفتاوی کے نام سے مجتہدانہ تحقیق صداقت سے نصوص اور اسلاف کی مطابقت کے ماتحت حل فرماتے جو علماء کے لیے لامحالہ قابلِ قبول اور سبق آموز ہوتے۔

(۷) آپ دورِ حاضرہ کی نام نہاد سیاست کو غیر شرعی اور مفاد اسلام کے خلاف اور انجام کے لحاظ سے مضر سمجھتے تھے جس کا مشاہدہ بھی اب ہو رہا ہے۔ مدعیانِ سیاست کو اس بارے میں عموماً مطعون کیا لیکن باوجود مطالبہ کے کوئی اس کی شرعی حیثیت سے جواز ثابت نہ کر سکا۔ اس لیے آپ کبھی حزبِ مخالف کی کثرت اور جمعیت سے مرعوب نہیں ہوئے، آخر عمر تک اپنے مسلک پر مضبوطی سے قائم رہے۔ اس ثابت قدمی کے مخالفین بھی معترف ہیں۔

(۸) طالبین کی تربیت میں آپ محض رسمی تعلق کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ ہدایات پر عمل کا مطالبہ اطلاع اور اتباع کا التزام اور خلاف ورزی پر مواخذہ فرماتے۔ اس لیے آپ سے تعلق کے بعد صالحین یوماً فیوماً اصلاح پذیر ہوتے چلے جاتے تھے، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی ممتاز خصوصیات اللہ تعالیٰ نے بفیض دعا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نور اللہ مرقدہٗ آپ کو فن تصوف وتصوف میں نہایت اعلیٰ ملکہ عطا فرمایا تھا۔ آپ کی تفسیر گو زیادہ ضخیم نہیں لیکن قرآنی علوم پر حاوی اور اس پر ہونے والے اغیار کے اشکالات واعتراضات کو معمولی ترجمہ کی خوبی سے ایسا حل فرما دیتے ہیں کہ بڑی بڑی عربی تفاسیر میں بھی تلاش کرنے سے

نہیں ملتی۔ اس لیے عموماً علماء باوجود اُردو زبان ہونے کے تفہیم قرآن اور حل اشکالات کے لیے اس کے مطالعہ سے اپنے کو بے نیاز نہیں سمجھتے۔ آپ کا تصوف فی زمانہ تجدیدی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ کا مشہور مقولہ تھا کہ طب اور تصوف میں اجتہاد ختم نہیں ہوا۔ دونوں فنون میں ضرورت کے مطابق مریضوں کی قوت وغیرہ کے لحاظ سے تدابیر اور علاج میں سالک کو طبیعتوں کا لحاظ کر کے تغیر ضروری ہے۔ آپ نے تصوف کے مسخ شدہ خدوخال کو قرآن وحدیث کی روشنی میں گویا نئی زندگی بخشی جس کا مخالفین تک کو معترف ہونا پڑا اور خوش نصیب طالبین آپ سے فیض حاصل کر کے بہت جلد فائز المرام ہو جاتے۔[1]

جناب مولانا مفتی نظام الدین صاحب دار الافتاء دار العلوم دیوبند کی رائے

اللہ نے بچپن ہی سے آپ میں شریعت کا علم حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے کا غایت درجہ کا اہتمام عنایت فرما دیا تھا۔ چنانچہ کل انیس[19] سال کی عمر میں حافظ، قاری ہونے کے ساتھ ساتھ درس نظامیہ کے تمام علوم میں آپ نے مہارت تامہ حاصل کر لی تھی جس کا اندازہ آپ کے زمانہ درس کے حالات وکیفیات سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ اور فراغت کے بعد ہی اوائل عمر ہی میں والد بزرگوار نے آپ کو ایک رقم عنایت فرمائی جس میں فریضہ حج ادا کیا جا سکتا تھا آپ نے فوراً ادائگی حج کی تیاری کر لی۔ والد بزرگوار نے کہا ابھی جلدی کیا ہے کر لینا تو جواب دیا کیا ضمانت ہے کہ آئندہ سال زندہ ہی رہوں گا۔ بالآخر آپ کے مستقل ارادہ نے والد بزرگوار کو بھی اپنے ساتھ سفر حج میں جانے پر تیار کر لیا۔ آپ مکہ مکرمہ پہنچ کر حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی بیعت سے بھی مشرف ہو گئے اور کمالات ظاہری وباطنی کی تکمیل میں مشغول ہو گئے آپ کے قلبی کیفیات باطنی جذبات کا اندازہ بچپن کے زمانہ کی ایک مثنوی سے بھی ہوتا ہے چنانچہ چند ہی سال میں شیخ کامل ہی نہیں بلکہ شریعتِ مقدسہ آپ کی فطرت ہو گئی۔

---

[1] مولانا ظہور الحسن صاحب سے مرتّب کا خصوصی انٹرویو۔

جیسا کہ اپنے ملفوظ[1] میں خود فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے فضل ورحمت سے اور آپنے بزرگوں کی دعا اور توجہ کی برکت سے شریعت مثل فطرت کے بن گئی ہے الخ

ب ۔ معاملات آپ کی طبعی خوبن گئی تھی اس کے لیے مشاہدہ کافی ہیں۔

! والد بزرگوار کے انتقال پر جب ترکہ ملا تو جتنی پشت سے ترکات میں تقسیم شرعی نہ ہونے کا علم ہوا اس وقت سے حسب تخریج شرعی دور نزدیک ہر وارث شرعی کو ان کا حصہ جس طرح ممکن ہوا پہنچایا۔ بسا اوقات چند پیسے بذریعہ منی آرڈر بھیجے جب کہ منی آرڈر کی فیس بھی اس رقم سے زیادہ ہوتی۔

!! بوجہ مصلحت شرعی دو نکاح کیے تو دونوں میں عدل وانصاف کی نظیر قائم کردی جو آپ کے سوانح حیات سے مفصل طور پر معلوم کی جاسکتی ہے۔

ج ۔ آپ کے اندر تزھد فی الدنیا تذکرۃ الاخرۃ بھی کمال درجہ کا تھا۔ تزھد فی الدنیا کے لیے بھی مشاہدے تو بہت ہیں مگر صرف دو پر اکتفا کرتا ہوں۔

! کانپور جامع العلوم کے زمانہ تدریس میں دس روپے ماہانہ ملتے تھے۔ میاں بیوی دونوں کے لیے پانچ روپے کافی ہو جاتے تھے۔ فکر ہوا کہ یہ پانچ کہاں خرچ کریں ایک طالب علم کی جاگیر[2] اپنے یہاں لگالی پھر بھی کچھ بچ جاتا تو مدرسہ ہی میں واخل فرمادیتے۔ آبائی ترکہ بھی تقسیم کردیا، اپنے پاس کچھ نہ رکھا، چند ہی سال میں متوکل علی اللہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون مستقل قیام فرمایا۔ شروع شروع میں افلاس وتنگ دستی بھی پیش آئی مگر قدم تزھد واستقلال میں فرق نہ آیا بلکہ بڑے بڑے ہدیے وتحفے اگر ذرا بھی خلافِ شرع معلوم ہوتے واپس فرمادیتے اور اقلِ قلیل پر قناعت فرماتے اور شانِ استغنار کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

!! آپ کے کم وبیش ایک ہزار سے متجاوز رسالہ وتصانیف ہوئیں مگر آپ نے کبھی بھی

---

[1] انفاس عیسیٰ حصہ دوم، صفحہ ۶۲۴

[2] طالب علم کے ہوسٹل کے قیام وطعام کے اخراجات کو جاگیر کہا جاتا ہے۔

کسی ایک کا بھی حق تصنیف محفوظ فرمایا، نہ اپنے لیے اور نہ کسی دوسرے کے لیے اور نہ کبھی اس سے ایک پیسے کا نفع حاصل فرمایا بلکہ سب کو آزاد رکھا تاکہ مخلوق خدا کو بوجہ اللہ بیش از بیش دینی نفع پہنچے۔

آپ کے تذکرہ للآخرۃ کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ہزاروں کو واصل الی اللہ بنادیا۔ سینکڑوں آپ کے خلفار ہوئے جو فنا فی اللہ اور فنا فی الرسول کے منصب پر فائز ہوئے اور ان میں سے ایک ایک فرد تنہا ایک امت کی برابر ہوا، اور ان سے بھی لاکھوں مخلوق خدا واصل الی اللہ ہوئی۔ خلفار کی فہرست اشرف السوانح سے بھی مل سکتی ہے۔

د ۔ کارنامے آپ کے تجدیدی تھے۔ آپ صحاح کی حدیث یبعث اللہ[1] علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد دینہا او کما قال الخ کے صحیح مصداق تھے آپ کے مجددیت کا سراغ جامع المجددین۔ تجدید معاشیات وغیرہ کتب سے بھی مل سکتا ہے۔ یہ کتابیں حضرت مولانا عبدالباری صاحب جو شبستاں سعادت متصل ٹوالی گنج شہر لکھنؤ کی تصانیف میں سے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کے مواعظ ورسائل اور تصانیف میں سے اکثر آپ کے مجدد ہونے کے لیے آفتاب نصف النہار کے مانند دلیل ہیں۔

نوٹ ۔ آپ کہتی ہوں گی کہ میں نے تو آپ کے کارناموں پر تنقیدی نگاہ سے بھی رائے مانگی تھی تو کیا کیا جائے جب کہ واقعات اپنی حقیقت کے رنگ میں بجائے تنقید کے تائید کا فائدہ دیں۔

(۲) ہندوستان کے اکابر علمار کے درمیان آپ سند کی حیثیت رکھتے تھے اور حکیم الامتؒ کے لقب سے ملقب تھے۔ تحقیقات علمیہ کے اندر آپ کا قول، قولِ فیصل کا درجہ رکھتا تھا۔ نیابت الادراک وغیرہ مضامین بھی اس پر دلیل

---

[1] اللہ تعالیٰ ہر سو سال کے آخر میں ایسے شخص کو بھیجتے ہیں جو دینِ محمدیؐ کو تازہ کرتا ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

قاطع ہیں۔

(۳) آپ کی تصانیف مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہیں اور اپنے اندر دینی علوم کا بے شمار ذخیرہ رکھتی ہیں۔ زندگی کا کوئی شعبہ تشنہ نہیں چھوڑا، خواہ علاج ظاہری وطب کا شعبہ ہو یا علاج باطنی وتصوف کا شعبہ ہو۔ خواہ اعتقادیات وایمانیات کا شعبہ ہو یا معاملات وعبادات کا شعبہ ہو، خواہ معاشرت وسیاسیات کا شعبہ ہو ہر شعبہ میں آپ کی تصنیف موجود ہے جو تشنگی کو دور کرتی ہیں اور حجت کا درجہ رکھتی ہیں۔

خصوصی تصانیف تو خصوصی ہی ہیں۔ جیسے تفسیر بیان القرآن، الحیلۃ الناجزہ للحلیلۃ العاجزہ وغیرہ۔ آپ کی عمومی تصانیف کو آپ کی زندگی میں وہ مقبولیت حاصل ہوگئی جو پوری امتِ محمدیہ کے بارے میں بھی اگر کہہ دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ایسی تصانیف کم ہیں جن کو اُن کے مصنف کے ہی زمانہ میں وہ مقبولیت حاصل ہوگئی جو آپ کی ان تصنیفات کو حاصل ہوگئی تھی۔

(۴) حضرت مولانا اشرف علی نور اللہ مرقدہ کی تفسیر بیان القرآن کے بارے میں کچھ باتیں تو خود صاحبِ تفسیر ہی اس تفسیر کے مقدمہ میں ایسی بیان فرما گئے ہیں جس سے اس تفسیر کی خصوصیت واہمیت کا اندازہ ہندوستان کی دیگر تفاسیر کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رح کا مقولہ ہے کہ میں اُردو کی کتابوں کا معتقد نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اُردو کتابوں میں علوم زیادہ نہیں ہیں، لیکن جب مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ سمندر کو کوزہ میں بند کیا ہے، اور اس وقت سے میں اُردو کتابوں کا بھی قائل ہوگیا اور ان کو بھی دیکھنے لگا۔ او کما قال شاہ رح۔

اور یہ حقیقت ہے کہ کامل الاستاذ اور جید الفہم عالم پہلے ایک مرتبہ غائر نظر سے اس تفسیر (بیان القرآن للتھانوی) کا مطالعہ کرے، پھر متقدمین کی تفاسیر

معتبرہ مروجہ کا غائر نظر سے مطالعہ کرے، پھر دوبارہ تفسیر بیان القرآن کا مطالعہ اسی امعان نظر وگہرائی سے کرے تو اس وقت اس تفسیر کی خصوصیات اور اس کا مقام منکشف ہوگا کہ یہ تفسیر ہندوستان کی دیگر تفاسیر کے مقابلہ میں کیا خصوصیات اور کیا مقام رکھتی ہے[۱]۔

فقط اللہ تعالیٰ اعلم، نظام الدین، خادم دار الافتاء، دار العلوم دیوبند،
سہارنپور یوپی ۲۶/۷/۱۳۹۵ھ ۵/۸/۷۵ء

مولانا نعیم صاحب استاذ دار العلوم دیوبند کی رائے

کسی حقانی عالم دین کو پرکھنے کے لیے تین چیزیں معیار بن سکتی ہیں۔ علم، عمل، اخلاق جہاں تک مولانا تھانوی علیہ الرحمہ کی ذات کا تعلق ہے، خوش اعتقادی اور تعصب دونوں قسم کی عینکوں کو اتار کر اگر دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ان کی زندگی کے مثلث کے یہ تینوں زاویے مکمل اور یکساں ہیں۔ علم ظاہر کی تکمیل انھوں نے وقت کے کامل، ممتاز اور جید علماء سے کی جن میں سرِ فہرست مولانا شیخ محمدؒ، مولانا محمود الحسنؒ، مولانا محمد یعقوب رح اور مولانا محمد قاسمؒ آتے ہیں جو اُن کے علم کی پختگی اور مضبوطی کی سب سے بڑی سند اور ضمانت ہے، چنانچہ ان کی کامیابی درس وتدریسی خدمات نے علوم معقولہ، علوم منقولہ، علوم آلیہ، علوم عالیہ میں اُن کے جوہروں کو اجاگر کر کے رکھ دیا۔ منقولات کی نسبت معقولات کو مشکل ترین سمجھا جاتا ہے۔ مگر مولانا رح کے زیرِ درس چوٹی کی معقولات رہی ہیں۔ امہات مسائل اور معرکۃ الآراء نظری مباحث کو بدیہات میں تبدیل فرما دیتے تھے۔

علوم عالیہ منقولہ تفسیر حدیث وفقہ میں مولانا رح کی نظر اتنی وسیع وعمیق تھی کہ بایدو شاید، محققانہ نظر، مجتہدانہ شان رکھتے تھے۔ مولانا رح کا یہ علمی پہلو تو وہ ہے جس سے خواص مستفید ہوتے رہے۔ دوسرا خصوصی پہلو مولانا رح کے علوم ونظریات سے عام

---

[۱] مرتب کا مولانا نظام الدین صاحب سے خصوصی انٹرویو۔

استفادہ کا ہے۔ تقریر و بیان اور موعظت و خطبات کا سلسلہ ہو یا تصنیف و تالیف کا شغلہ ہو بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں میدانوں میں مولانا اپنے معاصرین تو کیا متقدمین سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔ بیشمار مواعظ و بیانات کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کی زندگی میں اس کے سوا کوئی کام ہی نہیں رہا ہوگا۔ مواعظ کیا ہیں، عام ڈگر کو بھی بدل کر ہی رکھ دیا ہے۔ نہایت تحقیقی، علمی مضامین تجرباتی، اصلاحی نوادرات لطائف وظرائف تمدنی، معاشرتی، سماجی ناسور جن سے مسلمان ہی نہیں انسانیت برباد ہو رہی ہے ساری دکھتی رگوں کو مواعظ میں جھنجوڑا گیا اور بڑی دل سوزی کے ساتھ متاثر پیرایہ میں نہ صرف مردوں پر بلکہ عورتوں پر اثر انداز ہوئے۔ اور علاقے کے مسلمانوں کی ایک قابل ذکر تعداد مولانا کے رنگ سے متاثر ہوئی۔ اسی طرح عربی فارسی اور اردو زبان میں مولانا رح کے مقبول عام و خاص تصنیفات و تالیفات بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ بلالحاظ کثرت اگر دیکھا جائے تو بلا تکلف یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کی اوراق زندگی سے اوراق کتاب زیادہ ہیں۔ علامہ سیوطی[1] محدث کو کثیر التصانیف سمجھا گیا، لیکن سیوطی رح کی تصانیف کی تعداد تین سو کے قریب ہوگی، مگر مولانا تھانوی رح کے اشہب قلم کی جولانی کا یہ حال ہے کہ لگ بھگ ایک ہزار تالیفات کا ذخیرہ باقیات الصالحات چھوڑ گئے اور کمال یہ کہ کسی ایک تصنیف کا بھی حق طبع محفوظ نہیں، بلکہ سب وقف عالم رہیں جن سے کروڑوں انسانوں نے استفادہ کیا اور والغیب عند اللہ مدتوں فیضان جاری رہے گا۔ کوئی فن اور کوئی شاخ ایسی نہیں جس میں مولانا رح کا رہوار قلم نہ چلا اور داد تحقیق نہ دی ہو۔

تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف تو مولانا کے خاص مضامین ہیں، تفسیر بیان القرآن ایک تفسیری شاہکار ہے۔ اس کی قدر و منزلت اس وقت ہوئی جب تمام متداول تفسیری کتابوں کے مطالعہ کے بعد اس کو دیکھا جائے۔ عربی میں مختصر حواشی میں صرفی، نحوی، لغوی معنیٰ و بیان، فصاحت و بلاغت کے ضروری مباحث کے علاوہ فقہی، کلامی، روایتی سلسلوں کو

---

[1] علامہ سیوطی محدثؒ۔

نظر انداز نہیں کیا گیا۔ بین القوسین تفسیری عبارتوں میں بہت سے عقلی، نقلی اشکالات کو رفع فرما دیا گیا ہے۔ اور بعض مقامات کے حل میں نہایت عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ ربط آیات پر خاص توجہ کی گئی ہے۔ تمام آیات ایک مسلسل اور مربوط کلام معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ان تفسیری خصوصیات کے علم الاعتبار کے درجہ میں مسائل سلوک کو آیات قرآنیہ سے مستنبط کر کے نکات و تصوف و معرفت پر سیر حاصل کلام کیا گیا ہے۔ اُردو زبان میں ہونے کی وجہ سے کما حقہ بیان القرآن کی عظمت نہیں ہو سکی، فارسی یا عربی میں اگر ہوتی تو اس سے کہیں زیادہ وقعت ہوتی۔ سلسلہ حدیث میں اعلاء السنن مجلدات دراصل مولانا رح ہی کا کارنامہ اور فقہ حنفی کی عظیم خدمت ہے۔ مسلک احناف پر یہ الزام رکھنا بے بنیاد ہو گیا کہ ذخیرہ احادیث سے یہ تہی دامن ہے یا ان کا مبلغ پرواز محض قیاسیات و عقلیات ہیں۔ اس سلسلے کی دوسری کڑی ان کے ہزاروں لاکھوں فتاویٰ ہیں جو امداد الفتاویٰ میں محفوظ ہیں۔ اور مفقود الزوج وغیرہ مسائل میں تو مولانا رح کی اجتہادی شان اور محققانہ بصیرت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

تیسری عظیم کڑی اس سلسلہ کی بہشتی زیور ہے، جو عوام خواص، مردوں، عورتوں، بچوں سب کے لیے یکساں مفید اور ضروری ہے۔ پورے فقہ کو بڑی جامعیت اور فیصلہ کن طریقے سے مرتب فرمایا گیا ہے۔ یہ مسلمانوں پر مولانا رح کا عظیم الشان احسان ہے، ہمارے ان علاقوں میں شاید ہی کوئی مسلم گھرانہ اس کتاب سے خالی ہو۔ اچھے اچھے عالم بھی اس کتاب سے بے نیاز نہیں ہو سکے۔

سلوک و تصوف میں جہاں تک مولانا رح کی خدمات کا تعلق ہے ان کا اصل میدان یہی معلوم ہوتا ہے۔ مسائل السلوک، انفاس عیسیٰ، تربیت السالکین سے مولانا کے محقق اور مبصر ہونے کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن و حدیث سے ماخوذ احسانی تصوف کو ایسا نکھارا ہے کہ صدیوں سے اس پر رسومات و بدعات کی جو تہیں جم گئی تھیں ان سب کو بڑے معتدل انداز میں صاف کیا ہے۔ ایک طرف پوری جرأت کے ساتھ حق کو واضح کر دیا ہے۔ دوسری طرف معروف بزرگوں کا ادب و احترام بھی ملحوظ رکھا ہے۔ خشک علماء

کی نسبت بڑے توسع سے کام لیا۔ اور ہر رسومات میں الجھے ہوئے صوفیہ کے مقابلے میں شریعت کو برتر قرار دیا۔ غرض کہ نہایت معتدل انداز میں مجددانہ کام کر کے دکھایا اور افراط و تفریط سے ہٹ کر اگر یہ کہا جائے کہ اپنے وقت کے غزالی رح اور رازی رح تھے تو بے جا نہ ہوگا۔

درخت اگر اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو کیا مولانا تھانوی رح، مولانا شبیر احمد، مولانا محمد طیب، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا محمد حسن، مولانا عبدالغنی، مولانا وصی اللہ، مولانا ادریس وغیرہ درجنوں ممتاز علماء و مشائخ سے نہیں پہچانے جا سکتے جو ہمیشہ آپ کے دامن سے وابستہ رہے، اور اپنے اپنے دامنِ مراد کو سب نے مولانا رح کے در سے بھرا۔ مولانا مناظر حسن، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری مولانا تھانوی رح کے فضل و کمال کے بلا استثناء سب ہی معترف رہے۔ اپنے تو خیر اپنے تھے ہی سیاسی نظریات میں جو بزرگ[1] اور اہلِ علم مولانا سے مختلف تھے وہ بھی مولانا رح کے کمالاتِ علمی، عملی، اخلاقی کے آگے جھکتے تھے اور سب احترام و عقیدت سے اپنے قلوب کو مملو پاتے تھے۔ حتیٰ کہ جو حضرات بلحاظ مشرب و مشرب کے مولانا سے الگ تھلگ تھے وہ بھی مولانا رح کا لوہا مانتے تھے۔ البتہ جو حضرات انصاف پسند نہیں ہیں۔ تعصب، ضد اور ہٹ دھرمی کے شکار ہیں اُن کی بات دوسری ہے۔ ورنہ جدید و قدیم دانشوروں جیسے خواجہ عزیز الحسن، وصل بلگرامی، مولانا معین الدین، جگر مرادآبادی وغیرہ کا سنگم آپ کی ذات رہی۔

مولانا کی ذاتی جامعیت اور خوبیوں کو سامنے رکھ کر یہ کہنا صحیح ہے ما رای الناس مثلہ و ما راہ مثلہ اور اس ناپائیدار زندگی میں جتنے مختلف النوع بڑے بڑے کام آپ نے اور تنہا آپ نے انجام دیے اُن کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے۔ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا اور لیس[2] علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحدٍ۔

---

[1] مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا حفظ الرحمان، مولانا احمد سعید سب ہی آپ کو علم و عمل زہد و تقویٰ کا روشن مینار سمجھتے تھے [2] اللہ رب العزت کے لیے مشکل نہیں کہ ایک عالم کو ایک ذات میں جمع فرما دیں۔

مکتوب سید محمد میاں رح

حضرت مولانا ضیاء الرحمن صاحب کی صاحبزادی عزیزہ ریحانہ سلمہا۔
احقر کے غریب خانہ پر آئیں۔ آپ نے حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب
تھانوی کی زندگی۔ ان کی خدمات۔ ان کی تصانیف خصوصاً بیان القرآن کے متعلق
احقر سے سوالات کئے۔ راقم حروف نے اپنی واقفیت کے بموجب ان کے جوابات
دئے۔ عزیزہ موصوفہ نے ان جوابات کو ترتیب دینے کی کوشش کی۔ امید ہے
کہ جوابات تسلی بخش ہوں گے۔ [illegible]
محمد میاں
۱۰ رجب ۹۵ھ [illegible] ۲۵

مکتوب مفتی عتیق الرحمن عثمانی رح

عزیزہ ریحانہ نے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ کی علمی اور اصلاحی خدمات اور خاص طور پر
ان کی مشہور و معروف تفسیر بیان القرآن پر جو کام کیا ہے وہ ہر لحاظ سے حوصلہ افزائی کا
مستحق ہے۔ مجھے یقین ہے ان کی محنت کی قدر کی جائے گی۔ ریحانہ کے علمی ذوق اور شوق تحقیق
کی یہ کھلی ہوئی دلیل ہے کہ انہوں نے اپنے کام کے لیے بیان القرآن جیسی اہم کتاب
کا انتخاب کیا۔ افسوس ہے وقت کی انتہائی قلت کی وجہ سے میں ان کے سوالات کا
تفصیلی جواب نہیں دے سکا ان کا یہ کام مکمل ہو جائے تو اس پر نظر ڈالی جائے گی

عتیق الرحمن عثمانی
۳۰ رجب المرجب ۱۳۹۵ھ
مطابق ۹ اگست ۱۹۷۵ء

مکتوب قاری محمد طیب صاحب رح سابق مہتمم دار العلوم دیوبند

مکرمہ [illegible] — عزیزہ ریحانہ بنت حضرت مولانا ضیاء الرحمن صاحب [illegible]

[illegible]

محمد طیب [illegible] مہتمم دار العلوم دیوبند
[illegible]

مکتوب مولانا ظہور الحسن صاحب تھانویؒ

از مدرسہ امداد العلوم و خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر

مورخہ ۔۔۔ رجب ۱۳۹۵ھ ۔۔۔ اگست ۱۹۷۵ء

از ظہور الحسن غفر لہ خادم خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون

کل ۲۷ رجب ۱۳۹۵ھ مطابق ۶ اگست ۱۹۷۵ء کو میرے محب قدیم
مولوی ضیاء الدین صاحب ضیاء منزل کوٹھی سرائے حکیم علیگڑھ سے
مع اپنی صاحبزادی ریحانہ ضیاء کے تشریف لائے محترم موصوف سے
معلوم ہوا کہ آپکی صاحبزادی حسب دستور قدیم پرائیویٹ طریقہ پر اپنی والدہ صاحبہ سے
اول دینیات میں بی اے کیا اول درجہ
پھر پرائیویٹ ایم اے سے امتحان پاس کیا
اب وہ اپنی محترم اور والدہ محترمہ کے ہمراہ اپنی تصنیف کی
تکمیل کے سلسلہ میں اہل علم سے تعاون و رہنمائی حاصل کرتی ہوئی
یہاں پہونچی ہیں یہاں آکر والدہ محترمہ نے زبانی بھی معلومات کیں
اور بعض کتب و رسائل لئے اور کچھ تحریری حاصل کی ہے
آپکی والدہ محترمہ عالم فاضل اور متقی ہیں اور اپنی بزرگوں کی ۔۔۔
اور تبلیغی جماعت میں بھی ممتاز خدمات ۔۔۔ علماء اسلام سے
انجام دیتی ہیں یہ معلوم ہوکر خوشی ہوئی کہ ۔۔۔
لڑکیاں جو تعلیم اسلامی ماحول میں ۔۔۔ تعلیم حاصل کریں۔

ماخذات

(زیر مطالعہ و حوالہ)

مطبوعات مولانا اشرف علی تھانویؒ

۱۔ الترتیب لطیف — الحکیم والحفیف

۲۔ التصوف فی معرفتہ احادیث التصوف

۳۔ التکشف — آزاد پریس دیوبند

۴۔ اصلاح الرسوم — یونین پرنٹنگ پریس دہلی ،

۵۔ اصلاح ترجمہ دہلویہ

۶۔ اصلاح ، ترجمہ مرزا حیرت دہلوی ، یونین پرنٹنگ پریس دہلی ، ۱۳۵۶ھ

۷۔ الانتباہات المفیدہ ، عن الاشتباہات الجدیدہ ، مکتبہ نشر القرآن دیوبند ، رجب ۱۳۳۰ھ

۸۔ بہشتی زیور — پرنٹنگ پریس دہلی ، ۱۳۲۶ھ

۹۔ تفسیر بیان القرآن — مطبع مجتبائی ، ۱۳۲۶ھ

۱۰۔ حقوق المعاشرت — مقبول المطابع ہردوئی

۱۱۔ حیات المسلمین — جمال پریس ، دہلی ۱۳۶۴ھ

۱۲۔ وعظ دعوات عبدیت — مقبول المطابع ہردوئی ، ۱۳۴۲ھ

۱۳۔ مسائل السلوک

۱۴۔ مکمل بیان القرآن ، تفسیر و ترجمہ ۱۳۵۲ھ

۱۵۔ وجوہ المثانی — مکتبہ نشر القرآن ، دیوبند

tobaa-elibrary.blogspot.com

۱۶ ـ وعظ الکمال فی الدین النسار مطبع اشرف المطابع دیوبند، ۱۳۵۳ھ

۱۷ ـ وعظ ذکر سول، سلسلہ تبلیغ دریبہ کلاں دہلی

۱۸ ـ وعظ شرائط طاعۃ و استخفاف المعاصی، تھانہ بھون، ۱۹۲۶ء

دیگر تصانیف

۱۹ ـ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، دانش گاہ، لاہور

۲۰ ـ الاعلام ، خیر الدین زرکلی، جلد اول، طبع ثانی

۲۱ ـ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، شاہ ولی اللہؒ، مترجم رشید احمد انصاری، مکتبہ برہان دہلی، ۱۹۱۴ء

۲۲ ـ الاتقان فی علوم القرآن، علامہ جلال الدین سیوطی، مترجم اُردو محمد حلیم انصاری، ۱۹۰۵ء

۲۳ ـ الموافقہ، جلد اول منصور پریس لاہور

۲۴ ـ اشرف السوانح خواجہ عزیز الحسن مجذوب، ۱۳۵۴ھ

۲۵ ـ امام ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کا اجمالی تعارف ، مولانا عبدالرشید سندھی

۲۶ ـ بزم اشرف کے چراغ، پروفیسر احمد سعید، جدید پریس لاہور، ۱۹۷۵ء

۲۷ ـ بخاری شریف، انگریزی و اردو

۲۸ ـ ترجمان القرآن، مولانا آزادؒ ، جید برقی پریس دہلی

۲۹ ـ ترجمہ قرآن ، شاہ عبدالقادر دہلویؒ ، مطبع احمدی دہلی، ۱۸۱۵ء

۳۰ ـ ترجمہ مولوی نذیر احمد دہلویؒ

۳۱ ـ ترجمہ شاہ رفیع الدین دہلویؒ ، مطبع احمدی دہلی، ۱۳۰۵ھ

۳۲ ـ ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ ، دار التصانیف، شاہراہ لیاقت آباد، کراچی

۳۳ ـ تحریر فی اصول التفسیر، سر سید احمد خاںؒ، مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۴ء

۳۴ ـ تفسیر حقانی (تفسیر فتح المنان)، مولوی عبدالحق دہلوی ۔ دہلی پرنٹنگ پریس

۳۵ ـ تفسیر روح المعانی، محمد عالم بن عبدالواحد

۳۶ ـ تفسیر القرآن ، ترجمہ سر سید احمد خاں ، مطبع علی گڑھ پریس ۱۳۱۲ھ

۳۷ ـ تفسیر معارف القرآن، مفتی محمد شفیع ، مکتبہ مصطفائیہ، دیوبند

۳۸ ـ تفسیر مواہب الرحمٰن ، سید امیر علی، مطبع نول کشور پریس، ۱۹۰۲ء

۳۹ ـ تفسیر جلالین ، ایم بشیر حسن اینڈ سنس ۱۰۲، نور چیت پور کلکتہ

۴۰ ـ تفسیر کمالین ، مطبع نعمان پریس، ترکمان گیٹ دہلی

۴۱ ـ تفسیر درس قرآن ، تھانہ بھون

۴۲ ـ تفسیر ابن کثیر، اردو ترجمہ ، نور محمد اصح المطابع، آرام باغ کراچی

۴۳ ـ تفہیم القرآن ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی

۴۴ ـ تاریخ تفسیر القرآن ، عبدالصمد صارم

۴۵ ـ تجدید دین کامل ، مولانا عبدالباری ندوی، تنویر پریس لکھنؤ، ۱۳۶۸ھ

۴۶ ـ تفسیر مظہری ، ثناء اللہ پانی پتی، یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۲ء

۴۷ ـ تنقیح البیان، سید ناصر الدین محمود، نصرت المطابع دہلی ۱۲۹۷ھ

۴۸ ـ تہذیب الاخلاق جلد دوم، سر سید احمد خاں

۴۹ ـ تالیفات اشرفیہ ، مرتبہ محمد عبدالحق ، ادبی پریس لکھنؤ ۱۳۵۴ھ

۵۰ ـ جامع التفسیر ، نواب قطب الدین خاں، مطبع نظامی کانپور

۵۱ ـ جائزہ تراجم قرآن، سید محبوب رضوی

۵۲ ـ حکیم الامت ، مولانا عبدالماجد دریا بادی ، معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۱ء

۵۳ ـ حیاتِ جاوید ، مولانا الطاف حسین حالی، ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی ۱۹۷۹ء

۵۴ ـ درمختار فقہ عربی

۵۵ ـ رسائل معارف ، لکھنؤ

۵۶ ـ سیرت اشرف ، منشی عبدالرحمٰن خاں ، ایشیا پریس لاہور ۱۹۵۶ء

۵۷ ـ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ، مصر

۵۸ ـ علی گڑھ تحریک ، نسیم قریشی ، مسلم پریس لکھنؤ ۱۹۶۰ء

toobaa-elibrary.blogspot.com

الندوہ ٹرسٹ لائبریری
چھتر۔ اسلام آباد

۵۹۔ علم الفقہ، مولانا عبدالشکور، کتب خانہ اعزازیہ محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند طبع پنجم
۶۰۔ علم الکلام، مولانا شبلیؒ، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۳۹ء
۶۱۔ قاموس الکتب اُردو، انجمن ترقی اُردو، مطبوعہ پاکستان اردو، روڈ کراچی۔
۶۲۔ قرآن نمبر، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۹ء
۶۳ قصص القرآن، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
۶۴۔ کنوز القرآن، حاجی مظہر الدین بلگرامی، مکتبہ برہان دہلی
۶۵۔ مصباح اللغات، عربی ڈکشنری
۶۶۔ مسلم شریف، کتب حدیث
۶۷۔ ماہنامہ برہان، مختلف رسائل، دہلی
۶۸۔ مآثر حکیم الامت، مرتب مسعود احسن علوی، پاکستان
۶۹۔ مقدمہ تفسیر حقانی، البیان فی علوم القرآن
۷۰۔ مطالب القرآن، حافظ نذیر احمد دہلوی، ناظر پریس لکھنؤ
۷۱۔ سکاتیات الخلان فی علوم التفسیر، محمد عثمان احمدی پریس علی گڑھ ۱۹۱۵ء
۷۲۔ معارف الحدیث، مولانا منظور نعمانی
۷۳۔ نزہتہ الخواطر، جلد ششم، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مطبع دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۹۵۵ء
۷۴۔ ہدایہ فقہ عربی، مطبع مجتبائی، دہلی ۱۹۲۶ء
۷۵۔ ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں، سید عابد حسین، پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۵ء
۷۶۔ یادِ رفتگاں، سید سلیمان ندویؒ، ضیا برقی پریس کراچی ۱۹۵۵ء